

ناصرزیدی

میری لائبریری

۱۹۶۸ء

کے

منتخب افسانے

میری لائبریری میں 4.00

مجلد سفید کاغذ 8.00

۱۹۶۸ء

کے

منتخب افسانے

ناصر زیدی

مکتبہ میری لائبریری لاہور ۲

بہار حقوق بحق بشیر احمد چودھری مخدومی

میری لاٹبریری میں پہلا مرتبہ : ۱۹۶۹ء

ناشر : بشیر احمد چودھری ڈاکٹر گریٹر

مکتبہ میری لاٹبریری لاہور

طابع : پاکستان ٹائمز پریس لاہور

ترتیب

| | | |
|-----|---------------------|--------------------------|
| ۷ | نامہ ربیدی | سید حمی بات |
| ۹ | راجندر سنگھ بیدی | مٹھن |
| ۲۷ | خواجہ احمد عباس | دودا تھ |
| ۳۲ | عصمت چغتائی | نورالہ |
| ۵۸ | بلونت سنگھ | پورہ اجماران |
| ۶۵ | محمد خالد اختر | زنگی کی کہانی |
| ۱۳۱ | اعجاز حسین بٹالوی | دس دیکھ کے بارہ |
| ۱۵۰ | مسعود مفتی | دو خون |
| ۱۵۵ | بالو قدسیہ | سامانی شہین |
| ۱۸۷ | محمد فضل الرحمن علی | کوری کونی گدی گوری |
| ۲۰۹ | عقراء بخاری | تیاری |
| ۲۲۳ | ذکاء الرحمن | ڈپٹی کشنر |
| ۲۶۸ | شرون کمار دتا | ادھوری تصویر |
| ۲۸۷ | سلیم اختر | سیدو ۱۹۶۸ء |
| ۲۹۸ | رفعت مرزا | رحم اور سے نکلتا تھا میٹ |
| ۳۰۷ | اشرف خاوند | ٹھنڈی لڑکی |

عرض ناشر

اردو ادب کی جو خدمت ملکیت میری لاہوریؔ سرانجام دے رہا ہے۔
 اُس کے تذکرے کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ علم دوست اور
 دانش حضرات برابر اس کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔

میری لاہوریؔ نے افسانوی ادب اور خاص ادب کے انتخابات کے جو
 سلسلے شروع کئے تھے وہ اچھے پوری طرح مکمل نہیں ہو سکے تاہم ان کی قدیمیت
 اب پوری طرح عیاں ہونے لگی ہے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ ملک کے اکثر دوسرے
 ناشرین اور مصنفین نے بھی اسی ڈگر پر کام کی نقل شروع کر دی ہے اور کسی بھی پیشوائی
 کرنے والے کے لئے یہ بات بڑی ہی حوصلہ افزا ہے۔

میری لاہوریؔ کے کارپردازان آپ کے لئے وہ سب کچھ کرنے کے لئے کمر بستہ ہیں۔
 جو علم و ادب کی تشجیح کو فروزاں رکھنے کے لئے ضروری ہے۔
 عمارہ آپ کے تعاون کا دل سے شکر گزار ہے۔

آپ کا

بشیر احمد چودھری

۱۲ اپریل ۱۹۹۰ء

لاہور

سیدھی بات

سال بھر کے چٹے ہوئے انسانوں کو کتنی شکل دینے کا رواج کچھ ایسا نہیں پھر بھی ایسے کسی بھی طبقے کے مرتب کو اکثر اس سوال سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ آخر اس انتخاب کی ضرورت کیا تھی؟ ایسا اگر اسے محض تجارت کہا جائے تو مرتب اور ناشر دونوں ایسی ادنیٰ بددیانتی کے مجرم قرار دیئے جائیں گے جسے کبھی معاف نہیں کیا جاسکتا۔

زندگی ہمیشہ سے رنج و راحت اور اسی قسم کی دوسری کیفیتوں سے جلدت رہی ہے اور وہ بے گناہ پنجہ حیاتِ انسانی کا واضح مطلبِ نظر سکون کی تلاش ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ فزونی لطیفہ کی طرف توجہ کا باعث بھی یہی سرگردانی ہے تو بے جا نہ ہو گا کہ ان یا مختصر انسان کو اس لحاظ سے فزونی لطیفہ میں ایک خاص ہریت حاصل ہے کہ اس کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ خود انسان کی۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ ان کا آغاز نامحسوس وقت ہوا جیسا انسان نے اپنے ذاتی تجربات اور عادات کو پہلے پہل انھوں کا ادب دیا، پھر یہ ذاتی تجربات اور عادات آہستہ آہستہ ذات کے قول سے نکل کر کمالات کو اپنی پسٹ میں لینے لگے اور اس طرح کہ ان میں صرف ایک فرد کا نہیں بلکہ انسانی معاشرے کی ترجمان بن گئی۔ اگر یہ نظر فرمایا جائے تو دراصل ہم سب لوگ اپنی زندگی کے کسی نہ کسی لمحے میں ایک کہانی سمجھتے یا لکھتے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ ایک کہانی کار کے اہل واقعات اور احداث کا بدلہ اپنے اندر ایک تکنیکی ہاشمی اور فنی چادر رکھتا ہے جن کی کاروائی اس کی ذاتی واقعات ایک پورے ماحول اور ایک پورے معاشرے کی واردات بن جاتی ہے۔

کہانی چھپے ہوئے محفل پر تکمیل نہیں پاتی بلکہ جب بھی کوئی نثری کوئی کہانی پڑھتا ہے
 تو اس کہانی کے نگ و پے میں زندگی کا ایک نیا خون رواں رواں ہو جاتا ہے اس طرح کہانی
 ہر سہ مکمل ہوتی رہتا ہے اور تکمیل کا یہ عمل کئی زبانوں پر عیاں ہو چکا ہے لہذا ۱۹۶۸ء کے
 افسانوں کا انتخاب پیش کرتے ہوئے اگر یہ کہا جائے کہ آنے والی نسلوں کے لئے اپنے
 زمانے کے ذہنی میلانات و جذبات کی مختصر تاریخ مرتب کر دی گئی ہے تو بعینہ ہوگا۔
 میں نے پاک و ہند کے ان پسندیدہ افسانوں کے انتخاب کے سلسلے میں کسی تعصب کے
 بغیر ادبی و دانشوری سے گزشتہ برس کے تقریباً تمام ممکنہ حصولی ادبی و نیم ادبی
 رسائل کی چھان پٹنگ کی ہے چنانچہ جہاں آپ ان میں کوئی ایسا افسانہ نگاروں سے
 میں گئے ہر ادب میں اپنا ایک مقام بنا چکے ہیں وہاں چند ایک ایسے کہانی کاروں سے
 سے بھی متعارف ہوں گے جو ابھی مقام کی تلاش میں ہیں یہ یہ کچھ کشش کی ہے کہ
 اس غور سے میں کوئی ایسا افسانہ شائع نہ ہو جو آپ کے ذوقِ سلیم پر گراں گزرے یا ادبی
 معیار سے گراں ہوا ہو۔ پھر بھی کیونکر یہ میرا انتخاب ہے اس لئے اختلاف کی بہ حال گفتگو
 آخر میں مجھے اپنی اور مکتبہ میری لائبریری کی طرف سے ان فنکاروں کا شکریہ
 ادا کرنا ہے۔ جن کے فن پاروں کی بدولت یہ مجموعہ مرتب ہو سکا۔ اس کے علاوہ میں
 اپنے معاصر میڈیاں جرائد کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ جن کے معیاری
 ادبی و نیم ادبی رسائل میں سے ان افسانوں کا انتخاب عمل میں آسکا۔

میرا ہنامہ "ادبِ لطیف"

دنا سرزید علی

مشاور۔ سرکلر روڈ۔ لاہور

مستحق

بازار ہی لبہ ہو گیا تھا اور یہ پھر کاروبار چھوڑا۔ معلوم ہوتا تھا پچھم کی طرف جہاں شرک
تھوڑا اچھنی آسمان سے پشتی اور آخر ایک دم نیچے گر جاتی ہے، وہیں دنیا کا کنارہ ہے
جہاں سے ایک جست کر لیں گے، اس جینے کے ہاتھوں مر لیں گے۔

دن بھر سو جینے کے بعد گن چکے سکڑے کو دھری چیزیں ہاتھ لگی تھیں۔ ایک
غلو ٹھیں اور دوسری جینی رائے غلو ٹھیں کو تو شاید کوئی سرکھر غلو پڈر سر کرائے پڑے بھی
جاتا، مگر جینی رائے؟ کوئی بات نہیں۔ آج وہ اسے چسپا کر کے گاؤں تک اس کے پوتے
پڑ پڑے اس سے کہ ڈول مکائیں گے، جیسے آج بھی پچھم میں کسی کے ہاں سے لیونڈ کے
ایک سو نکل آئیں تو اسٹ کے بلڈار میں ان کی بولی لاکھوں تک جاتی ہے۔ ان لاکھوں
کہ ڈول کے خیل ہی سے گنوں وال کی انکھوں میں جھکیاں کو ند نے لگیں اور وہ یہ بھول ہی گیا
کہ وہ چالیس بیالیس سال کا اور ٹھکلا۔ گنجا ہونے کے باوجود کنارہ ہے، اس لیے
پوتوں پڑ پڑوں کی بات نہ ہی نہیں۔ گنکرتا بھی کیا؟ وہ ایک عام ہندو تھا، اتنے بڑے
ٹھکے کا مالک ہونے کے باوجود جس کے اندک انبیاء نہیں جاتا۔ وہ باتوں میں مایات
آکر کہہ کر اسے پرے دھکیل دیتا ہے لیکن بھیتر سے اسے جی جان سے لگتا ہے۔ دنیا

عبر میں پیسے کی اگر کوئی پڑجا کرتا ہے تو ہندو۔ آج بھی اس کے ہاں دیوالی کے روز پرات کے نیچے، جیوتی کے ساتھ، دھوا پانی میں نہلیا، سینہ میں لگایا ہوا روپیہ ملے گا۔ دھوے کے دن اس کی گاڑی پر بھد برگ کے ہار ہوں گے اور سب ترناری مل کر لکشمی کے مندر کو جائیں گے۔ پڑجا کے لیے پیسے کے لیے تو وہ یوسف سا بارہ، پرہی ایسی تہنی کو بھی بیچنے کے لیے تیار ہو جائے۔

اور سامنے تھا سراجا۔ ایریز میٹری کلا پینٹ۔ اس کی دکان تھٹھا میں کئی گے پیچھے چھپی ہوئی تھی، بلکہ ہندو جس پر صبح کے وقت ناگر پانی میں دھو دھ کے لٹے ڈال جاتے تھے اور دکان اور رنگ کے بیج کی جگہ کچھ سے اٹ جاتی تھی۔ تقسیم کلبھنڈتا میں وہ جانے والے سراج کو بلکہ ہندوؤں کی اس رسم کا احترام کرنا ہی پڑتا تھا۔ البتہ نہیں کہتے تھے تو دھوئے کتے جو دن بھر ٹانگ اٹھا اٹھا کر اس پیڑ پر پشیاں کہتے رہتے تھے جس کے بد سے میں بھگوان نے کہا تھا۔ اور وہ کشوں میں میں پیل ہوں ضرور وہ پھلے جنم میں مسلمان ہوں گے جو پینتالیس گھنٹوں میں ہندوؤں کے ہاتھوں مارے گئے۔ سراجا ہمیشہ پیل کی گولیں کھاتا ہوا رکھائی دیتا تھا۔ اس کی دھج بازار کا منہ ہرنایا بھوک نہ تھی۔ سراجا ہر اس چیز کو کھاتا تھا جس کی دھات پر پشٹ کو محفوظ کر دے۔ ہاں، صدیوں رنگ کشوں کا یہی ہے نا۔ کھانا، پینا اور بھوک کرنا وہ دماغی طور پر کوئی ہرور کوئی مذہب بدش ہیں، جو ہندوستان میں یہی تو پاکستان کی باتیں کریں گے۔ پاکستان میں ہوں گے تو۔ میرے سولا بول دینے لگے۔ انہیں کسی چیز سے لگاؤ نہیں، لگن ٹکے نے کئی بار اس بارے میں سوچا بھی۔ ان کا اللہ خوب عیش کرتا ہے۔ ایک چنا بھگوان ہے۔ جو نیچے کی بجائے اوپر کی طرف کے آس پاس ہی منزل ہوتا رہتا ہے شاید سراجا جانے لگے

بنائیک تانترک تھا جو ہندو جبرکشا کے لیے گندھنی کو جگاتے اور ادھرمکا ماتہ بناتے تھے، وہ عورت کے اندر گڑھے پڑے رہتے، لیکن کسی طرح اپنے جوہر حیات کو نہ جانے دیتے۔ نجات کو اس خود غرضانہ طریقے سے پانے والوں، عورت کو صرف ایک ذریعہ بنانے والوں نے کبھی یہ سوچا کہ اس بیچارہ کی کیا حالت ہوتی ہوگی؟ اسے بھوکا، پیاسا، دوتا، تڑپا رکھ کر کیسے مرکب کر سبھ سکتا ہے کوئی؟ کس پر ماتا کو پاسکتا ہے؟ پھر جو نجات بندہ سے چھٹکارہ پالینے میں ہے۔ پڑش کے لیے، استری کے لیے؟ سراتی بوند تو مرنی نہیں، نہ سیبی موتی ہے، مرنی تو بوند کے گرنے اور سیبی کے اُسے اپنے لہندے کے گرنے میں ہے۔

رات ٹپک آئی تھی۔ باہر وہ دنیا کا کدو اندھیرے کے ساتھ کچھا اور بھی پس بیگ آیا تھا، شیم والے دلائی رام، کشمیری بڈشاہ، حتیٰ کہ اٹلی کے پکر پالی کی دکان بھی بند ہو گئی تھی۔ ہو سکتا ہے سینے کا دوسرا منہ پھوٹنے کی وجہ سے اس کے سب اداں دوسے ماہر بوند اکسیری بیک گئے ہوں، صرف سراج کی دکان کھلی تھی۔ نہ جانے وہ کس بل پر تھا؟ شاید اس لیے کہ بیڑی کا ضرورت ماتری کو پڑتی ہے، مگر وہ صبح، صبح کا فبہری کو دکان کھول لیتا تھا، جرات ہی کا حصہ ہوتی ہے، اس کا آخری حصہ۔ دن صبح کہاں کسی کی رہی، وہ تو کیر فٹنوں کی جہولی۔ شاید سراج ٹورسٹ ایجنٹس کی انتظار میں تھا تاکہ وہ دو ٹولن بل کر لکھدے وہ کہیں انگوٹے کھجور یا بیکار پروگرام بنائیں، تھوڑے پیسے کی لیں۔ نہیں، سراج پیسے کے پیچھے تھوڑے جاتا تھا، وہ تو جاتا تھا، کچھ عورتوں کے پیچھے جو کثیر الازدواجی کی وجہ سے بھوکا پیاسا آتی تھیں اور یہاں اگر متنازعہ محبت کو ادھر کے کسی بھی خواہجہاں طبیعت والے مرد پھانسیں اور کھجور اور کے ہتھکن کو زندہ

کرتی تھیں۔

جبھی سراج کی آواز نے گمن کو حال کر چوڑکا دیا۔

”ہیلو، سوٹیٹ پائی۔۔۔“

سراج تقریباً اُن پڑھ تھا، مگر ڈرسٹوں کے ساتھ دہننے سے اتنی اچھڑی نہ سیکھ گیا تھا۔ اس کی آواز سے گمن سمجھ گیا۔ کیرتی آئی ہے۔

وہ پچ پچ کیرتی ہی تھی، جو چھوٹے در، گھٹے ہوئے بدن اور موڑے نقوش والی ایک اور اس لڑکی تھی۔ اس کا رنگ پتلا تھا۔ پھر اوپر سے جامنی رنگ کی دھرتی پہن رکھی تھی۔ جب وہ آئی تو یوں لگا جیسے اندھیرے کا کوئی ٹکڑا ہتھکڑ ہر کر سامنے آگیا۔ وہ ہمیشہ استری کرتی تھی، جیسے اسے اپنا آپ چھپاتا ہے اور شاید اسی لیے سراج کی دوکان کھلی تھی، وہ ہمیشہ کی طرح سے اس کی طرف دیکھتا، اس سے بات کیے بغیر نکل آتی تھی۔ اس کے باوجود سراج میٹیاں بجا رہا تھا۔

مگر کیرتی بات ہی کہاں کرتی تھی، اس سے، اُس سے کسی سے بھی نہیں۔ اس سے بات کرنے کے لیے سوال کچے یوں وضع کرنے پڑتے تھے کہ ان کا جواب مل سکیا۔ صرف اوپر سے نیچے یا دائیں سے بائیں سرٹانے سے بات میں سکے۔ سراج کلاس پھیرنا گمن کو بہت نایسند تھا۔ اس نے کئی بار گمن سے کہا بھی تھا۔ تو گمن عشق کے چکر میں تو نہیں پڑ گیا، جہاں لڑکی ہے۔ کھینچ ڈال۔ بہت اُدھر اُدھر دھڑکے کیرتی کی طرح سے تو وہ اڑا جائے گی۔ لیکن گمن نے اسے ڈانٹ دیا تھا۔

در حقیقت گمن ٹکے کا دھندہ منیاب ہوتا تھا۔ کیرتی کوئی لکڑی کا کام یا شلپ بنا کر بیچنے کی غرض سے اس کے پاس لاتی تو وہ اس میں بہت کیرٹے نکالتا۔ کبھی کہتا

ایسی چیزوں کی آج مانگ ہی نہیں اور کہیں یہ کہ وہ فن کے معیار و نمونہ پر پوری نہیں مارتی۔
کیرتی اور بھی مزہ لگا لیتی حالانکہ اس سب باتوں سے مگن لال کا ایک ہی مقصد ہونا کہ وہ تو
کی چیز یا نج دس میں دسے جائے اور پھر یہ اسے سیزن کر کے سیکڑوں میں بچھے۔

کیرتی نے یہ کام کسی مارٹ سکول میں دیکھا تھا اس کا باپ نارائن ایک سخی تھا
جو بھار و راجی اور جیمز برکس وغیرہ کے ساتھ فیمل اور جانے کہاں کہاں ہندوستان کی مدد
کوڑھوں کا پھول تھا جو کہ حاصل ہندی کے سینڈیم ٹیری ایک اور شاگر کی اینٹ کی دوکانوں
میں مل رہی تھی۔ ہر سال ہمارے ہندوؤں اور غم غموں سے سیکڑوں سورتیاں غائب
ہوتیں اور ہزاروں میل ٹیکسٹور پر وغیرہ کی دکانوں میں جگہ پاتیں۔ نارائن مسلسل سفر سے
تنگ آ کر لوٹ آیا تھا۔ اور گھر ہی میں شلپ بنانے شروع کر دیے تھے جنہیں کیرتی بڑے
انہماک سے دیکھتی رہتی تھی اور پیرچ میں انداز کڑانے اور دف ہنگ کرنے میں باپ کی
مدد بھی کرتی تھی۔ یوں گھر پیٹھ جانے میں نارائن اس بات کو بھول گیا کہ کھوپڑیا اور دھڑ
پائے جوئے سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتا ہے اور اس کے مد گئے چمگئے ہی نہیں سونگنا
طام شے میں۔ شاید وہ جانتا بھی تھا لیکن وہ ان چند لوگوں میں سے تھا جو پیسے کی

ماہیت کو سمجھ جاتے ہیں اور زندگی کو بھلاؤ میں نہیں دیکھتے۔ وہ شلپ بنانا اور شکل
سے روٹی کمانا تھا۔ اس کا ایک ہی دورویوں کے دیوانی اس کی موت واقع ہو گئی۔ وہ
جگہ مہاکاوت بنا رہا تھا جبکہ اس کا اپنا ہی چمڑا اس کے ہاتھ میں لگ گیا جس سے اسے
ٹیشن ہو گیا اور قریب کے چھانڈی کے اسپتال میں مر گیا۔ کہتے ہیں وہ کتے کی موت مرا۔

کیوں نہ ہو اس کی موت مرنے۔ جب وہ دیوی کاوت بنا رہا تھا تو دونوں زمینوں اس کی
چھاتیوں اس کے کولہوں اور انوں پہ ٹھہرا رہتا۔ چھوٹے شلپوں میں تو چھاتیوں کے خلاف

میں گھومتے ہوئے لٹو معلوم ہوتی تھیں، لیکن بڑوں میں ٹانگیں اور ہاتھ اس ایک طرح کی گھڑوہنجی تھے۔ اصل بات وہ دودھ کے بڑے بڑے ٹکے تھے جو اس پر رکھے جوتے تھے اور کوئی ہتھکنی کے ماتھے کی طرح سے جس کے نیچے سے ایک کی بجائے دو سونڈیں نکلتی تھیں۔ اس نے دُک کا کاشلپ بھی بنایا تھا جو بڑی جبر جنک دیوی ہے۔ ایسی دیویوں کے بدن بناتے ہوئے ناراضی کتنے کی نہیں تو کیا ہماری آپ کی مت مترا؟ دیکھ لائی ہو؟ گئی ٹکے نے کیرتی سے پوچھا۔

کیرتی نے اپنے دھوتی کے پتوں سے لکڑی کا کام نکالا اور دھیرے دھیرے اسے لکڑی کے سامنے رول ٹاپ کی میز پر رکھ دیا۔ کیونکہ اوپر کے لیمپ کی روشنی وہیں مرکوز ہو رہی تھی۔ اسے دیکھنے سے پہلے گئی نے ایک بیرون کر سی کیرتی کے سامنے سرکادی۔ مگر وہ بدستور کھڑی رہی۔

”تمہاری ماں کیسی ہے؟“

کیرتی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے ایک بار پیچھے اس طرف دیکھا جہاں لکڑی نیچے گرتی تھی اور جب چہرہ گئی کی طرف کیا تو اس کی آنکھیں نم تھیں۔

کیرتی کی ماں وہیں چھانڈنی کے اسپتال میں پڑی تھی جہاں اس کے باپ ناراضی نے دم توڑا تھا۔ بڑھیا کو قعد کا سرطان تھا۔ اس کے پیٹ میں سوراخ کر کے ایک نلی لگا دی گئی تھی اور اس کے اوپر ایک بڑیل باندھ دی تھی تاکہ بول و برا نہ نیچے جانے کی بجائے اوپر بڑیل میں چلے جائیں۔ پہلی بڑیل کسی دھجے سے خراب تھی گئی تھی اور اب دوسری کے لیے جیسے چاہئیں تھے۔ اگر وہ گئی کو بتا دیتی تو وہ شاید دوسرے طریقے سے بات کرتا، لیکن اس دُک کو دیکھ کر وہ ویسے ہی لکڑی لگ گیا تھا۔

”بھڑی“ اس نے کہا ”میں نے تم سے کئے ہار کا ہے۔ آج کل ان چیزوں کو
 کرتی نہیں پڑھتا۔ یہ لیٹے ہوئے دشمن اور پریشانی انگ۔ لکشی پاؤں داب رہی ہے۔“
 کیرتی نے بڑی بڑی آنکھوں سے گئی کی طرف دیکھا، جس میں سوال تھا۔ اور
 کیا جانوں؟

”ہی۔ جو آج کل ہوتا ہے۔“

”آج کل۔“ کیا ہوتا ہے؟ کیرتی نے آخرتہ کھولا مشکل سے اس کی آواز
 سنائی دی، جیسے کینری (CANARY) کی چونچ جتنی دکھائی دیتی ہے، مگر آواز
 سنائی نہیں دیتی۔

گئی نے کچھ نہ کہے، کچھ راستہ پاتے ہوئے کہا ”اور کچھ نہیں ہوتا تو گناہ صہری
 بناؤ، ضرور بناؤ۔ اور پھر جیسے اسے کوئی غلطی لگی اور وہ اپنے آپ کو درست
 کہتے ہوئے بولا ”کوئی نیوٹ۔“
 ”نیوٹ؟“

”ہاں۔ آج کل لوگ نیوٹ پسند کرتے ہیں۔“

کیرتی چپ ہو گئی۔ کسٹادی ہونے کے ناطے وہ شرماسکتی تھی، لجا سکتی تھی مگر
 یہ سب باتیں اس لڑکی کے لیے تعیش تھیں، اسے فکر تھی تو صرف اس بات کی کہ گئی
 اس کے دُور درک کو خریدتا، پیسے دیتا ہے یا نہیں؟ کچھ سوچتے، رکھتے ہوئے اس نے
 کہا۔ ”مجھے نہیں آتا۔“

”کیا بات کرتی ہو؟ تمہارے باپ نے بیسیوں بنائے۔“

”وہ تو۔ دیوی ماں کے تھے۔“

”فرق کیا ہے؟“ گئی ٹھکے نے کہا ”دیوی بھی تو عورت ہوتی ہے۔ تم وہی بناؤ مگر جگہوں کے لیے کوئی دیو والا اس کے ساتھ سختی مت کرو۔ انہی حرکتوں سے ہی تو تمہارے چہرے پر ایسی موت مڑا۔ سرگیش ہوئے۔“

کیرتی نے اپنے جیروں کے پھپھاڑے میں جھانکا۔ اب جیسے وہ کھڑی نہ رہ سکتی تھی۔ کسی اور خطرے سے اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا، جیسے وہ جانتی تھی، کوئی دوسرا نہیں۔ پھر بھی وہ بیوقوف کر مٹی پر بیٹھی نہیں، اس کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ اس طرف سے اس کے بدن کے حسین مگر بار بار خطرات دکھائی دے رہے تھے۔ کیا شلپ تھا، جیسے اوپر کے نہیں، نیچے کے نالائک نے بنایا تھا، گئی لال کے دماغ میں اختیار اور بے اختیار، آپس میں خبر داتا ہو رہے تھے اور وہ نہیں جانتا تھا کہ بار بار بالی ٹپک کے اندر بھی وہی چادر اور لاپلائی آپس میں سرسرا رہے ہیں۔ اس کاٹن سڑک گیا تھا۔ کوئی گھرنٹ سا بھرنے کی کوشش میں وہ لول۔

”میں۔ میرے پاس موڈل نہیں ہے۔“

”موڈل؟“ گئی نے اس کے پاس آتے ہوئے کہا ”سیکڑوں ملتے ہیں مارج

نر کسی بھی جوان، خوبصورت لڑکی کو پیسے کی جھلک دکھاؤ تو وہ ایک دم۔۔۔ کیرتی نے کچھ کہا نہیں، مگر گئی نے صاف سن لیا۔ پیسے؟ اور خود ہی کہنے لگا ”اوری پیسہ خرچ کرے، تبھی پیسہ بنا سکتا ہے نا۔“

اس بات نے کیرتی کو اور بھی اعاس کر دیا۔ اس کی روح زندگی کے اس جبر کے

نیچے پڑ پڑا رہی تھی۔ پھر اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ عورت کا یہی عالم تو ہوتا ہے، جو مرد کے اندر باپ اور شوہر کو جگا دیتا ہے۔ چنانچہ گئی نے اپنا ہاتھ بٹھایا تاکہ اسے

باندوں میں لے لے اور چھاتی سے لگا کر کہے۔ "میری جان اتم ٹکرنہ کرو۔ میں جو ہوں۔" لیکن کیرتی نے اس سے جھٹک دیا۔ گٹھن کٹ گیا۔ اس نے یوں غلا ہر کیا جیسے کچے ہودی نہیں۔ تپاس کے ہاتھ میں تھا۔ دول ٹاپ پر سے اس نے ڈوڈرک کراٹھایا اور اسے کیرتی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "مجھے اس کی ضرورت نہیں۔"

جب تک کیرتی نے سچی کچھ سوچ لیا تھا اس نے پھلے نیچے دیکھا اور پورا ایک سر اوپر اٹھاتے ہوئے بولی۔ "اگل بار میڈی لائونگی۔ ابھی تم سے ہی لے لو۔" "شرط؟" گٹھن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کیرتی نے سر لا دیا۔ گٹھن ٹکے کا خیال تھا کیرتی ساتھ ہنس پڑے گی مگر وہ کچھ اور بھی خبیثہ ہو گئی تھی۔ اس نے دول ٹاپ کراٹھایا اور میز کے اندر سے دس روپے کا چھرا سائونٹ نکالا اور اسے کیرتی کی طرف بڑھا دیا۔ "لو۔" "دس روپے؟" کیرتی نے کہا۔

"ہاں تمہیں بتایا، میرے لیے یہ سب بیکار ہے۔ میں اور نہیں دے سکتا۔"

"اچھا ہے تو۔" اور کیرتی نے جملہ بھی پورا نہ کیا۔ اس کے اندر گویائی، الفاظ

سب ٹھٹک گئے تھے۔ پر مطلب صاف تھا۔ گٹھن سمجھ گیا۔ اس سے تو بڑی بھی نہ

آئے گی۔ "دوا کا خرچ بھی پورا نہ ہو گا۔" مدنی بھی نہ چلے گی۔ قسم کے ختم

ہوں گے، سب مجبور اور نادار سمجھ کی تے کیا کرتے ہیں اس نے کیرتی کی طرف دیکھتے

ہوئے کہا۔ "بچے بس وہ، لا دو تو میں اچھے پیسے دے گا۔"

اور ایسا کہنے میں اس نے ہاتھ کی مدد انگلیوں کا چھلا بتایا، تھوڑی آنکھ بدی

جیسی ٹوم سانڈ سے ناسیکہ کو داد دیتے ہوئے مارتے ہیں۔

کیرتی باہر نکلی تو اس کے ہونٹ پھٹے ہوئے تھے، وہ تھوڑا دلہنپ رہی تھی۔ لوٹنے پر کیرتی ہمیشہ ساٹھی طرف سے جاتی تھی، حالانکہ اس میں اسے میل ڈوڑھ میل کا چکر پڑتا تھا۔ وہ نہ چاہتی تھی سراج سے اس کی ٹھکر ہو لیکن آج وہ اسی طرف سے گئی جیسے اس میں کوئی حاضیت، بھرائی تھی۔ ٹائیکل چلا آیا تھا اور سراج کے ساتھ مل کر کچھ کھا رہا تھا، جبکہ کیرتی منہ اوپر اٹھائے، ٹانگ پھلائے ہوئے پاس سے گزرتی۔ سراج نے کچھ کہا جو گمن کو سنائی نہ دیا۔ کیرتی میں وہ بغاوت ہی کا جذبہ تھا اور دیا پھر وہ اپنی مصیبت زدہ لوگوں میں سے تھی جو دشمن کے ساتھ بھی بنا کر رکھنے کی سوچتے ہیں۔ مبادا انہی سے کوئی کام اڑے۔ شاید یہ عصمت کی نظرت کا خاتمہ تھا جو اس مرد کو بھی اپنے پیچھے لٹکائے رکھتی ہے۔ جس سے اسے کچھ لینا دینا نہیں۔ صرف اس لیے کہ اسے دیکھ کر ایک بار اس نے سیٹی بھجائی یا اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر سرد آہ بھری تھی۔

سراج حاضر و کمل، ایفر ڈیزیاک، کھارہا تھا۔ ہر ملک ہے پائے ہوں جو ٹائیکل اس کے لیے لایا تھا شاید وہ دھن مل کر گھس گھسے کے پاس آتے اور اسے کچھ دانگلات بتاتے، لیکن گمن نے وہ کان ہی بڑھالی تھی۔ مردانوں کو اندر سے بند کرتے ہوئے اس نے کیرتی کے ڈوڑھ کو دیکھا جو بہت عمدہ تھا۔ خیش ناگ کا پھیلا جھڑ توڑ بھرت تھا، لیکن اوپر اس کی چٹگری کھالی میں اس نے صرف گردنوں سے رنگ بھر دیئے تھے۔ کشن میں ہی تھا جو کوئی بھی حقیقت منہ عصمت کسی مرد میں دیکھنا چاہتی ہے۔ البتہ کشن ڈھیر سی پڑی تھی اور اس کے بدن کے خط واضح نہ تھے۔ شاید کیرتی کشن کو اس کے کسی بھی سنی میں نہ جانتی تھی۔ حالانکہ اسے روچک بنا ناگھٹنا آسانی تھا جب عصمت پاؤں بدلنے کے لیے جھکتی ہے تو ظاہر ہے اس کے ہاتھ باند بدن سے

اگک ہوتے ہیں اور مخصوص عورت صاف اور سادہ لکھائی دیتی ہے پھر پہلو پر
بیشی ہوئی لوپر کی عورت نیچے والی سے کتنی کٹ جاتی ہے اور مرد کی نظر میں کو کی کیا
اور نیچ نیچ سمجھاتی ہے۔ اگر یہ کہیں کیرتی خود عورت تھی اس لیے اسے عورت کی برائیت
مرد میں زیادہ دلچسپی تھی تو یہ غلط ہوگا۔ کیونکہ عورت اپنے حسن کے سلسلے میں ہاتھ
اور آنکھ خود پرست ہوتی ہے اور جب اس کی یہ خود پرستی اس کے لیے ناقابل
برداشت ہو جاتی ہے تو کسی بھی مرد سے اسے جھٹک دیتی ہے۔

گنگا نیکر کے مڈمک کو ایک ہاتھ میں لیا اور دوسرے میں چاتھ لے کر
اس پر 'سدم نہ' کے الفاظ کندہ کر دیے اور پھر کچھ کمرے میں بیچ گیا جہاں کچھ
زمین تھی جسے گھوڑا اس نے مڈمک کو نیچے رکھا ایک اور مرد کو نکالا جو کیرتی ہی
کی جانی ہوئی تھی اور پھر گٹھے پہ ٹی ٹال کر اس پر کتھے کا پانی میٹرک دیا۔ پراعت
کی مٹی جھاڑ کر اسے دیکھا تو بڑی بڑی سٹائیں اس میں چل پڑی تھیں اور وہ صدیل پرانا
معلوم ہو رہا تھا۔ اگلے دن وہ جب اسے لے کر ٹر سٹوں کے پاس گیا تو وہ بہت
خوش ہوئے۔ گنگا نے انہیں بتایا کہ اس کا ذکر کالی داس کے رگھو نیش میں آتا ہے
رگھو جی نے گنگا کے علاقے میں ہر گٹ نام کا ایک شہر پایا تھا جہاں سے بہت
برآمدہ ہوئے کچے میس کے چھاراجہ و دیار کے پاس ہیں اور کچے اپنے پاس۔ چنانچہ
اس بت کو گنگا ٹھیکے نے سٹاٹھے پانسو روپے میں بیچ دیا۔ جس کے لیے اُس نے
کیرتی کو پانچ روپے دیئے تھے۔

اس علاقے کے ایک ہفتے کے اندر کیرتی نوٹ لے آئی۔ وہ بدستور بدستور

تھی اس کی ماں تو بیمار تھی ہی، وہ بھی بیمار ہو گئی تھی، اسے قریب قریب نونیہ ہودا
تھامہ کھانسی رہی تھی اور بد باسا پنا گلا کچڑی تھی، جس پر اس نے دھول کا لوگوڑا ایک
پٹے پرانے کپڑے کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔

کیرتی نے معمول کی طرح سے شلپ کو گھنٹکے کے ساتھ کھانا کھا کر کھانسی نے
اُسے کھڑکی میں نہیں، پتھر میں بنایا تھا۔ اب وہ پھر امید و بیم کے ساتھ گھنٹکی کی طرف
دیکھ رہی تھی۔ گھنٹکی اگر ناپسندیدگی کا اظہار کرتا تو بہت بڑا جھوٹ ہوتا۔ اس لیے اس نے
نہ صوف سے پسند کیا بلکہ جی بھر کر داد دی۔ اسے صحت کی تو صرف اتنا کہ وہ بہت چھوٹا
تھا۔ کاش وہ اُسے قدر آدم میں بناتی تو نہ صرف اسے بلکہ خود گھنٹکی کو بھی بہت فائدہ ہوتا۔
اس نے شلپ کیشی کو ہاتھ میں لیا اور خود سے دیکھا۔ کیرتی پھر بھی سچ کا نیوٹ
نہ بنا سکی تھی۔ بت کے بدن پہ کپڑا تھا جو گھٹا تھا۔ کمال یہ تھا کہ اس کپڑے سے اب بھی
پانی کے قطرے ٹپکتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ وہ کہیں تو بدن کے ساتھ چپکا ہوا
تھا اور کہیں علیحدہ۔ بظاہر پھپھانے کے عمل میں وہ عورت کے جسم کو اب بھی حیاں
کر رہا تھا۔

شلپ پر سے نظریں ہٹا کر گھنٹکے نے کیرتی کی طرف دیکھا۔ ادب بے امتیاز
اس کے منہ سے نکلا۔ ”واہ“! کیرتی جھینپ گئی ادا اپنی بائیں سادھی کو
پچھے سے ڈھانپنے لگی لیکن گھنٹکی سب جان گیا تھا کہ وہ برہنہ ہو کر خود کو دکھانے
میں دیکھتی اور اُسے بناتی رہی ہے کے بار اس نے کپڑا جھگڑا اپنے بدن پر رکھا ہر گز،
جس سے اسے سردی ہو گئی ادا اب وہ کھانسی رہی ہے۔ یہ صرف پیسے ہی کی
بات نہیں۔ عورت میں نمائش اور خود سپردگی کا بند باندھی تو ہے۔ گھنٹکی سب سمجھ گئی

تھا مگر تجاہل برتتے ہوئے اس نے پوچھا - ”ماں کیسی ہے؟“
 کیرتی جیسے ایک دم باخودہ ہو گئی، اسے کھانسی کا فٹ سا پڑا اور خود کو سنبھالنے
 میں خاصی دیر لگی۔ ”نہیں گھر گیا تھا اور شرمندہ ہی تھا۔ اس کے بعد سڑا تے ہوئے جو
 اس نے سوال کیا، وہ بہت غیر ضروری تھا۔“ تو موٹل مل گیا کہیں؟“

کیرتی نے پہلے تو نظریں گرا دیں اور پھر دکھ سے باہر اس طرف دیکھنے لگی جہاں
 سڑک آسمان کو جھلتی ہوئی ایک ایسی نیچے گرتی تھی۔ گھر نے چاکر اسے اس کمزوری
 کے عالم میں پکڑ لے اور وہ مادہ دے جس کی وہ ستمی تھی اور جو شاید وہ چاہتی تھی
 نئی گھاس نے سوچا، ایسے میں عام بڑھ جائیں گے۔ اس نے اپنے دل میں باب کے
 کیرتی کو سو روپے دینے کا فیصلہ کیا۔ بوسہ اور بات کی چیزیں شاید تلو کی نہ ہوں مگر وہ
 ستمی مے گا اندھی اندھ ٹھہری ہوئی تھی کہ کیرتی زیادہ کا مطالبہ نہ پیش کر دے۔
 ”کیا عام قند اس کے؟“ اس نے یہی سرسری طریقے سے پوچھا۔
 کیرتی نے اچھٹی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور بولی ”اب کے میں پچاس روپے
 ملے گی۔“

”پچاس؟“

”ہاں۔ بالی گم نہیں۔“

گھر نے تسکین کے جذبے سے مدد طلب اٹھایا اور چالیس روپے نکال کر
 کیرتی کے سامنے رکھ دیئے اور بولا۔ ”جو تم کو۔“ مگر ابھی چالیس ہی ہی میرے
 پاس۔ دس پھر لے جانا۔“

کیرتی نے روپے ہاتھ میں لے لیے اور کہا۔ ”اچھا۔“

”جانے ہی مانی تھی کہ گھن نے اسے روک لیا۔“ مسند

کیرنی گت کچھ بچ ختم کر اس کی طرف مجھے تمام لوگ کے اعزاز میں دیکھنے لگی۔ اس کچھ سے پہلے اوسیدان چٹ جانے کی بجائے کچھ اور کھنڈ گئی تھیں جبکہ گھن ٹکے نے پوچھا ”اتنے پیسوں سے تمہارا کام چل جائے گا؟“

کیرنی نے سر ہلادیا اور پھر ہاتھ پھیلائے جس کا مطلب تھا۔ ”امکیا کرنا؟“ پھر اس نے بتایا ”ماں کا آپریشن آرہا ہے“ جس کے لیے سینکڑوں روپے چاہئیں۔ ”میں تو کہتی ہوں۔“ اس نے کہا ”اب پھر کچھ روک کر بولی“ ”ماں جتنی جلدی مر جائے اتنا ہی اچھا ہے۔“ ”اب پھر وہ کھڑی پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کر رہے لگی باخراہ خود ہی بول اٹھی۔“ ”ایسے ایڑیاں دگڑھنے سے موت اچھی۔“

جب گھن نے اس سے آٹھ زلاں تو کیرنی اٹھارہ انیس برس کی لڑکی کی بجائے پینتیس چالیس برس کی بھرپور عورت نظر آنے لگی جو زندگی کا ہر دار اپنے اوپر لیتی اور اسے بیکار کر کے پھینک دیتی ہے۔

”ایک بات کہوں“ گھن ٹکے نے پاس آتے ہوئے کہا ”تم ہنسنی بناؤ آپریشن کا سب غرچا میں دوں گا۔“

”ہنسنی؟“ کیرنی نے کہا اور لہذا اٹھی۔

”ہاں“ گھن بولا ”اس کی بہت ہلک ہے۔ ٹروٹ اس کے لیے دیوانہ ہوتے ہیں۔“

”ہیکس۔“

”میں سمجھتا ہوں“ گھن نے سر ہلاتے ہوئے کہا ”تم نہیں جانتیں تو ایک بار

کچھ دوا جو چلی جاؤ، اور دیکھ لو۔ میں اس کے لیے تمہیں پیٹگی دینے کو تیار ہوں۔“
 ”تم؟“ کیرتی نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر کچھ دیر کے بعد بول
 ”تم تو کہہ رہے تھے تمہارے پاس اور پیسے نہیں؟“
 گنگی نے فوراً جھوٹا زراش لیا۔

”میرے پاس کچھ پیسے نہیں“ بولا ”میں نے دوکان کا کاروبار دینے کے
 لیے کچھ الگ رکھے تھے۔“

پھر اس نے پیسے دینے کی کوشش کی۔ مگر کیرتی نے اپنے زعم میں نہ لیے
 اور وہاں سے چلی گئی۔ گنگی ٹھکے نے ٹوٹ کر کہتی ”کو دیکھا اور پھر ایک چھوٹی سی
 ہتھوڑی لے کر اس کی ناک توڑی پھر ایک بازو توڑا پھر ٹانگ توڑی اور اس کے
 سر کے سنگھار پر ہلکی ہلکی ضربیں لگائیں جس سے کچھ کرچیں گریں پھر اندھا کر اس نے
 اسے رستی میں باندھا اور ٹھکے کے تیزاب میں ڈبو دیا۔ دھوئیں کے بادل سے
 اٹھے۔ گنگی نے ہمتی کو کہیں یا اور کہیں کو نکال کر مانی میں ٹال بیٹھ کر اسے نکالا تو کہتی
 ”کے غم و غل دھندلے ہو گئے تھے اور کہیں کہیں سوچ میں سودا خ چٹاخ سے پڑ گئے
 تھے۔ اب وہ ہزار ایک روپے میں بکنے کے لیے تیار تھی۔“

اب کے کیرتی جو شلپ لائی وہ بھٹن ہی تھا۔ اور مقنا دم۔ ایک بھدی میں
 بندھا ہوا تھا اور ٹھیلے پر آیا تھا۔ کچھ مزدوروں نے اٹھا کر اسے گنگی ٹھکے کی دکان
 پر رکھا۔ پھر اپنی مزدوری سے کردہ لوگ چلے گئے۔
 کیرتی اور خود کو تنہا پاکر تیز سانسوں کے بیچ گنگی ٹھکے نے بھدی کی دکان کاٹیں۔

اور کچھ دارنگی سے ٹاٹ کو شلپ پر سے ہٹایا۔ اب شلپ سامنے تھا۔ پرفیکٹ۔۔
 ٹگن نے اسے دیکھا تو اس کے گھٹے میں لعاب سوکھ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ کیرتی اس
 کے سامنے اس شلپ کو نہ دیکھے گی مگر وہ وہیں کھڑی تھی۔ اس کے سامنے کسی
 بھی پہچانی سے عاری۔ شلپ میں کی محنت تکمیل کو پہنچ رہی تھی جبکہ مرد خود رنگی
 کے عالم میں اسے دونوں کا اندھل سے پکڑے ہوئے تھا جسے ٹگن ٹکے نے توجہ
 سے نہ دیکھا۔ وہ شاید اسے فرصت میں دیکھنا چاہتا تھا۔

”کتنے پیسے چاہئیں، آپریشن کے لیے؟“ اس نے پوچھا۔

”آپریشن کے لیے نہیں۔ اپنے لیے۔“

”اپنے لیے؟ مال۔۔“

”مر گئی۔ کوئی ہفتہ ہوا۔“

ٹگن نے اپنے چہرے پر دکھ اور افسوس کے جنبے لانے کی کوشش کی،
 مگر شاید کیرتی نہ چاہتی تھی۔ اس کے ہونٹ ویسے ہی بچنے ہوئے تھے۔ وہ ویسے ہی
 اُٹھاس تھی جبکہ اس نے کہا۔ ”میں اس کا ہزار روپیہ لوں گی۔“

ٹگن بھرنچکا سا رہ گیا۔ اس کی زبان میں گنگنت تھی، جب اس نے کہا ”اس
 کے ہزار روپے بھی کوئی دے سکتا ہے؟“

”ہاں“ کیرتی نے جواب دیا۔ ”میں بات کو کھائی ہوں۔۔۔ شاید مجھے
 زیادہ بھی مل جائیں، لیکن میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔“

”میں تو۔۔۔ میں تو پانسو دے سکتا ہوں۔“

”نہیں“ اور کیرتی نے مزدوروں کے لیے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

گن محکمے نے اسے روکا۔ ”سو دوسرا دے لو“

”ہزار سے کم نہیں۔“

گن نے حیران ہو کر کیرتی کی طرف دیکھا جس کے آج تیرہ ہی دوسرے تھے۔ کیا وہ کھجور اہو گئی تھی؟ ٹورسٹوں سے ملتی تھی؟ کسی بھی قیمت پر کھاکار کا اس کی مدد کیٹ سے جدا رکھنا چاہیے۔ مگر خیر۔ اس نے رول ٹاپ اٹھایا اور آٹھ سو کے نوٹ گن کو کیرتی کے سامنے رکھ دیئے۔ کیرتی نے جلد ہی سے گنے اور اس کے منہ پر پھینک دیئے۔

میں نے کہا، ”میں ہزار سے کم نہ ملوں گی“

”اچھا۔ نو سو لے لو“

”نہیں“

* ساڑھے دس سو۔ نو سو پچھتر۔۔۔“ اور پھر کیرتی کی نگاہوں میں کوئی عزم دیکھ کر اس نے سروس کے ہتی نوٹ اس کے ہاتھ میں دے دیئے اور لٹے کی حالت میں مہش کی طرف ایک گیا۔ کیرتی کھڑی تھی۔ جیسے وہ اپنے فہم کی داد لینے کے لیے ٹھٹھکی تھی۔ گن نے مہش کی محنت کی طرف دیکھا جو پھر کیرتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو کیوں تھے؟ کیا وہ لذت کی گلاب باری تھی یا کسی جبر کا احساس؟ کیا وہ دکھ اور سکھ، اندام صحت کا مشتہ تھا جو کہ پوری کائنات ہے؟ پھر اس نے مرد کی طرف دیکھا جو اوپر سے لطیف تھا مگر نیچے سے بے مدد کیٹ۔ کیوں کیرتی نے کیوں مرد۔ انسان کی ”مددیت“ پر نند دیا تھا؟۔۔۔ یہ مہش ہے۔۔۔ مگر وہ مہش تو نہیں، جو پریش اور پر کرتی میں ہوتا ہے۔۔۔؟

ٹھیک ہے۔ آٹا زیادہ پیسے ملیں گے۔۔۔
 مگن ٹھکے نے آدپر کی بجی کو کچیلج کر پھر مرو کی طرف دیکھا اور بول اٹھا۔ ”یہ
 میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔“

کیرتی نے کوئی جواب نہ دیا۔
 ”تم۔“ مگن نے جیسے پتہ پاتے ہوئے کہا ”تم سراج کے ساتھ باہر
 گئی تھیں؟“

کیرتی نے آگے بڑھ کر زرد سے ایک پتھر مگن ٹھکے کے منہ پر لگا دیا اور
 نوٹ ہاتھ میں تھامے دوکان سے نکل گئی۔

ماہنامہ ”کتاب“ لکھنؤ

میں کی دو ہفتہ

میں سے کشش کیجئے کی آمادہ آئی تو سکھانام کی آنکھ کھل گئی۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ گتے کچھ ایسے انداز میں بھینک رہے تھے، جیسے رو رہے ہوں۔ اندھیرا تو جب وہ سیاہ نقاب بھی تھا، مگر اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے اندھیرا کچھ اور گہرا ہو گیا ہے۔ اماں کی کہانت تھی، چاندنی کا تو سوال ہی نہیں تھا لیکن تاروں بھی نہ جانے کہاں غائب ہو گئے ہیں، برسات کا موسم نہیں۔ شام کو اس نے دیکھا تھا کہ آسمان پر بادل کلاہیک چھوٹا سا ٹکڑا بھی کہیں نہیں ہے شاید جاڑے کی دھند تھی، جس نے ستاروں کو اپنی کالی چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ یہ دھند تھی یا دھواں یا دھول کا بادل تھا اس میں سکھ دھام کو گلا گھسٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ شاید یہ اس کا دم بھی ہو۔ بھلا اندھیرے سے بھی کسی کا گلا گھسٹتا ہے؟ شاید جیسے جیسے وقت قریب آ رہا ہے مجھے کھل مٹ ہو رہی ہے۔ اس نے اپنی کلائی پر لگی ہوئی گھڑی دیکھی۔ اندھیرے میں چمکنے والی سوئیاں بتا رہی تھیں کہ چار بجنے میں پانچ منٹ ہیں۔ مہانا کے چوکیدار ساڑھے چار بجے اپنا پرہ ختم کر کے اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں، پر پھٹکی ساڑھے پانچ بجے۔ اس کو مکانوں کا صفایا کرنے میں بس بس ایک گھنٹہ لگے گا۔

چمدی اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پچھلے تین برس میں کئی بار اس نے جیل کی ہوا کھائی تھی۔ دوبارہ بھی کی پولیس نے اسے تڑی پار کیا تھا۔ اس بات کا ہونا نے اس سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ابھی میں اس کی شکل بھی نظر آئی تو یہ تھا اس کا چالان کر دیں گے، چاہے اس نے کوئی مجرم کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

سو شکارام اپنا چلا آیا تھا، مگر یہاں کا موسم چمدی کے لیے ٹھیک نہیں تھا۔ رات کو سردی کے مارے سب دروازے کھول دیے بند کر کے سوتے تھے پولیس والے کم بخت بھی ہر وقت چکر لگاتے رہتے تھے۔ دو چار حوالدار اس کو پوچھتے بھی تھے۔ "کیوں سکھا رام! اب بے پولیس نے کر دیا نہ تجھے تڑی پار! یاد رکھتا کہ ہم تڑی پار نہیں کرتے۔ ذرا سا شب بھی ہو تو سیدھا جیل خانے میں بند کر دیتے ہیں۔" ان حالات میں کوئی شریف آدمی۔ یا شریف چور۔ کسے تو کیا کرے! مد چارماری دل میں جیب میں جو جمع پونجی تھی، وہ ختم ہو گئی۔ سکھا رام نے سوچا اپنے گاؤں واپس چلا جائے۔ پونا سے سو سا سو میل پر ہی تو تھا۔ مگر جئے تو کیسے۔ تین برس کے بعد اپنی بیوی کو کیا منہ دے گا! گاؤں چھوڑتے وقت اس نے دھڑبھڑ کے منہ میں جا کر اپنی بیوی کے منہ سے قسم کھائی تھی کہ اب وہ اس وقت ہی واپس آئے گا، جب اس کے ہاتھ میں چار پیسے ہوں گے تاکہ ماہوکار سے اپنی زمین چھڑا لیں، اپنے جھونپڑے کی مرمت کرا لیں، مادہ بل جو تنے کے لیے ایک جڑی کو لٹھا پڑی بیلوں کی خرید لیں۔ بس اتنی سی دنیا مٹی ان کی۔ دو گیند میں ایک جڑی بیل۔ ایک بل۔ جھونپڑے کے چار دیواریں اور پھر نس کی چھت۔ اور مادہ قریب

ہر بار جب اسے اپنی بیوی سادتری کی یاد آتی تھی تو سکھارام کے دل میں درد
 کی ایک میٹھی میٹھی سی شیں اُٹھتی تھی۔ گاؤں بھر میں ایک چھوڑی بھی تو سادتری جیسی
 نہیں تھی۔ ام کی کیروں جیسی آنکھیں۔ یہ لہجہ ریشم جیسے ملائم بال جی کا بڑا
 بنا کر اس میں ایک جنگل پھول لگا لیتی تھی تو سکھارام کے سر میں کنول کھل اُٹھتے تھے۔
 وہی تپتی گڑبڑ دل جسم پر توگز کی ساڑھی اور پھنسی ہوئی چوڑی اس اند بھی غضب سا
 تھا۔ نہیں کچھ ایسی کہ گھر میں کھانے کو نہ ہو پھر بھی ہر وقت ہنسی مسکراتی رہتی تھی کوئی
 سہیلی ہمدردی بتاتی تو کہتی: "مجھے کیا فکر ہے؟ میرے گھر والے کے محنت کرنے
 والے دو ہاتھ سلامت چاہئیں۔ سب ملکر مدد ہو جائیں گے۔"

سادتری کا خیال اتنے ہی سکھارام اندھیرے میں مسکرا دیا، اس نے اپنے
 ہاتھوں کو اپنے سامنے پھیلا دیا۔ وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو چھو کر شرمس
 کر سکتا تھا مگر وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھ نہ سکتا تھا۔ ان دو ہاتھوں نے جو محنت سے
 گھر و س سے ادب سخت ہو گئے تھے کیا کچھ نہ کیا تھا۔ ہل چلا یا تھا۔ بیج بویا تھا۔ بیٹیاں
 کی تھی۔ خلائی اسکالٹی کی تھی۔ اناج کو چھاج کر بور دیوں میں بھرا تھا، بوریوں کو اٹھا کر
 بیل گاڑی میں رکھا تھا۔ پھر وہ سب بیدیاں ساہوکار کے ہاں پہنچا آیا تھا۔ اور
 ساہوکار نے ہی کھاتہ کھول کر حساب بتایا کہ اناج سے قرضہ پورا نہیں ہوا اس کو
 اپنا بیل بھی بیاج میں دینا ہو گا۔ ایک بیل تو پہلے ہی بوڑھا اور بیمار ہو کر مر چکا تھا۔
 دوسرا ساہوکار کے حوالے کیا ساہوکاری کو ابھی دو ہاتھوں سے گھسیٹا ہوا گھر
 واپس لے آیا۔ اُس دن سکھارام نے بھی آنے کا فیصلہ کیا۔

اس نے سنا تھا کہ شرمس کام بہت سہے۔ محنت مزدوری کرنے والے

دو ہاتھ ہونے چاہئیں۔ میں میں تو ان دو ہاتھوں کا کوئی خریدار نہ نکلا۔ سراس نے ان ہاتھوں سے بوجھاڑھو یا تھا۔ اماں کی بھیاں مال گاڑی سے اتار کر ٹرکوں میں بھری تھیں اور ٹرکوں سے اُتار کر گوداموں میں رکھی تھیں، اماں بوریلوں میں سے اس کو گیسول کی ایسی جانی برقی سوندھی سوندھی خوشبو آئی کہ اس نے سوچا ممکن ہے میرے کھیت سے پیدا ہوا انداز بھی ان بوریلوں میں بھر کر آگیا ہے۔ بعض گوداموں میں خفیہ طریقے سے مال دلات کرانا جاتا تھا۔ سکھا دام جانتا تھا یہ کالا بازار ہے۔ مگر وہاں مزدوری دگنی جتنی تھی۔ چار روپے کے بجائے آٹھ روپے روزانہ شاہکار آنے کی اصل پاؤ کھا کر وہ اوپر سے ٹھنڈا پانی پی لیتا اور بس! سینا کی دنگ برنگی روٹنیاں آنکھیں چمکا کر اس کو جلاتیں، اُس کے رنگیں پوشٹروں پر اودھ رنگی میس اس کو لٹھاتیں، مگر سکھا رام سوچتا میری سادتری ان سب سے خب صوفت ہے۔ میں ان کو دیکھنے کے لیے کیوں اپنی محنت کی کمائی خرچ کر دوں؟ اُس کی انٹی میں پانچ سے دس، دس سے بیس، بیس سے پچاس، سو روپے، سو روپے لکھتے جوتے جوتے اودھ اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا کھیت، اس کے بیل، اُس کا گاؤں، اُس کی سادتری، اُس کے قریب آتے چار ہے ہیں، اور وہی خبر محنت کرنے کے بعد جب وہ ان ہی ہاتھوں کا کھیت بنا کر فٹ پاتھ پر سو جاتا تھا اس کے خواب میں سادتری کے پیروں کی چھانگل سنائی دیتی، اور وہ اپنے بھلی جیسے سڈول جسم کو توڑنے کی سڑھی میں پیٹے اُس کے لیے بھا کر ہی اور سگ اور پیاز کی تمٹیاں لاتی اور کھیت کی منڈیر پر بری میٹھ کر وہ کھانا کھاتے۔ اور کبھی کبھی بچوں کی طرح سادتری نوالہ بنا کر سکھا رام کو دیتی اور کبھی وہ شرارت سے سادتری کی انگلی کاٹ لیتا اور جب وہ

اس پر کھل کھلا کر غصہ پڑتی تو پیر وہ غدار بتا کر سادہ تری کے منہ میں دیتا اور اس کے نزدیک
سفید دانت مکھا رام کی مضبوط ٹھوڑی انگلی کو نرمی سے اپنی پکڑ میں لے لیتے اور پھر
دانتوں کی جگہ ہرنٹ لے لیتے۔ سادہ تری کے انگوڑوں جیسے اُردے اُردے بھرے
ہرنٹ۔ اور مکھا رام کو محسوس ہوتا کہ وہ نرمی اور پیار کی ایک لہر میں ڈوبتا جا رہا ہے۔
ڈوبتا جا رہا ہے۔ اور وہ نہیں چاہتا کہ کوئی اسے ڈوبنے سے بچائے۔

ایک دن مکھا رام صبح کو دریا سے اُٹھا، انگڑائی لے کر دانت بھر کی فینہ کا
نشانہ دیکھا، پھر رام کا نام لے کر کھڑا ہو گیا تو اسے اپنی انٹی جہاں وہ سب روپیہ
رکھا کرتا تھا ہلکی لگی۔ گھبرا کر عیدی سے کھولی کر دیکھا تو سب روپیہ غائب تھا۔
چھ مہینے کی محنت پر پانی بھر گیا تھا۔

”کہاں ہے وہ بد معاش؟“ وہ بے تھکا چلا آیا۔

”کوئی بد معاش؟“ کسی نے پوچھا۔

”جو میرے قریب یہاں فٹ پاتھ پر سو رہا تھا۔ سات کوڑی ویرک بھرے
میٹھی باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اس کو بتایا۔ ہاں میں نے ہی اس کو بتایا تھا کہ
میرے پاس ساڑھے تین سو روپے جمع ہو چکے ہیں۔۔۔ مگر وہ ہے کہاں؟“
ایک بوڑھا بھکاری جو ایک کونے میں بیٹھا سب کچھ دیکھتا رہتا تھا اور
اس فٹ پاتھ کی سب خبریں رکھتا تھا بولا۔ ”مارے بھیکو تمہیں اب نہیں ملے گا۔
وہ تو کہیں بیٹھا تھا سارے روپے سے مار ڈالی رہا ہو گا۔“

پورے تین دن اس نے شہر کی خاک چھانی سہرا مار ڈالنے اور مار بچنے

کے غیر قانونی اڈے پر بر آیا۔ بڑے بڑے عجیب آدمیوں سے اس کی ملاقات ہوئی۔ ان میں سے کئی چاہتے تھے کہ وہ بھی ماروسپلائی کرنے کے دھندے میں لگ جائے۔ ایکس دی جینے میں اُس کا سارا نقصان پورا ہو جائے گا۔ مگر سکھ رام کو کام نہیں چاہیے تھا اس کو بھیکو سے بدلہ لینا تھا، جس نے اُس کی تین جینے کی محنت پر پانی پھیر دیا تھا۔ آخر کار چھتے دن دھراوی کے ایک جھونپڑے میں وہ بھیکو کو پکڑ پایا۔ وہ ایک میز پر بوتل اور گلاس اور بجٹے ہوئے چمڑوں کی ایک پیٹ رکھے ہوئے دائرہ بنی رہا تھا۔

سکھ رام نے اُس کو گھٹے سے پکڑ لیا اور چلایا، " نکال میرے روپے۔ " بھیکو نے میں تھا پھر بھی اُس نے انکار نہیں کیا، صرف اتنا کہا:۔
 " گلا تو چھوڑ دو، دیتا ہوں، دیتا ہوں۔ "

سکھ رام نے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیا۔ بھیکو نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ تھکی بھرتے نکال کر میز پر ڈال دیئے۔ سکھ رام نے جھپٹا مار کر ان کو تو اپنے قبضے میں کیا۔ پھر گلی کر بولا، " مگر تُو نے تو ساڑھے تین سو روپے چرا لئے تھے۔ یہ تو صرف تین سو روپے اتنی پیسے ہیں۔ باقی کہاں ہیں؟ "

" یہاں " بھیکو نے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ اور پھر تھکنے لگا کر بولا:۔
 " سب پی گیا۔ ابھی بڑا مزہ آیا۔ تھینک یو۔ تھینک یو۔ دھنیہ داد۔ "
 " دھنیہ داد کسے بچے؟ " سکھ رام نے پھر اُس کا گلا پکڑ لیا۔ اس پر مارو بیچنے والا اور اس کے دو چار ساتھی وہاں آگئے اور سکھ رام کا ہاتھ چھڑا کر لڑا اس کو مارنے لگے۔

”نہیں چھوڑ دو اسے“ بھیکو نے حکم دیا اور اُن لوگوں نے سکھارام کو چھوڑ دیا۔
 ”یہ میرا دوست ہے ذرا غصے میں آگیا تھا۔“ اور پھر سکھارام کی طرف دیکھ کر۔
 ”ہیشو، ہیشو۔ تم بھی بیڑو۔ ابھی ہم دو بوتلیں ادھونگا سکتے ہیں۔“
 ”میں نہیں پیتا۔“ سکھارام نے کہا۔

”یہی تو مشکل ہے کہ تم پیتے نہیں ہو تب ہی تو انٹی میں اتنے دوپے لیے پھرتے
 ہوا ادھر بھی فٹ پاتھ پر سوتے ہو۔ پیر میرے بھائی۔ دادو تھکے سے ہی پیسے
 آئی ہے۔“

یہ کہہ کر اُس نے گلاس میں دادو منڈیل دی اور گلاس سکھارام کی طرف بڑھایا۔
 سکھارام نے سوچا۔ ”یہ بھی ٹھیک کتاب ہے۔ میرے پیسے ہی کی تو دائروں رہا
 ہے۔“ اُس نے گلاس اٹھا کر منہ سے لگایا۔ ایک بار تو بڑی بُرائی۔ پھر دل کوڑھ کے
 وہ پی گیا۔ اُس کو پیپے تو ایسے لگا کر کسی نے چاقو سے اُس کا اٹلا اندر سے چیر دیا ہے،
 مگر تھوڑے ہی عرصے میں اسے احساس جانا رہا۔ اور اس کی جگہ ایک نرم نرم گرمی
 نے لے لی جو اس کے بدی میں دوڑتی جا رہی تھی۔

بھیکو نے اس کا گلاس پھر پھر دیا تھا۔ ”ادھو میرے پیارے
 سکھارام نے دوسرا گلاس بھی پی لیا۔

اب اُس نے گلاس واپس میز پر رکھا ہی تھا ادھو بھیکو اس میں تیسرا پیگ انڈرٹینے
 کے لیے دادو کی بوتل بٹھائی رہا تھا کہ اُس کی نظر اس کی کھائی پر پڑی جہاں ایک سُٹری
 پٹے کی گھڑی جگمگا رہی تھی۔

”یہ بھی میرے پیسے سے لی ہے؟“ وہ پتلیا۔

بھیکو نے کلائی سے گھڑی اُتار کر سکھارام کو دے دی۔ یہ نو میرے یاد آج ہی ایک سنگڑ سے پچاس روپے میں بی ہے۔ خالص دلائی گھڑی ہے، اندھیرے میں بھی وقت بتاتی ہے۔

ڈھائی برس کے بعد آج بھی وہ گھڑی سکھارام کی کلائی پر لگی ہوئی اندھیرے میں وقت بتاتی تھی۔ چار سو پانچ منٹ ہوئے تھے۔ سکھارام نے سوچا وقت بھی کتنے دھیرے دھیرے گزرتا ہے، ساڑھے چار بجیں تو میں اپنا کام چالو کر دوں گا، اور پھر اس کو گھڑی سے بھیکو کی یاد آئی، بھیکو جواب میں جیل کی ہراکھا رہا تھا مگر جس نے سکھارام کے روپے چور اس کو چوری کا راستہ دکھایا تھا۔

پہلے پھٹل موٹی چوریاں۔ پھر ٹی چوریاں، مگر کبھی سکھارام کے پاس اتنے روپے نہ ہوئے کہ وہ گاؤں واپس جا کر اپنی زمین چھڑا لیتا۔ دوپل خرید لیتا، سادری کے لیے دو چار بڑیا ساڑھیاں اور کچے زلیور خرید لیتا۔ اول تو چوری کا مال دکان داروں کو کٹہریوں کے بھاؤ بیچنا پڑتا تھا۔ دوسرے جو آتا تھا وہ کھانے پینے، چلانے میں خرچ ہو جاتا تھا، جیل میں۔ وہ فضلہ ٹھیک کرتا تھا۔ یاد اس حرام کی گمانی میں برکت نہیں ہوتی ہے۔

پونام میں ایک دن شام کو اندھیرا ہوتا ہے ایک عورت کا ثوبہ چھین کر بھاگ چلا گیا مگر اس کم بخت نے بیچ بیچ کر آسمان سر پر اٹھایا۔ چاروں طرف سے لوگ مدد پڑے تھے۔ سکھارام نے بڑے سے دس دس روپے کے نوٹ نکال کر ثوبہ زمین پر پھینک دیا، اور خود بھاگتے بھاگتے ایس۔ ٹی کے بس شینڈ کی طرف آ نکلا۔ ایک

میں جانے کو تیار تھی۔ اس میں سارا ہو گیا، میں چل پڑی سکڑ کر گڑنے پر چھا۔ کہاں جاؤ گئے؟ سکھارام نے جس کاماٹس روڑ نے سے اب تک پھولا ہوا تھا جواب دیا۔ ”جہاں بھی یہ میں جا رہی ہے۔“

میں کینڈا گڑنے کس جگہ کا نام لیا جو میں کی ٹھکر ٹھراہٹ میں نشان زد دیا، پھر میں نے کہا۔ ”سات روپے ہوں گے۔“ سکھارام نے اُسے چوری کا دس کاغذ پکڑا دیا اور تین روپے لے کر حیب میں رکھ دیے۔

صبح سویرے میں اپنی منزل پر پہنچی تو سکھارام آگئیں دتا ہوا اتر اس کا خیال تھا کہ کوئی گاڑی ہو گا، مگر یہاں پہنچ کر دیکھا کہ بڑی مدتی ہے، اچھا خا صا تھبہ ہے۔ بازار بھی ہے، بازار میں دوکانیں بھی ہیں، دکانوں میں سامان بھی ہے۔ چوری کرنے کے قابل سامان!

سکھارام نے فیصلہ کر لیا کہ دو تین روز یہیں گزارنے چاہئیں، کوئی جانتا ہے اس کی قسمت یہاں ہی کھل جائے۔ دلی بھر وہ بازاروں میں گھومتا، کس مکان میں کیکیا سامان ہے، اس کو دماغ میں یاد کرتا۔ کہاں ساڑھیاں ملتی ہیں، کہاں زیور، کہاں میڈیو کس کس مکان میں تجڑیاں ہیں جو یقینی ہے روپوں سے بھری ہوں گی، رات کو چھکی دار بازار کا گشت کرتے تھے۔ مگر اُس نے دیکھ لیا تھا کہ ساڑھ سے چار بجے صبح ۱۵ اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں، میں وہی وقت ٹھیک رہے گا، اس کے کام کے لیے دو چار دکانوں ہی سے اس کا کام چل جائے گا، اور دوکانیں کھلنے کے وقت تک وہ وہاں سے بہت دور نکل جائے گا۔

شہر کی ساری روٹی بندھ کی وجہ سے تھی، زیادہ تر لوگ یہیں کام کرتے تھے۔

سوسکھارام نے سوچا کیوں نہ بندھ کر بھی دیکھ لیا جائے۔ بندھ واقعی بڑا جگمگا تھا۔ وہ پہاڑیوں کے چوچ میں ندی کے پانی کو روکنے کے لیے بندھ بنایا ہوا تھا۔ بڑے بڑے بجل کے کارخانے بھی تھے۔ بندھ پر اب بھی کچھ کام ہو رہا تھا۔ سینکڑوں مزدور کام پر لگے ہوئے تھے۔

ایک مزدور سے سکھارام نے پوچھا ”کیوں بھئی یہ اتنا بڑا بندھ کیوں بنایا

ہے؟“

اس نے کہا۔ تم اتنا بھی نہیں جانتے۔ یہاں پانی اکٹھا کر کے نہری نکالیں گے جو سر کے کھیتوں میں پانی پہنچائیں گی۔“

سکھارام نے سوچا ”میرے کھیتوں میں بھی پانی آئے گا؟“

وہ مزدور اب کہہ رہا تھا۔ ”اب یہ بجل گھر بھی پانی کی طاقت سے چلتے ہیں یہاں

بجل بنتی ہے اور انی تاروں سے دُور دُور جاتی ہے۔ جانتے ہو بھئی بھی بجل یہیں سے جاتی ہے۔“

۔۔۔ اور سکھارام کے دماغ میں بھئی کی لاکھوں جگمگاتی سونے روشنیاں اُبھر آئیں۔

اتنی دُور سے بجل وہاں جاتی ہے! پھر اس نے سوچا ”مگر میرا گاؤں تو صرف چالیس میل ہے یہاں سے۔ وہاں تک تو یہ بجل جاتی نہیں ہے۔ مجھے اس بجل سے فائدہ؟“

ایک اُونچے ٹیلے پر کسی مزدور نے ٹہن کی چھت کا ایک جھونپڑا بنایا تھا وہ حال

پڑا تھا، رات کو نظر بچا کر سردی سے بچنے کے لیے سکھارام اُسی میں پڑ رہا تھا وہاں

سے ایک طرف بہت دُور بندھ پر لگی ہوئی روشنیاں نظر آتیں، دوسری طرف شہر

کے مکانوں اور مکانوں کی بتیاں۔ سوچتا اس روشنیوں کے سمندر میں یہی جھونپڑا

ایک اندھیرے کا نا پڑ ہے۔ پھر سوچتا۔ شاید اندھیرا جھوٹے میں نہیں ہے۔ میرے
مخ میں ہے۔

نہیں یہ اندھیرا کچھ اور قسم کا تھا۔ اس میں تو بندھو کی روشنیاں بھی ڈوب گئی تھیں،
اندھیرے کے سمندر کی تہ میں دو درکیں دھندلی دھندلی سی ٹٹا رہی تھیں، اس کا
اپنا گلابی گھٹنا نہیں معلوم ہوتا تھا، ایسا گت تھا کوئی دنیا کا ٹھکانہ نہ رہا ہے بلکہ
ہے یہ میرا وہم ہی جو، اس نے سوچا اندھیرا ایک بار پھر گھڑی کی اندھیرے میں چمکنے والی
سوتیلیں کی طرف دیکھا۔ چار بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ اب اسے چلنا پڑا ہے۔
باند پہنچنے میں کم سے کم دس منٹ تو لگیں گے۔ یہ سوچ کر وہ کھڑا ہی ہوا تھا کہ
زمین کے اندر سے ایک گڑا گڑا ہسٹ کی آواز آئی جیسے سڑنگ میں کوئی ریل چل رہی
ہو یا ہوائی جہاز بہت نیچے اڑ رہا ہو اور چھت پر گرنے ہی والا ہو۔ ساتھ میں اس کے
پاؤں کے نیچے سے زمین جیسے سر کی گئی ہو۔ قدم ڈگمگائے تو اس نے اندھیرے میں
دیوار کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ ہاتھ سے چھوا تو اس کو ایسا لگا جیسے دیوار بھی رٹکھڑا
رہی ہے۔ اس نے شام کو شراب پی ہوتی تو وہ سمجھتا یہ سب نقشے کا کڑوا ہے۔
لگا اس نے تو چار دن سے مار دو کا اتھ بھی نہ لگایا تھا، پھر یہ سب کی۔۔۔
”بھو بھو پھل!“ دفعہ یہ خیال بھل کی طرح اس کے دماغ میں گوندا اندھ اٹھے
لٹھے میں جھوٹے ٹرے کی رٹکھڑائی ہوئی دیوار میں اور کھڑکھڑائی ہوئی ٹین کی چھت اس کے
سر پر آ رہی۔

جب اس کو ہوش آیا تو سب سے پہلے جو چیز اس نے محسوس کی وہ گنچک
کی تیز بو تھی اس کا ایک دم گھوٹنے والا دھڑل ٹھٹھ کا بادل سا اندھیرا اب بھی اتنا گرا

تھا کہ اس کو چاقو سے کاٹ سکتے تھے۔ سکھ اسلام کو اپنے ماتھے پر پانی کی ایک لکیر چلتی ہوئی معلوم ہوئی ٹوٹل کر دیکھا تو منہ سے "سی" نکل گئی۔ سر میں گہرا زخم آیا تھا جس میں سے خون دس رہا تھا۔ ٹانگوں پر، بازوؤں پر، ایک طرف چہرے پر بھی چوٹیں آئی تھیں۔ مگر یہ وقت ان معمولی زخموں کی پرواہ کرنے کا نہیں تھا نہ زخموں کی ٹیس اس کو سمجھ کر بے ہوشی سے باہر نکال لائی تھی اور اب ایک ہی خیال اس کے دماغ میں گھوم رہا تھا۔ اس جھونپڑے کی طرح بازار میں دکانوں کی دیواریں اور چھتیں بھی گر گئی ہوں گی۔ اس کو تالہ توڑنے کی تحلیف بھی نہ کرنی پڑے گی۔ اُس نے اپنی گھڑی دیکھی۔ پندرہ بجے چار بجے تھے۔ بھوپال آئے صرف دسٹل منٹ ہوئے تھے۔

نہیں کا پتہ اس کے سر پر گرا تھا اس کو ہاتھ سے ہٹا کر وہ اٹھ کھڑا ہوا، چاروں طرف دیواروں کا ٹیٹوں کے ڈھیر تھے۔ اندھیرے میں ٹوٹن، ٹکڑا ٹکڑا پڑتا، وہ اندازے سے شہر کی طرف چل کھڑا ہوا، اندھیرا اب ایک ٹنگے دھندلکے میں تبدیل ہو رہا تھا۔ گہرے پھاڑے میں سب جگہ بجلی کی روشنیاں بجھ گئی تھیں۔ اب قرائس کا کام ادھی آسان ہو گیا تھا۔

سادا شہر ایک دم گر پڑا تھا۔ جیسے گھرنے ہوں، بچوں کے بنائے ہوئے مٹی کے گھروں سے ہوں۔ زمیں سے دھول کے بادل اٹھ رہے تھے۔ اینٹوں، پتھروں، ٹیمپ کے پتروں کے نیچے دبے ہوئے آدمی۔ مردہ عورتیں، بچے۔ جو مر نہیں گئے، تھے یا بالکل بے ہوش نہیں ہو گئے تھے وہ پتھر رہے تھے، اندھے رہے تھے، سکھ رہے تھے، ایک رہے تھے، کلاہ رہے تھے۔ ایک نے ایک مایہ

پاس سے گزرتے دیکھا تو چلتا یا۔ ”بھائی۔ بھجے بچاؤ۔ بھجے بچاؤ۔ بھجے اینٹوں کے
 اس ڈھیر میں سے نکالو۔ شاید میری ٹانگیں جاتی رہی ہیں“ مگر سکھارام کو اس
 وقت ایک ہی دھن تھی۔ وہ کسی کی جان بچانے کے لیے تیار نہیں تھا، آج بھنگوان
 نے اسے پچ پچ چھتر بھاڑ کر دولت دی تھی۔ ایسا موقع وہ کھونے والا نہیں
 تھا۔ وہ ہاتھوں سے جتنا کچھ سمیٹ سکا وہ لے کر وہاں سے چل دے گا، اور
 جب تک لوگوں کو ہوش آئے گا وہ اپنے گاؤں، اپنی سادری کے پاس پہنچ جائے گا۔
 اندھیرے میں گرتا پڑتا، مستحیض، ٹھوکریں کھاتا، وہ بازار کی طرف چلا جا
 رہا تھا، کہیں کہیں مکانوں کی دیواریں بچ مرٹ پر آ رہی تھیں۔ اینٹ پتھر کے
 ڈھیروں سے بچنے کے لیے سکھارام کو گڑے ہوئے گھروں میں سے راستہ بنانا پڑتا۔
 ایک بد قماش کو غصہ ہوا کہ اس کا پیر کسی نرم چیز پر پڑا ہے۔ شاید کسی کی ٹانگ
 تھی یا ہاتھ تھا۔ ایک دھکی سی ”آہ“ سنائی دی اور پھر سکھارام آگے بڑھ گیا۔
 سکھارام نے صبح کے دھند لگنے میں دیکھا کہ بازار میں کس دکان کی چھت یا دیوار
 نہیں بچی تھی۔ دکانوں کا سب سامان بکھرا پڑا تھا یا اینٹ پتھروں کے ڈھیر کے
 نیچے دبایا ہوا تھا۔ سب سے پہلے سکھارام نے ساڑھیوں کی دکان سے دس پندہ
 ساڑھیاں گھسیٹیں۔ ایک ساڑھی کو دھرا کر کے زمیں پر پھیلا یا اس میں سب
 ساڑھیوں کا ڈھیر لگایا۔ کچھ کپڑے کے تھان ڈالے۔ پاس کی دکان سے دھٹیرو
 مے کران کو رکھا۔ ایک جیور کی دکان کے بلے میں زیور بکھرے ہوئے تھے سکھارام
 نے ٹوٹی ٹوٹی کراٹھائے۔ یہ دیکھنے کا وقت نہیں تھا کہ سونے کے ہیں یا چاندی کے۔
 ایک تجوری اندھ سی پڑی تھی اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

ایک اور دوکان کا کیش کس اڑ کر کہیں سے کہیں پہنچ گیا تھا۔ اُس کو کھونے کی کوشش کی۔ بڑا بھاری تھا ضرور روپے بھرے ہوں گے۔ جب نہ کھول سکا تو بند کا بندھی ڈھیر میں شامل کر لیا۔ ساڑھی کا ٹکڑا باندھا۔ اب تو وہ اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ بڑی مشکل سے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر اس نے سر پر رکھا۔ مذنی کافی تھا اس کی ٹانگیں بڑھکھڑانے لگیں۔ مگر اس نے جی کڑا کر کے قدم بڑھائے تاکہ سویرا ہونے سے پہلے وہاں سے باہر نکل جائے۔

دھیرے دھیرے آسمان میں سویرا ابھروا تھا۔ پورب کی طرف بادل پہاٹیں، بندھ، ہلکے ہلکے پر چھائیاں سی اب دکھائی دے رہی تھیں، دھیرے دھیرے شہر کے کھنڈ بھی دھرتی پر ابھرو رہے تھے۔ ہر طرف سستا تھا اور تباہی۔ ایسا لگتا تھا شہر مر گیا ہے، دنیا مر گئی ہے صرف ایک آدمی زندہ ہے، اوروہ دونوں ہاتھوں سے دنیا کی دولت بٹور کر لیے جا رہا ہے۔

نہیں (اُس نے سوچا) کوئی اور بھی زندہ ہے، ایک بچے کے رونے کی آواز نے سکھارام کو چنکا دیا، جیسے یہ آواز باہر سے نہ آئی ہو خود اُس کے من کے اندر سے آئی ہو۔ اُس نے تڑکر دیکھا، ایک گھر کی چھت اور دیواریں ڈھیر چوہلی تھیں اُن ہی میں ایک طرف باپ مرا پڑا تھا، پاس ہی ماں، اوسان دونوں لاشوں کے قریب ہی ایک سال ٹوڑا سال کا بچہ جو کسی ٹھہرے سے بچ گیا تھا سینٹوں کے ڈھیر پر بیٹھا دھاڑیں مار مار کر روتا تھا۔

سکھارام نے بچے کو دیکھا پھر ایسے نظر پھیرا جیسے بچے نے اُس کی چھدی کپڑا لی ہو، جلدی جلدی قدم بڑھائے کہ اتنی دیر پہنچ جائے کہ بچے کی آواز اس کے

کانوں تک نہ پہنچے۔ مگر بچے نے پیٹے سے بھی زیادہ زور سے رونا شروع کر دیا۔
چلتے چلتے اس کے قدم آپ سے آپ رُک گئے، اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ
اُس کا اچھا بچہ ہر جہر ہمیشہ اُن کے پسینوں میں آتا تھا۔ مگر جس نے اب تک سادری کی
کو کھ سے جہنم نہ لیا تھا۔

اس نے دھڑک بچے کی طرف دیکھا۔ سر پر گھڑدا ٹھانے اُٹے پاؤں اس کے
قریب گیا۔ سوچا کسی طرح اس گھڑی کو بھی لے چلوں اور اس بچے کو بھی اُٹھالوں۔
مگر ہاتھ وہی تھے۔ یا ایک بوجھ کو سنبھال سکتے تھے یا بچے کو گود میں لے سکتے تھے۔
اس نے سر سے گھڑی اتار پھینکی۔ دھڑک بچے کے باپ کے پاس گیا، اسی پر
کے سر پر ایک بھاری پتھر کرا تھا۔ کب کا دم توڑ چکا تھا۔ مل کی بنی پر بھی ہاتھ لگا۔
ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو چکے تھے، پھر اس نے بچے کی طرف ہاتھ پھیلائے۔ بچہ
جھمک کر اُس کی گود میں آئے ہی خاموش ہو گیا جیسے اُسے اپنی منزل مل گئی ہو۔
سکھرام نے ایک نظر اُس گھڑی کی طرف دیکھا، جس میں دنیا کی ہر دولت موجود
تھی۔ پھر دونوں ہاتھوں سے بچے کو سنبھال کر اپنی چھاتی سے لگا لیا اور چل کھڑا ہوا۔
دور بندھ کے پچھ سو درج بادلوں میں سے اپنا سر نکال کر کوئٹہ نگر کی تباہی کو
دیکھ رہا تھا، مگر سو درج کی ایک نرم کرن سکھرام ادا اُس کی چھاتی سے لگے ہوئے
بچے پر پڑی اور بچہ جس کی آنکھ میں اب تک آنسو تھے، آپ صاب سُکھا دیا۔
ہاتھ نہ وضع نہ ہوا

نوالہ

پورے چال میں ایک دند بچا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوا تھا جیسے کسی کھول میں سانپ نکل آیا ہے۔ یا کسی کے بال بچہ ہو رہا ہے۔ عورتیں ایک کھول سے دوسری میں گھس رہی تھیں۔ شیشیاں، برقعیں، ڈبے بے سب کی سب سرلاہیں کی طرف چپک رہی تھیں۔ جیسے سرلاہیں کا آخری وقفہ ہوا وہ ساری پڑوسنیں اپنی سی کرنے پر تلی ہوں۔

ایک طرح سے تو سرلاہیں کا واقعی آخری وقت تھا۔

ان کی ٹریس بس چھوٹنے ہی والی تھی۔ وہ پورے ۴۴ برس کی ہوتیں مگر ان کے دماغ اندیشہ والہ ہیں نے پر بھاکر کے سٹریٹکٹ میں ان کی عمر کے پورے پانچ سال نہ بڑھ کر لیے ہوتے۔

مگر کاغذ کی عمر ایسا زبردست سہارا نہیں ہوتی۔

وہ یورپی کے کسی گھٹام سے گاؤں کی پیداوار تھیں۔ مگر بیٹی میں اتنے سال رہیں کہ وطن کو بھول بھال کے بیٹی کی ہی ہو گئی تھیں۔ ان پر کسی صوبے کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ کوئی انہیں گجراتی سمجھتا، کوئی مارواڑی اور سندھی بس جگت سرلاہیں ہو گئی تھیں۔ سرلاہیں کے اے ایم ہسپتال میں نرس تھیں۔ جسٹنگائی الاؤنس ملا کے دوسرا بیس

روپے ملتے تھے۔ بارہ روپے کمرے کا کرایہ دے کر تانہ بچ جاتا تھا کہ بڑے ٹھاٹ سے رہتی تھیں۔ اسپتال سے مریم بی بی کا سامان، اسے اپنی کسی گریڈیاں، مرکبوری کرم اصل گلیسرین اور پینٹ دواؤں کے سپل لاکر مفت تقسیم کیا کرتی تھیں۔ ان کا کمرہ آس پاس کے علاقے کے لیے اچھا بھلا اسپتال تھا۔

سرلا بین بڑے کام کی چیز تھیں۔ اوپر سے شکل و صورت کے ساتھ ساتھ چال چلن ایسا تھا کہ کہیں کسی کی گزرتی پر شے پڑنے کا خدشہ نہیں ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بے انتہا ہر دل عزیز تھیں جو ہر نکل جاتیں ان کے جنائے ہوئے بچے بھلاتے مدد تے سمجھتے نظر آتے۔ لوگ ان کے قدموں میں آنکھیں بکھاتے۔ ہر مردے والا ہر دم کا نذر انہیں رعایت سے مال دیتا۔ وہ مول تول کرتی جاتیں اور بعضوں کے مال چال بھی پوچھتی جاتیں۔

”کیوں دے کسی، ہو کی کر کا مدد کیسا ہے۔ ارے شاکر میاں! مذہبی کے پیروں کی سوچیں اتنی کم نہیں۔ شام کو لے آنا۔ انجکشن دے دوں گی۔ اسے اور مہنی تیرے گھٹنوں کے مدد کا کیا ہوا! تیرا مرد بچہ وار دی کر آنے لگا ہے۔“ وہ خیر خیر چھٹی، کلم دیوی کے ٹکڑا والے بس اسٹاپ پر پہنچ جاتیں مادہ ان کے رخصت ان کو دعا میں دیتے رہ جاتے۔

بس سب کو یہی دکھ تھا کہ سرلا بین اب تک کنواری بیٹھی تھیں اگر شادی کے بعد وہ بیروں کو جی جوتیں، یا میاں چھوڑ کر چلا جاتا تو بھی صبر آ جاتا۔ مگر یہ تو نراندھیر تھا کہ ان کی ریل چھوڑ دی تھی اور جیروں سامنے کا دھور دھور نشان نہ تھا۔ سب کے سران کے احسانوں کے بوجھ سے جھکے ہوئے تھے۔ وہ سب کے لیے کرتی تھیں،

لیکن ان کے لیے کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ شر بھی ہے یہاں زندگی سرٹ
دوڑتی ہے۔ یہاں مشاطہ اور نائن کا فیشن ختم ہو چکا ہے۔ یہاں تو بس آنکھ
لڑ جاتی ہے اور بیاہ ہو جاتا ہے۔

سرلا میں فلم ہیروئن زسسی، ڈراؤنی بھی زتھیں کہ کوئی اللہ کا بندہ ان پہا خت
ہی نہ ہو پائے۔ آدمی کا بچہ تھیں۔ باب بچپن ہی میں مر گئے ماں ہمیشہ کی روگی۔
سنگر شیں کے بل بوتے پر انہیں پالتی رہیں۔ پھر جب بیٹی کا نئے لگی تودہ بالکل
ہی ٹوٹ گئی۔ وہ ایک بار اچٹا ہوا انہیں بیٹی کے بیاہ کا خیال آیا، مگر اس خیال
کے کوئی معقول صورت اختیار کرنے سے پہلے ہی وہ چل بسیں۔ وہ دن اور آج کا
دن سرلا میں ایسی اپنے کام میں مجتہد کہ شادی کا خیال تک نہ آیا۔ خیال آیا بھی ہو گا
تو انہوں نے کسی سے تقاضا نہیں کیا اور تھا بھی کوئی جس سے تقاضا کرتیں کہ بیٹی
بہا ل بیاہ کلا دو؟

کہتے ہیں اگر کوئی کنواری کیا بھی رہے تو دھرتی کی چھاتی پر بوجھ ہوتا ہے
اور دھرتی کے اس کب کا پاپ سب کو لگتا ہے۔ کم از کم سرلا میں کے باشندوں
کا تو یہی عقیدہ تھا۔ ان کی ٹکی اندھا دھائی قابل ستائش تھی، مگر ٹکی کی بھی ایک حد
ہوتی ہے۔ یہ تو ان سے کوئی نہیں کہتا تھا کہ بابا کسی بھی بارے میں بڑے سخت مزے
کے گھٹے میں بائیں ٹال کر جھول جاؤ۔ مگر عورت کے چند گز ہیں جنہیں اگر سلیقے سے
استعمال کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ آج کل تو رہا نہ اکیلے ماں باب کے
بس کی بات بھی نہیں۔ اچھی شریف زادیوں میں اب تو چڑیا خود ہی گھیرتی ہیں۔ پھر
شریک سر جھکا کر ڈور دلا دیں گے ہاتھ میں تھما دیتی ہیں۔ کوئی داغ نہیں لگتا کسی کو

پتہ بھی نہیں چلتا۔ والدین بھی سرخرو، دوسرا دس بھی گئی۔ یوں ہوا کرتی ہیں شادیاں، مگر نہیں جو پاتیں تو بے چاری سرلا ہیں جیسی شمس گایوں کی۔ جو دنیا کے زخموں پر بھاڑ رکھنے میں ایسی گم ہیں کہ اپنا کچھ ہوش نہیں۔ سب کے دکھ بانٹتی ہیں، راتیں آنکھوں میں کاٹ دیتی ہیں۔ نوزائیدہ بچے ہتھیلیوں پر جھپکتی ہیں۔ اور پھر اپنی نیم تاریک کھون میں الٹا سیدھا نکل کر سونے کھاٹ پر پڑ جاتی ہیں۔ کوئی اتنا نہیں جو ان کی تنہائی کے برستے ہوئے زخموں پر بھاڑ رکھے۔

یہ اتنا بڑا چنگھاڑتا بیٹی، کیا یہاں کوئی اکیلا عورت کے پیار کا بھوکا نہیں؟ کسی کو عورت کے لمس کی چاہت نہیں، سرلا ہیں کسی کی محتاج نہیں، اپنا کھاتی کھاتی ہیں، ساری چال میں ایک نگینہ سا کمرہ ہے جو کسی فلیٹ سے کم نہیں۔ صنف کر ہی بھی ہے اپنا الگ سندھاس بھی۔ اب اور کیا چاہیے اس دنیا میں۔

لوگوں کا کیا ہے، کنوارے تو آنکھوں میں کھٹکتے ہیں۔ ہر دم شادی کی دعائیں شادی کے تقاضے۔ تو بھی شادی کر لو تو بچے کی فرمائش ایک بچہ ہوا تو یہ آلاہٹے کر اسے ہے بس ایک ہی۔ چلیے دوسرا پیدا کیجئے مگر سرلا ہیں کہ کبھی یقین نہ ہوا تھا کہ وہ سدا کنواری ہی رہیں گی، کوئی تو ہو گا یہاں سے وہاں تک پھیل دیا میں۔ کوئی ایک اللہ کا بندہ جسے خدا نے ان کی زندگی کا حصہ مار بنایا ہو گا، یہ امد بات ہے کہ وہ اسے ڈھونڈ نہیں پاتیں۔ لوگوں کے کہنے سے انہیں اور بھی خیال آنے لگا۔ مگر جب بھی انہوں نے کسی کو اس خیال سے دیکھا وہ خیر منورہ ثابت ہوا اور اپنی بیوی کی پوشیدہ بیماریوں کا ردنا لے بیٹھا۔ کچھ وقت ساتھ گزارنے کو تو بہت سے تیار ملے مگر ہاتھ پکڑ کے نبھانے کے خیال سے ہمارے کرپڑھنے کا ارمان

کسی کے دل میں نہ جھانکا۔ ہاپٹل میں بھی کبھی کسی نے گری گری پراسرار آنکھوں سے انہیں نہ دیکھا کبھی کسی نے انہیں ہٹ کر راستہ دینے کی ضرورت تک نہ محسوس کی۔ لوگ دفعتاً نکل جاتے اور وہ آٹری ہو کر دیوار سے ٹک جاتیں۔

گام دیوی کے ناکے سے وہ روز صبح کو پونے آٹھ بجے والی بس پکڑا کرتی تھیں۔ بس میں سب ہی روز کے جانے پہچانے ہو کر تے تھے۔ سب کی بیٹھیں کچھ مقرر سی ہو گئی تھیں۔ اس دن وہ بے خیالی میں اپنی سیٹ کی طرف بڑھیں۔ ایک اجنبی کو وہاں بیٹھا دیکھ کر انہوں نے لبالب بھری ہوئی لہجہ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور بس کے پیچ میں لٹکی ہوئی رکاب پکڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ اجنبی نے انہیں سر سے پر تک دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔

”بیٹھ جائیے۔“ وہ رکاب پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور اخبار پڑھتا رہا۔

انہوں نے پہلے تو بے کھلا کر جھٹ سنا پتا بڑھ دیا چاکر کیوں کوئی چور اچکا تو نہیں۔ پھر کبھی کسی چیٹ کا شہر ہو گا اور ابھی پیروں کے دم اور کمر کے دکھ درد کا قہر شروع کر دے گا۔ مگر وہ رکاب پکڑے کھڑا جھولتا رہا اور اخبار پڑھتا رہا۔ جب انہیں یقین آگیا کہ وہ خود بھی کسی تھک مرض میں مبتلا نہیں تو وہ سناٹے میں رہ گئیں، ایسا تو کبھی ہوتا نہیں!

مگر دوسرے دن جب پھر وہی ہو کر وہ بس پر چڑھیں اور اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور کھڑا ہو گیا تو وہ بیٹھنے کو تو جیتے گئیں مگر بڑی کسکٹیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کریں، جی چاہا اسے سبھی بھر سلفا کی گریاں ہی دے دیں۔ کیوں زخم تلاش کر کے مرکوری کرم کا پچا ہار کے کے سفید جھک سے پٹی باندھ دیں، مگر اس کی مکمل صحت

سے ان پر اوس بڑ گئی، ایک کھر دے نچے تک کا نشان نہ تھا۔ وہ بس میں بے تعلق سا کھڑا
جھولتا رہا اور اخیر بڑھتا رہا۔

تیسرے دن جب یہی عادت ہو تو سر لاہین کے چھکے چھوٹ گئے۔

”گھڑے کا ہے کوئی روز روز سیٹ دیتا ہے کیا تیرے اماں ہمیں نہیں

کھڑے“ ان کا جی چاہا اسے کسی بات پر خوب جلی کٹی سنائیں، مگر وہ ایسا بے تعلق سا
کھڑا جھول رہا تھا کہ انہیں بات بے لگی سی لگی۔

جب ہفتہ بھر یہی دستور چلتا رہا تو سر لاہین بالکل اُٹھل پھٹل ہو گئیں خدمت گزار

کی تورہ عادی ہو چکی تھیں۔ کسی کا احسان اٹھانے کی ان میں عادت نہ تھی۔ ان کے دل

پر بوجھ بڑھنے لگا۔ ڈیوٹی پر انہیں بار بار خیال آتا کہ کیا کریں۔ دوسری بس سے چلیں
تو وقت پر پہنچنا ناممکن۔

سر لاہین کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ دنیا سے روٹتی

روٹتی رہنے لگیں، جیسے کوئی ان کے ساتھ سخت زیادتی کر رہا ہو۔ ان کا مزاج

بڑا تازک ہو گیا، اب بات بات پر الجھ پڑتیں۔ بے بات کے روٹنے لگتیں۔

ڈیوٹی سے لوٹتیں تو انھیں بند کر کے کھاٹ پر پڑ جاتیں، نہ کھانے کی مہم نہ بدھ
نہ کچھ۔ کسی کو کچھ دکھ درد بھی ہوتا تو پاس آتے ڈرتا۔

”سر لاہین کو عشق ہو گیا ہے“ ستوگرہ کٹ نے رام دئی کو بتایا۔

”دو موٹے، تیری کھاٹ کٹے، سر لاہین تو دیوی ہے دیوی“

رام دئی نے ستو کی سات چشتیں قدم ڈالیں۔

”میر جو کہہ رہا ہوں“

”کیا کہہ رہا ہے، تیرے منہ میں بھوبلی“

مگر جب ستوگرہ کوٹ نے بتایا کہ گام دیوی کے ملکے پر اس کی بزنس ہوتی ہے۔ ہر ایک کو فون پر کہنا، اس کی جیب کے بوجھ کو ہلکا کرنا، اس کا دوز کا کام ہے۔ ایک عدد بالور دھانا اپنی سیٹ سڑا بین کو دے دیتا ہے اور خود کھڑا سفر کرتا ہے۔ آج سے نہیں ہفتوں سے یہ قصر چل رہا ہے اور معاملہ قطعی چٹا نظر آرہا ہے۔

”ہائے میں مر جاؤں!“ رام دئی نے چھائی کوٹ لی اور دوڑی دوڑی شبیر کے پاس گئی۔ شبیر بھی سناٹے میں رہ گئی۔ پھر دونوں مل کر سعادت کی بھوکے یہاں گئیں۔

سعادت کی بھو منڈیر پر ہونٹے کو لٹکاٹے اجابت کلاہری تھی۔

”خدا کی قدرت!“ لوشا سودی میں گرتے گرتے بچا۔

پھر یہ بات آگ کی طرح ساری چال میں گھوم گئی۔

”ایسا ہی ہوتا ہے“ لکشمی گھانٹے نے کہا۔ وہ ریڈی میڈ کپڑوں میں کالج بٹن

بناتی تھی اور بڑی جہاں دیدہ تھی، اس کا میاں لاپتہ تھا، ایک لڑکی تھی۔ وہ اس نے

مشن اسکول میں دس دی تھی، سب اسے گالیاں دیتے تھے کہ اس نے لونڈیا کو

جیسا بنوا دیا۔ لیکن لکشمی ایک کان منتی تھی دوسرے کان اڑا دیتی تھی۔ کالج بٹن سے

کہیں پیٹ پٹتے ہیں؟ سب جانتے تھے، وہ راتوں کو جایا کرتی ہے، لالہ کے

ٹدے گا بھوں کو چال پر نہیں لاتی مگر کسی کو کیا؟ اس نے وار پی کے کبھی غلط نہیں

کیا جیسے آئے دن انیٹری کیا کرتی تھی۔ نام اس کا ایڈتھ تھا مگر انیٹری ہر کر رہ گیا تھا۔

وہ کھلے بندوں دار و کار خدا کرتی تھی۔ لالہ کو ڈٹ کر بخشش دیتی تھی۔ پولیس سے بھی

ہفتہ مقرر تھا۔ کوئی اس کے منہ نہیں لگتا تھا۔ کیونکہ وہ آئے دن وار و چر معا کر

انگریزی میں گایاں بکا کرتی تھیں۔ کم سے کم چال دالوں کا تو یہی خیال تھا۔ کئی بار بھنڈ میں آچکی تھیں، اور سڑا میں کی شکر گزار تھی کہ انہوں نے اس کی تیا پار لگائی تھی چال میں کئی آریہ باختہ عورتیں رہتی تھیں، مگر کسی کو طعنہ دینے اور اعتراض کرنے کی فرصت نہ تھی۔ ہر ایک کی کوئی نہ کوئی رنگ رہتی تھی۔

”تو بیاہ کیا چال میں ہی رہے گا۔“

”اُدکیا؟ سامنے کے میدان میں تہوتی جائے گا۔ بمبئی میں تو رڑی بیسی شایاں تہوتیاں کسے کی جاتی ہیں۔“ شبو نے فیصلہ کیا۔

”ہائے مزہ آدے گا۔ اپنی سڑا میں دلیس بنے گی۔ رام دلی کو شادیوں کا بڑا شوق تھا۔ وہ ہر موسم میں نئی شادی رچاتی تھی۔ کچھ دن بعد دہلہ اس کی ٹھکانا لگے کہیں کبھی کپڑے لٹے بلک چرا کے بھاگ جاتا۔ ابھی پچھلی شادی تو اس نے باقا عہدہ کی تھی۔ تہوتیاں سننے میں بہت خرچ آتا اس لیے بس کھول ہی میں پنڈت کو ہے کی انگریز جیسا ہون لے کر آگیا اور پھر بے ڈال دیئے۔ رام دلی خوب سچ کر دلیس بنی۔ چالی پر عجیب عروسانہ موڈ چھا گیا۔ خوب سی مندی گھول کر سب نے تہوتی۔ ٹھیں بجا کر فلمی گانے گائے گئے رخصتی کے وقت جو ہاتھ لگ گیا رام دلی اس کے گلے لگ لگ کر روئی ہائے میرا بیرن۔ ہائے میرا بایل، ہائے مجھے مت اپنی ڈیوڑھی سے نکالو۔“ وہ کسی فلمی سینی کی یاد میں چنگھاڑتی رہی۔ پنواڑی نے تیز تیز آواز میں گراموفون لگا دیا۔ ”کلاس کو بیاہی ہو میں“ گونایت سرسٹ چھپاتی آواز میں بے مدبے سری عورتیں گلو ہی تھیں مگر یہ کم بخت گیت نہی کچھ ایسا ہے کہ جی بھر آتا ہے۔ میچی کی رخصتی کا سال بھی عجیب ہوتا ہے۔ ملاکہ رام دلی رخصت نہیں ہوئی۔ اس کا بھینگا دو لہا بھی بیاہ کر

چال ہی میں آگیا۔

کئی دن رام کوئی شرمائی لمبائی پائیل بجاتی پھرتی رہی۔ پھر دو ہفتے اس کی پٹائی شروع کر دی۔ روز دہار وہی کرٹیاں توڑتا جیسے بھر کے اندر ساندہ اس کے چاندی کے کڑے اور ناک کی لونگ سے کر بھاگ گیا۔ رام کوئی تھوڑا سبائے کئی دن تک لنگڑائی ہی ہو اس کی جان کو کوستی رہی۔

ان تلخ تجربوں کے باوجود لفظ 'شادی' سے رام کوئی کے دل میں لڑو پھٹنے لگتے۔ اپنے علاوہ بھی کسی کی شادی ہو تو مضائقہ نہیں، موقع خوشی کا ہے۔
ڈرتے ڈرتے سرلا بھی کو چھیڑا گیا۔ اور جب وہ ذرا جھینپ گئیں تو بس دھر گیا گیا۔

”سرلا میں بیاہ کر ڈالو۔“

”ہاں جی ہی عرصے کیلئے کھانے کی۔“

”تمہارے ماما پتا کی آتا کو بھی شانتی ملے گی۔“

”اے رام، ہم تو خوب بھل چائیں گے۔“

”چوک میں تنہا رہتے گا۔“

”دو ہفتے گھوڑے پر چڑھ کے آوے گا۔“

”سرلا میں گھونگھٹ کاڑھو گی؟“

”اے بھلا کیوں نہ کاڑھیں گی، کہیں پنا گھونگھٹ کے دھس بنی ہے عرصہ کوئی“

”نہ مائے دی، وہ اس لائن میں ایکسپریٹ مانی جاتی تھی۔“

”ہائے چال سوئی ہو جائے گی۔“

”سعادت کی بہو کا بچہ کون جنائے گا؟“ ہر سال سعادت کی بہو کو سروسٹا میں کی خدا کی خدمت پڑتی تھی۔

”سوت نہ کپاس کو طو سے لٹھم لٹھا“ سروسٹا میں چڑھ گئیں ”کس نے کہہ دیا تم سے شادی بیاہ کا؟“

اسے ہے تو پھر مدد زبیس میں سیٹ کیوں دیتے ہیں؟“ سب تو متناہی۔

”یہ تو ان کی بھل منہا بہت ہے“ سروسٹا میں زبیس سے مسکرائیں۔

”اسے تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو، آج سیٹ دیتے ہیں۔ کل دل بھی دیں گے“ سعادت کی بہو نے گرد کے لٹٹے کو کوٹے پر ٹھک کر فیصد کیا، اس پر سب چمک اٹھیں۔

ان پیاری پیاری باتوں سے سروسٹا میں کی آنکھوں میں بھی خراب بھوم اٹھے۔ انہیں ان مدد تو، آبرو یافتہ سزاؤ عہد توں پر پیار آگیا۔ دل شکر گزار ہی کے احساس سے لرزہ ہو گیا۔

”اب کی بار مدد حکم اترنے کی ترشکایت نہیں“ وہ بات بدلنے کو ایک دم زبیس پر گئیں۔

”ابھی تک تو نہیں“ سعادت کی بہو منہاٹی۔

”اور دیکھا بیٹھے، اب کے اگر کچھ لفظ ابراؤ کرسم سے پریس میں دے دے دے۔“

”لوپ کیوں نہیں لگوا لیتی؟“

”بابا وہ لوگ سہینڈ کا نام پوچھتے“ ایڑتہ بھٹائی۔

”ایڑٹری صدیک بابو کا نام دیدے“ رام دلی نے مشورہ دیا۔

”بٹ، ہم کیسے تو کس ہے... ٹپا...“

”تو سراچی کا نام دیدے“

”چپ رہو چڑیلو“۔ سرلاہی نے سب کو ڈانٹا۔ اور سعادت کی گرد کے
لوٹڈے کو چپ کرنے کے لیے چچے بھر سیرپ اسے چٹا دیا۔

”دور ہو یہاں سے“

”پہلے یہ بتاؤ شادی کب ہوگی؟“ شہباز گئی۔

”ان تاریخ مقرر ہو جائے“۔ لکشی نے مطالبہ کیا۔

”کس کی شادی؟ کیسی تاریخ؟ کوئی بات نہ چیت“۔ سرلاہی بگڑ گئیں۔

”بات نہ چیت، یہ کیسے؟ کیا دلدلا کر لگا ہے؟“ تمقہ پڑا۔

ابھر سب نے بوکھلائی ہوئی سرلاہی کو سمجھایا کہ ان کی ڈھیل سے ہی یہ ٹھنڈا
ہوا ہے کہ ان جیسی گھونٹی کنواری بھیٹی ہے۔ مرد کی بات تو ٹھنڈا ہوتی ہے، جب تک
منہ میں تو اکر نہ ٹھونسو بات نہیں بنتی۔ سب سرلاہی کے بھی خفاء ہیں، دشمن نہیں کو
تو اپنی جانیں بھی تمہارے لیے دے دیں۔ یہ چڑیا اب دانت سے نہ جانی چاہیے۔

”کو تو ان سے بات کرنے کو بولوں“۔ سعادت کی ہونے پوچھا۔

”اے ہم خدیبات کرنے کو تیار ہیں ان سے کہ بابا لڑکی پسند ہے تو ایسا
بات کرو“۔ مگر رام دلی کی اس رائے سے سب کا اختلاف پیدا ہو گیا۔ اسے مردوں کو
پھانسنے میں ملکہ حاصل ہے مگر کم بد بخت کو شادی کا چسکا پڑ چکا ہے، اگر لانت میں
نجات کر گئی تو؟ نہ بابا رام دلی سے ملکہ بچائے۔“

”شاید بے چارے کی ہمت نہیں پڑتی۔ یہ رعب داب کے کپڑے پہنے چشمہ

چلا جا کے جاتی ہیں وہ سوچتے ہوں گے میٹھی نظر سے دیکھا اور جوتے پڑے“
شبنو نے شخص کی۔

”کپڑے نئے کا اثر تو پڑتا ہے۔“

”ڈیوٹی کی ادا بات ہوئی۔ بچے ہر گھڑی ڈاکٹر کی بی رہ رہی ہیں۔“

”عصمت کو کچھ سنگار تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس سے یہ کھڑا اس پر میک اپ

ہر تو قسم سے شری مان کے چلتے چھوٹ جائیں۔“

”امد کپڑے بھی بھر دکھ دار ہوں۔“

”مختصر اہست تیل بھیل۔“

”ہاتھوں میں چٹیاں۔“

”کانٹن میں آؤ رے۔ پھر دیکھتے ہیں بابو جی کہاں جاتے ہیں۔“

سولا جیسے اس وقت تو صوبہ کو جبر دکھایا، مگر سوچ میں پڑ گئیں۔ یہ دنیا

کا دستور ہے۔ بیٹی میں ایک سے ایک بھر دکھ دار عصمت گھومتی ہے۔ سولہ،

سادہ عورتوں پر نظری نہیں نکلتی۔ جیسا موقع دیا بھیجیں۔

مگر ان کے پاس تو سادی سولہ کتنی کی ساتیاں تھیں۔ دو چار بد رنگ کی کٹاؤ کی

ہوں گی۔ گلے میں تادی زنجیر تو پڑی ہی رہتی ہے۔ اگرچہ اسے زیور کتنا زیادتی ہے،

ماں کی یادگار ہے۔

دلت کے متاثرے میں ان کے دماغ میں رنگ برنگے کپڑے اور زیور تھرکتے رہے۔

”شاید بیاہتا ہے۔“ دوسرے دن شبنو نے ٹکڑے منہ ہو کر کہا۔

”نہیں بیلہ ہے تو نہیں۔“

”کیسے معلوم؟“

”بس میں کوئی دوست ملے تو پوچھ رہے تھے، مگر وہ ملا۔ وہ بولے، ہاں ملا۔

کہنے لگے اب شادی کر ڈالو۔“

”پھر کیا بولے؟“ رام دلی قریب کھسک کر بولی۔

”ہنسنے لگے۔“

چلو اور صبر سے تو اطمینان ہوا۔ ذات کے تو ٹھیک ہیں؟“

”ہاں، بیگ پر رام سروپ بھٹناگر لکھا ہے۔ وہ تو پہلے ہی دن دیکھ لیا تھا۔“

”بس پھر کیا بات رہ گئی ہے جو مثال مثال کر رہی ہو؟“

”منہ سے جو نہیں بولتے۔“

”کچھ میٹھی نظروں سے کہتے ہوں گے؟“

”نہیں۔“ جو کہتے بھی ہوں گے تو سر لاہیں گے کاہے کو پتہ پڑے گا۔

”رام دلی ہوتی، ایٹھ تھ ہوتی، شنبہری ہوتی تو فٹ کچھ جاتی دودھ میں بالو جی مٹھی میں ہوتے۔“

”ٹھنڈی سانس بھری؟“

”نہیں؟“

”توبہ! مردہ اکوئی سی مٹی کا بنا ہے۔“ سعادت کی بیوی بگڑ گئیں بڑی کاٹیں

کاٹیں کے بعد ملے ہوا کہ سر لاہیں، دودھ اندیشی پر تیار ہوں۔ تیر تفنگ سے قیس ہو کر

منہ میں ڈال دے۔ تب ہی نیا پار لگے گی۔

”بس اسی کلمہ عمدتیں اپنے اپنے ترکشوں سے سامان نکال نکال کر سر لا دیوی

کی لگ کر پہنچے لگیں۔ شبانہ کبھی فلموں میں ایکسٹرا کا کام بھی لیتی تھی۔ وہ وہاں سے نہ جانے کیا ایٹم سٹرم لایا کرتی تھی۔ ہنر نہیں اسنو تو سعادت کی بہو کے پاس بھی سال بھر پانی پڑی تھی۔ ایڈتھ کے پاس تو تمام اسمگل کیا ہوا اکسیٹک تھا۔ وہ ایک ہیڈ ریسر کو بھی جانتی تھی اور خود بھی فٹ کھاس عباد سے نما اور بچے تو نبی جیسے بل بنا لیتی تھی۔ اس کے پاس ایسے ایسے چھوٹے بڑے کپڑے تھے جو اگر کچھ بھی کو پہنا دو تو رب کا فرما جائے۔

بس سب کی سب مرمت پر جٹ گئیں۔ سرلاہیں نے بہت تازہ چکی مگر شہو نے اپنی پیاز میٹھان جارجٹ کی ساتھی، جس پر سیکورس کا کام نہ تھا انہیں پہنائی۔ بلاؤ پر بہت جھگڑا پڑا۔ شہو کستی تھی تازہ ترین فیشن کے مطابق سرخ بلاؤ زاور سرخ پٹی کوٹ ہونا چاہیے، نیچے سے چمکا مارے گا اور لال ہی سینڈل ہوں تب آئے مزہ، سرلاہیں ٹکڑی کر نہ فیشن کا پتہ نہ میپنگ کے لازم معلوم ان کے ہاتھوں میں کھیل رہی ہیں۔

منہ پر پیلے کر بھی لیتی گئیں۔ مع سعادت کی بہو کی ہنر نہیں اسنو کے بہو کو چکی تھی، کیونکہ وہ برا مانے جا رہی تھی۔ پھر زور اور پاؤڈر کے پستر چڑھے خوب سا سیاہ سونے لے کر توہی کی شکل کا جڑا بنا۔ پھر زیور کی باری آئی، اس پر خانہ جنگی ہوتے ہوتے بچی، ہر شخص یہی چاہتا تھا کہ اس کا چند زیادہ سے زیادہ ہو۔

جب اونچی ایڑی کے کار چولی سینڈل پہن کر سرلاہیں بس اسٹاپ پر لہراتی تو لگاتی پہنچیں تو ان کی بغیر میپنگ کی آنکھوں میں ترسے ناز رہے تھے پینے کے شراب سے چھوٹ رہے تھے۔

”کی عورت ہونا کافی نہیں، ایک نرالے میں اتنا اچا رہتی، مرتے کیوں لازمی ہے“
ان کی آنکھوں میں آنسو کھٹکنے لگے۔

اور پھر اس نرالے کو بچانے کے لیے ساری عمر کی گھس گھس۔

جب تھوڑی ہی دیر بعد لوگوں نے سرلابین کو شتم پشتم واپس لوٹتے دیکھا
تو سب کے ہاتھوں کے طوطے اٹھ گئے۔ وہ بغیر دردِ لہا کے ڈنگاتی لڑتی علی آبادی
تھیں۔ گالوں پر کاجل کی لکیریں بہاتی وہ گٹر میں گرتے گرتے بچیں۔

نرالہ خنوک دیا گیا!

یہ کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟ سرلابین سوالوں کی بوجھاڑ سے بے دم ہو کر پٹنگ
پر گر پڑیں۔

وہ جب بس میں داخل ہوئیں تو وہ ان سے قطعی غافل اخبار پڑھتا رہا۔ وہ
رکاب پکڑے سیٹ کے پاس کھڑی جھولتی رہیں۔ اور وہ بس کے دروازے کی
طرف بار بار دیکھتا رہا، جیسے کسی کے چڑھنے کا منتظر ہو۔

انہوں نے نظروں کے سارے تیر اس کے گلیے میں جھونک دیئے مگر وہ ان
کی طرف سے منہ موڑے دردانہ سے گزرتا رہا۔

انہوں نے کانتا کی ٹھک میں بسا ہوا گلابی آنچل ڈھونڈ لیا۔ مگر اس نے اخبار سے
نظریں نہ اٹھائیں۔

انہوں نے ایک بھر پور آنکھ لائی لی۔ مگر اس کی آنکھوں میں مستیاں نہ لہرائیں بس
نے ایک پتھرائی ہوئی کسی نظر ان پر ڈالی اور ان کے دھوم دھڑکے کو بے اعتنائی سے
ٹھکرا کر ہوا اخبار پر جھک گیا۔

سامنے کی ایک سیٹ خالی ہو گئی اور وہ اس پر ٹوٹے گئیں۔ سارے تیر
سنستے ہوئے وار خالی دے گئے اور خالی ترکش لڑتا رہا، کا پتار ہا۔

ڈرتے ڈرتے انھوں نے اپنی سیٹ سے مڑ کر دیکھا، وہ بس سے اڑ کر
جا رہا تھا۔ اترتے وقت اس نے بس اسٹینڈ پر دھندا چلا تے ہوئے سٹوگر ہکٹ
سے پوچھا۔ ”کیوں رے پاجی آج سر لائیوی نہیں آئیں؟“

سٹوگر ہکٹ ہکا تارہ گیا، اور اجنبی لمبے لمبے ٹنگ بھرتا سامنے کھلی میں گم ہو گیا۔

(”فنی“ لاہور)

پورا جوان

آنکھوں میں کامل کی گھٹا، لب، لعل، بدخشاں، گال، ٹھانستان، سرتا پا موسم بید
کی آمد آمد۔ یہ تھی مہندی، وہ کبھی بچپن کو والد و ادراع کہتی دکھائی دیتی اور کبھی اسی بچپن
کے گلے لگاتی نظر آتی کبھی دادی، شباب میں محو خرام، اور کبھی طوفانی شباب سے بد کہتی
ہوئی سی لگتی۔ غرض یہ کہ وہ بچپن اور جوانی کی حدِ فاصل پر کسی بھی ہونٹ ہرنی کی طرح
وحشت زدہ سی رہتی تھی۔

سوہنے کو مہندی سے عشق تھا، مہندی کو سوہنے سے محبت تھی، لیکن
سوہنا اپنی من موہنی کو نہیں پاسکتا تھا، اور مہندی اپنے من موہی کو حاصل نہیں کر
سکتی تھی۔

ان کے راستے کی چٹان کا بلا سنگھ تھا۔

ایک صبح سوہنے نے اپنے چچا کا گھوڑا مانگا اور منزلیں بدلتا ہوا اٹھارہ کوس
کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اب وہ سائی والا نام کے گاؤں کے باہر کا بلا سنگھ کے
کچی اینٹوں کے بنے مکان کے سامنے کھڑا تھا۔ سوہنے کا اصل نام بدکار سنگھ تھا۔
لیکن وہ اتنا حسین تھا کہ لوگ اسے سوہنا (خوبصورت) کہنے لگے، اس کے عرس نے
جلائے کی حسین ترین لڑکی کا دل مرہ لیا تھا، لیکن اس کے باوجود کس قدر مجبور اور

بے دست دیا تھا۔

اس کا گھوٹا بے دم سا ہو کر نکتے پھڑپھڑا رہا تھا۔ پیسنے کی وجہ سے اس کی جلد گیلی نعل کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ خود سوار کے چہرے پر پیسنے کے موتیوں کی بارش ہو چکی تھی، اس کا سرخ سپید چہرہ، براہمن باقاعدہ دایمیں اور مونچھوں سے برہمی تھا، تمٹایا ہوا تھا، اس کی تیز آنکھیں گھرم پھر کر کا بلا سنگھ کو تلاش کر رہی تھیں۔ اس نے پہلے کہہ اس آدمی کو نہیں دیکھا تھا۔ آٹا پتہ پوچھتا وہ مکان تک پہنچ گیا مکان کے باہر کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ سوہنا کو معلوم تھا کہ کا بلا سنگھ کے تین بچے موجود تھے۔ لیکن اس نے بچوں سے ان کے باپ کے بابے میں پوچھ گچھ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

کا بلا سنگھ کے پڑوس میں ایک سا، نہجہرہ تھا۔ ساہنسی وہ لوگ ہوتے تھے جو کتوں کو ساتھ لے کر جنگلی قبوں کا شکار کیسیتے تھے۔ بھٹک یہ ہے کہ وہ قبوں کو کھا بھی جاتے تھے! اس وقت ادھیر دھیر کا ساہنسی اپنے سمی کی چھوٹی سی دیوار پر بیٹھا حقہ گڑا گڑا رہتا۔ اس کے لیے بسے پٹاس کی گڈی تک پہنچتے تھے اور ان میں تین چوتھائی چاند کی شکل کا گنگا پینسا ہوا تھا۔ سوہنے نے اس کے قریب پہنچ کر ابد سے پڑوس والے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کی کا بلا سنگھ اس مکان میں رہتا ہے؟“

ساہنسی نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھ کر اس کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے

جواب دیا ”آجرو“

”وہ گھریں ہے کیا؟“

”نہیں، صرف اس کے بچے ہیں۔ وہ بھی اب آتا ہی ہوگا۔“

ساہنسی کی بات ابھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ دور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کا شور سنائی دیا، ساہنسی نے خفے کی نئے سے اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”لو! وہ آگئی۔“

قریب آکر گھوڑا ایک پھیر میں لینے لگا۔ دھول کے بادل بھلا کر اس کی ٹاپوں کے نیچے سے محلِ ادرآء صراٹھنے لگے۔ اسی کیفیت میں سوار نیچے ترپڑا۔ سہنے نے اسے بغور دیکھا، اس کی عمر پالیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ سینہ بھلا کی طرح پھیلا ہوا تھا مگر کاٹھ اب بھی مناسب حد سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ ٹانگیں لمبی اور مشدول تھیں۔ چہرے کا رنگ ایسا تھا۔ جیسے کسی حق و دق صحرایں سورج ڈوبنے کے بعد تاریکی پر پھیلا رہی ہو۔ صرف آنکھیں غیر معمولی طور پر چمکیلی تھیں۔ مجموعی اعتبار سے وہ ناگِ راج کی طرح حسین اور پرکشش تھا۔

کابلہ سنگھ گھوڑے کی لگام تھامے اپنے احاطے میں داخل ہو گیا۔ ساہنسی نے دور سے پکار کر کہا: ”کابلہ سنگھ! تم سے یہ لڑکا ملنے کے لیے آیا ہے۔“

کابلہ سنگھ نے اس کی بات بظاہر سننی اُن سنی کر دی۔ اس نے احاطے کے کونے میں کھیرل کے نیچے دائے بانس سے بندھی ہوئی رسی کا پسندا گھوڑے کی گردن میں ٹال دیا۔ اس وقت تک گھوڑے پر سوار سو ہوتا اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔

کابلہ سنگھ نے کمر سے چٹا کھول کر اس سداپنے جوتے جھڈتے ہوئے پوچھ دیا: ”کیسیا بات ہے؟ کیسے آئے ہو؟“

”میں آیا تو تھا اتنا داکھوڑا آٹھنے کے لیے۔۔۔“

کابلہ سنگھ نے اس کی طرف پیٹھ پھیر دی۔ اور کچھ رک کر بولا "تو؟"
 سوہنا گھڑے سے اتر پڑا اور تیز لمبے میں کہنے لگا۔ "لیکن مجھے چار پانچ سال
 تک انتظار کرنا پڑے گا۔ اس وقت تمہارا کھوپڑا توڑنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔"
 "چار پانچ سال کے بعد کیا ہوگا۔؟" یہ کہتے ہوئے بھی کابلہ سنگھ نے اس کی
 طرف ایک نظر ڈالنے کی ضرورت تک محسوس نہیں کی۔

اس کی اس بے اعتنائی سے سوہنے کا چہرہ اور بھی تڑپا اٹھا اس نے کہا۔ "اس
 وقت تک میں پورا جہاں ہو جاؤں گا۔"
 "یعنی بالغ ہو جاؤ گے۔"

سوہنا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا چاہتا تھا اس لیے وہ گھوڑے
 سے اتر کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ "میں نے سنا ہے کہ کسی زمانے میں تم نے علاقے
 بھر میں تنکے بچا رکھا تھا اب بھی تہا دی دھاک ہے۔ لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ تم
 اپنی دھاک کا اس قدر ناجائز فائدہ اٹھانے سے باز نہیں آتے۔"

کابلہ سنگھ نے اس کے گھوڑے کی کانٹھی پر گٹھن ٹیک دی۔ اور اس کی طرف
 سوالیہ نظر سے دیکھنے لگا۔ سوہنا اس کی اس کیفیت کو سمجھ گیا، اور اگلی بات کہنے کے
 لیے مناسب الفاظ کی تلاش کرنے لگا۔

گھوڑے کی پیٹھ کے اوپر سے پرلی طرف کو تھوکتے ہوئے کابلہ سنگھ نے کہا۔
 "چار پانچ سال کے بعد جب تم پورے جہاں ہو جاؤ گے تو مجھے امید ہے کہ اس
 وقت تہا دی عقل اس قدر کچی نہیں رہے گی۔"

سوہنے نے اس کی اس چوٹ کو توجہ کے قابل نہیں سمجھا۔ اسے تو صرف اپنی بات

کا بلا سنگھ یہاں آپہنچا۔ وہ شادی کی بات چلی کرنے آیا تھا۔
 ”تو بات چلی ہو گئی؟“

”ہاں۔“ چمک کر بولی۔

سوہنا سوچنے لگا کہ عورتیں بھی کس قدر طوطا چشم ہوتی ہیں۔ کیسی دیر سے بات چلی ہو جانے کا اعتراف کر رہی ہے۔

وہ گھوڑے سے اتر چکا تھا۔ اس کا دل بھاری ہو رہا تھا اور وہ لگام ہاتھ میں لیے دھیرے دھیرے چپا کے مکان کی جانب بڑھ رہا تھا۔

ہندی نے بیان جاری رکھا۔ ”میں گھر آگئی۔ تم گاؤں میں نہیں تھے اور وہ بات چلی کرنے آپہنچا تھا۔ پھر بھی میں نے منت سے کام لے کر الگ سے کا بلا سنگھ کو سب کچھ بتا دیا۔ میں نے تمہارے بارے میں بھی سمجھا دیا۔ اسے اس بات کا احساس کہ ادیا کو ہم دونوں ایک دوسرے سے کتنی... کہ ہم ایک دوسرے کو کتنا چاہتے ہیں۔ میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دئے کہ تمہیں تو اور بھی لڑکیاں مل جائیں گی لیکن ہندی کو سوہنا اور سوہنے کو ہندی نہ مل سکے گی۔۔۔۔“
 سوہنے کے قدم رک گئے۔ ”پھر؟“

ہندی بچکانہ چائو سے بولی ”سوہنے! وہ جتنا باہر سے تدا اور ہے اتنا ہی قد آمد بھیت سے بھی نکلا۔ میری باتیں سن کر وہ کچھ دیر سوچ رہا، پھر بولا کہ اے سب باتوں کا کچھ بھی پتہ نہیں تھا۔ وہ سیدھا اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا۔ میرا چاچا (باپ) اس کے پیچھے گیا۔ گھوڑے کی ایک دکان میں پائڈ جھاگ اس نے چاچا کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”سرواجی! میں نے ہندی اور سوہنے کی شادی چلی

کر دی ہے۔ اب آپ بیاہ کا انتظام کر ڈالیں تو بہتر رہے گا۔“
 سو ہنادم بخورہ گیا۔ مندی ہی جناس کی یہ کیفیت دیکھ کر پوچھا۔ ”جب تم اس
 سے ملے تھے، تو اس نے کچھ نہ کچھ تو بتایا ہو گا؟“
 سو ہنادم کی طرف دیکھ کر ہنسا۔ اندھیرا چڑھ چکا تھا۔ آکاش پر آدھارا
 دکنائی دینے لگا تھا۔ ”بوجھل آواز میں بولا۔ ”نہیں۔ میں نے اسے کچھ کہنے کا
 موقع ہی نہیں دیا۔“

جب سے کہ بلا سنگھ کی عورت مری تھی اس کے گھر کا کھانا ایک مری تیار کرتی تھی۔
 بلا سنگھ کی عادت تھی کہ صبح داتنی منہ میں ڈال کر کھانا ڈسے سے ایندھن کے لیے دو چیل
 لکڑیاں پھاڑ ڈالتا تھا آج صبح بھی وہ دانتوں میں داتنی دبائے اور ہاتھ میں کھانا ڈالنے کے
 اعلیٰ میں پڑے ہوئے موٹے موٹے لٹھروں کی طرف بڑھا۔ اسے گھوڑے کے ہنسنے
 کی آواز سنائی دی۔ یہ اس کے اپنے گھر کے آواز نہیں تھی۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے
 سوہن گھوڑے سے اتر رہا تھا۔

کا بیٹے نے اس کی طرف سبب عادت ترجیح نہیں دی۔ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر
 ہتھوڑے کر اس نے کھانا ڈالا اور پھر کھانا ڈالنے میں بیوی سے ہو گیا۔ اس نے
 دستے کو بلا جلا کر بھاری آواز میں کہا ”سوہن نے معلوم ہوتا ہے کہ تم ایک دلات ہی میں پرے
 جمان ہو گئے ہو۔ مجھے چار پانچ سال تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔“
 چند لمحوں تک سکوت طاری رہا۔

ایک دم سوہن نے کانٹھیں ڈبڈبائیں اور وہ بھڑائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”اے کابو گھوڑا!
 میں ایک رات ہی میں پورا جمان ہو گیا ہوں۔“
 ”شع“ مری

مستعدگی کی کہانی

LIE DOWN, LIE DOWN YOUNG YEOMAN,
THE SUN GOES DOWN TO THE WEST.
THE ROAD ONE TREADS TO LABOUR
WILL BRING ONE HOME TO REST
AND THAT WILL BE THE BEST

A. E. HOUSMAN.

یہ خزان کی ایک پکی اداس شام تھی۔ ہم تین دوست — احسان، شاد الحق اور میں مقامی میونسپل پارک میں ایک پنج پر بیٹھے زرد چترن کو ہرامیں کھڑکھڑاتے اعداد پڑھتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ وہ باغ کے قطعے میں سونے کے ٹکٹوں کی طرح ہر سو بکھرے پڑے تھے۔ سورج ڈھب رہا تھا اور اس کی آخری اگلی ہوئی گزریں لمبے درختوں میں سے چھپتی ہوئی ہمارے پنج پر اپنی مورتی ہوئی دیک پھینک رہی تھیں۔

شام کی اداسی ہمیں چھو نے لگی۔ احسان اور میں ہم عمر اور ہم جماعت تھے۔ مقامی کالج میں سیکنڈ ایر کے طالب علم، شاد الحق ہم سے دو تین سال بڑا تھا اور وہی۔ اُسے فائنل میں پڑھ رہا تھا۔ ایک سینئر ہونے کی حیثیت میں ہم اسے قدر اور عزت سے

دیکھتے۔ وہ ایک چھری لہرا، دراز قامت، خوبصورت نوجوان تھا۔ صحیح معنوں میں جوانی دینا، تنگ سرخی کی لہک پیے، آنکھیں فضیلی اور بڑی، ستواں ناک، تعلیم نیچے دکھائی دینے والی وضع میں کانوں کی ٹونک آتی ہوئی۔ ہم کالج میں آکر پتلون کوٹ پہننے لگے تھے مگر شاد الحق ہمیشہ اپنی اچکن، اور نیچے خصلے کی پگڑی اعداد اپنے گاؤں کے موی کی سلی ہوئی طے کی جوتی میں چلتا نظر آتا۔ وہ سچ سچ کرا ایک شاہزادے کے وقار سے چلتا اور فی الواقعہ کمائیوں کا شہزادہ لگتا۔ ان ایلے جوانوں میں سے ایک جن کے لیے لڑکیاں آہیں بھرتی ہیں اور غم محبت میں جلتی ہیں۔ شاد الحق ایک مضبوط کردار کا نوجوان تھا۔ ان اسے اپنے آپ سے کچھ محبت تھی۔ اور اٹھتے ہوئے شباب کے کس لڑکے کو نہیں ہوتی؟ اس کی باتوں میں واقعی پھولوں کی سی باس تھی اور ایک سوہنے والا سجھاؤ اور زندگی کا سوز و ساز۔ اور جب وہ موج میں ہوتا تو اپنے ہوسٹل کے بستر پر بیٹا پیروں ایسی باتیں کرتا رہتا جو سننے والے کے دل کو سحر اور بے چینی کر دیتیں۔ وہ ہر طبقے اور ہر عمر کے شخص سے آسانی سے گھل مل جاتا اور اسے اپنا دوست بنا لیتا۔ احسان اور میں ابھی معصوم لڑکے تھے شاد الحق نے انے کا سر دگر چشیدہ تھا اور وہ ہمیں اپنے انسانی نفسیات کے وسیع علم سے ششدر کر دیتا۔

اس شام وہ بالکل خاموش تھا اور ہوسٹل سے یہاں تک چلتے ہوئے اس نے ایک بھی بات نہ کی تھی۔ اس خاموشی پر ہم نے کوئی توجہ نہ دی۔ اس کی بستر پر گھٹو کے قوت سے ہوسٹل کے کمرے میں اس کے بستر پر سے چھوٹتے تھے اور باہر چلتے ہوئے وہ اکثر چپ ہو جاتا اور کسی گھر سے خیال میں کھو جاتا۔ پھر اس کی زبان کی بجائے اس

کی بڑی بڑی آنکھیں کام کرتیں اور وہ ایک پیدائشی جاسوس کی طرح زندگی کی ہنگامگی کو چپکے سے دیکھتا رہتا۔

احسان ان دنوں اس منزل میں مقابب کسی کی محبت میں گرفتار ہوئے کہ جیسے جی بے قرار ہونے لگتا ہے۔ دراصل اس عمر میں ہماری انگلیں سچی اور جھوٹکی نہیں ہوتیں اور ہمارے جذبات خود اپنی ہی خات میں مرگئے ہوتے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو بے دخل سمجھتے ہوئے ایک اپنی خود رچی بے خدا کی دھرتی پر پھرتے ہیں۔ احسان نے کالج کی لائبریری میں اسکر وائلڈ کی کہانیوں کی ایک کتاب لے کر پڑھی تھی اور یہ سلا دینے والی میٹھی جذباتی کہانیاں اس کے دماغ میں تیز شراب کی طرح چٹھ گئی تھیں۔ وہ اسکر وائلڈ سب انگریز لکھنے والوں میں میرا محبوب ہے۔ اور! اس کی ”ڈی پرفیکشن“ اور — وہ ”گلاب اور پبل کی کہانی“ احسان بولا۔

”وائلڈ تجھے ان دنوں بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ جھوٹے جذبات اور ذہنی خلع جلالت کی ظرافت جو جلد باہمی ہو جاتی تھی۔ وہ میری پسند کا مصنف نہ تھا اور میں احسان سے اس معاملے پر جھگڑنے لگا۔ احسان نے کہا کہ تم محبت کے جذبات سے کبھی آشنا نہیں ہوئے اور اس لیے اسکر وائلڈ کی خوبصورتی کو محسوس نہیں کر سکتے۔ اس پر ہم میں چٹخ ہو گئی اور ہمد سے مزاج برہم ہو گئے۔

شمار الحق اس دوران میں اپنے پاسرار طریق پر سکونا مارا۔ میں جانتا تھا کہ اس کا دماغ اسکر وائلڈ اور ہمد ہی بحث سے ہزار میل دور ہے اور وہ کچھ اور سوچ رہا ہے۔ اس نے وائلڈ کو نہیں پڑھا تھا۔ اور اگر دماغ ڈکھڑا پڑتا ہے تو بھی اس سے کچھ حاصل نہ کرتا۔ وہ کتابوں کے زیادہ پڑھنے پر یقین نہ رکھتا تھا۔ اگرچہ ٹیکور کی گیتا بھی

کے انگریزی ترجمے کو اس نے جیسویں بار پڑھا تھا اور اس کے کئی بند اسے
ازیر تھے۔

جب احسان اور میں خوب لڑ چکے تو ہم برہمی کے انداز میں ایک دوسرے
کو بری قوت سمجھتے ہوئے خاموش ہو گئے۔ ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے
خلاف شدید نفرت تھی اور آنسو تقریباً ہماری آنکھوں میں رکے ہوئے تھے۔ شام
اب گہری موند نے لگی تھی اور نیلا جھٹ پٹا درختوں کی چھتری ویران ٹہنیوں میں پھیلنے
لگا تھا ایک چھپاکی باغ کے کونے میں سے بولنے لگی ”تو دب۔ تو دب۔“

شمار الحق نے کہا ”کیا تم ایک سچ بچہ کی کہانی سنو گے؟“

”ہاں! ہاں!“ میں نے کہا۔ ”سنناؤ“

احسان کا چہرہ بھی چمک اٹھا ”شمار الحق ضرور سنناؤ کہانی۔“

شمار الحق نے اپنی بڑی آنکھوں سے دُور درختوں کے دھندلوں میں دیکھتے
ہوئے کہا ”اچھا سنو یہ کسی کتاب کی کہانی نہیں۔ یہ وہ کہانی نہیں جسے
تمکو ملے گی کسی اور نے گھڑا یا لکھا ہو۔ یہ ایک عام انسان کی کہانی ہے جسے قدرت
نے خود اپنے قلم سے اُترتی ہواؤں میں لکھا۔ اس میں ایک سادگی اور سہجیگری ہے
اور یہ ہر ایک کی کہانی ہو سکتی ہے۔ تمہاری یا میری۔ تم کو گے کہ ہمارے مزاج
اور طبیعتیں اور شمارے مختلف ہیں مگر حقیقتاً ایک ہی نوع کے حادثات ہم سب
کو پیش آتے ہیں اور وہ ایک ہی سڑک ہے جس پر ہم اپنی منزل کی جانب سفر
کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔“

شمار الحق کچھ رکا۔ ”مگر یہ استغراق میں احسان اور میں ہر تہی گوش ہو گئے۔“

باغ میں اب مکمل سناٹا تھا۔ گاسے گاسے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز آتی
جھینگرا درات کے دفین کیڑے اپنی مدھم مستقل الاپ سے سناتے کو سمور
کیے ہوئے تھے۔

”غالباً ۱۹۲۵ء کی بات ہے“ شہناز الحق بولا۔ ”میری عمر اس وقت کوئی
ساتھ سے پانچ برس کی ہوگی۔ میرے والدہاں دنوں شجاع آباد میں نائب تحصیلدار
تھے۔ وہ ہر سال ایک ماہ کی رخصت ضرور لیتے امداسے اپنے آبائی گاؤں کھوہار
میں گزارتے۔ زمینوں کی دیکھ بھال کرتے اور ایک دہقانی سفید پوش کی طرح۔
سر پر صاف پیٹھے اداٹھے کی چادر باندھے گاؤں کی گلیوں میں چلتا اور اپنے
چہرے کی جھٹک میں دیہاتیوں کے سٹکے ماسکی سمجھاتے۔ شجاع آباد میں تو
بالکل رعب و لب دلوے سرکاری افسر ہوتے۔ ہمیشہ جامہ زیب و چست امد
کوڑے کی طرح کر دکھار۔ یہاں گاؤں میں اگر اپنے قرابت داروں امد عزیزوں کے
ساتھ بالکل بدل جاتے۔ ان کا ہی جیسا سادہ لباس پہنتے اور ویسی ہی پہن کر
دیہاتی زندگی گزارتے۔ نائب تحصیلدار کی فرائض ادا ٹیپ ٹاپ شجاع آباد
میں ہی رہ جاتی۔ میرے دادا تب بقیہ حیات تھے۔ ان کو ہمارے آنے کی اطلاع
ہوتی امد جڑا کر یا نہ کے چھوٹے باپ لائیں دیر سے اٹیش پر ساری کے لیے
گھوڑیاں پہنچ جاتیں مجھے یاد ہے کہ گھوڑیاں سواریوں سے کہیں زیادہ ہوتیں۔
تب سائیکل ابھی دیہات میں نامعلوم تھا۔ ایک عجوبہ۔ کوئی کام کی سڑکیں بھی نہ
تھیں۔ ہر ایک گھر میں ایک دو گھوڑیاں ضرور ہوتی تھیں اور بیشتر لوگ ان پر ہی
اپنے کاموں پر آتے جاتے۔ ریل پلیٹ فارم پر کھڑی ہوتی تو مراسی امد کی ڈبے

کے پاس دوڑے آتے۔ ہم بچوں اور سامان کو آتہ تھے۔ گھوڑیاں ہنستا ہی ہوئی مسافر خانے کے باہر بندھی ہوئیں اور سامان کے لیے ایک دو خچر چنے بڑے گدھے ہوتے۔ میرے داماد کی ایک گھوڑی تھی۔ برف کی طرح سفید۔ اسیرانہ خوبصورت والی۔ مٹی نخرلی اور آتشیں مزاج۔ وہ اسی کی لاطولی تھی۔ اس کا نام سادی تھا۔ میرے والد اس پر بیٹھتے۔ آدھ گھنٹہ کیوں میں بحث ہوتی کہ کوئی گھوڑی امیل ہے اور کوئی کچری۔ اور جب ہم سب امیل گھوڑیوں پر کسی ہوئی دلیسی کاٹھیوں میں بیٹھا دیئے جاتے تو گاؤں کی سمت ایسے آدھ آہستہ سفر کا آغاز ہوتا۔ سوائے سادی کے ہر ایک گھوڑی کی باگ آگے آگے چلتے ہوئے کئی کے ہاتھ میں ہوتی۔ کھوہار جوڑے سے چار پانچ کوں ہے مگر اس سفر میں کوں ختم ہونے میں نہ آتے تھے۔ دوپہر کے چلے ہم کھوہار میں گہری پڑے پہنچتے۔ جب تنگ کاٹھیوں میں بیٹھے بیٹھے ہماری کمریوں اور کمرے گتیں اور کمرے چھلنی ہونے لگتے تو یہ چھوٹا کھانا سنتے اور ٹانگیں سیدھی کھنے کے لیے سڑک کے کنارے رک جاتا۔ اس کافی خرخاک سفر کی کچھ تلافیاں بھی تھیں۔ ڈوبیا فی سے کنگے گزرتے ہوئے ہمیں پی کی غلی پہاڑیاں نظر آئے گتیں اور ہمارے دل اچھلنے لگتے۔ ان کی طرف بڑھتے ہوئے ایک عجیب مسوت میرے دل کو گرفت میں لے لیتی۔ دوستو! تم کیا جانو مرے دیس کی پہاڑیاں کتنی خوبصورت ہیں۔ دنیا میں ایسی پہاڑیاں اور کہیں نہیں جیسی یہ پی کی پہاڑیاں۔ بعض دفعہ اس سفر میں حادثے بھی ہو جاتے کسی گدھے کی تنگ ڈھیل ہو جاتی اور اس پر دھرے ہوئے کس اور ٹوکے نیچے سڑک پر لٹک جاتے۔ تنگ کو کہنے اور اس پر پھرے سامان جتانے میں آدھ گھنٹہ لگ جاتا اور ایک بار تو وہ گھوڑی جس پر

میرا بھائی ادم میں دونوں سوار تھے، بڑی کچھری نکلی۔ میرا بھائی آگے لگام پکڑے بیٹھا تھا کہ خورشادوں سے ہم نے فوری سیرانی کو تیار کیا تھا کہ وہ لگام ہمیں پکڑا دے۔ میں اس کے پیچھے ہاتھ میں ایک چابی سے چلنے والے انجن کو پکڑے بیٹھا تھا۔ یکھنت گھوڑی بدی اور گنٹ بھاگ کھڑی ہوئی۔ میں تو دھکا لگنے سے نیچے زمین پر آ رہا۔ اسی طرح چابی والے انجن کو ہاتھ میں پکڑے۔ مجھے تھوڑی دیر کے بعد ہی پتہ چلا کہ میں گھوڑی سے گر گیا ہوں اور پھر میں دوسرے لگا جھلا کر مجھے ذرا بھر بھی چوٹ نہیں لگی تھی۔ میرے بھائی کو گھوڑی کو دانی پھلانگتی دو کہیوں میں لے گئی اور اسے ایک کنوئیں کی منڈیر پر جا گرایا۔ اس کی پیشانی پھٹ گئی اور اس میں سے خون بہنے لگا۔

مگر اتنی صعوبتوں کے بعد جب ہم کھوہار میں اپنے آبائی مکان میں پہنچے تو کیسی آؤ بھگت، ہماری فطرت ہوتی گھر کے سب دیے روشن ہوتے اور نچلے درختوں میں ہماری دادی، خالائیں اور پھر بھیاں چمکتے چہروں سے ہماری بلائیں لیتیں۔ ڈیڑھ سے گز رتھری دیوار کے پاس بادلوں کی آگ پر پتیل کی شکل میں دودھ جیسا کڑھتا رہتا تھا۔ ہماری دادی ہمارے پہنچتے ہی کہیں کڑھے میٹھے دودھ کے گلاس پلاتی۔ ہمارے باپ کی گروں میں ہاتھ ڈال کر وہ اس کی پیشانی کو چومتی اور خوشی اور نصیحت سے رونے لگ جاتی۔ وہ بوڑھی اور کبڑی تھی مگر اس کے خدوخل چمٹے اور تنکھے تھے ادم میں نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ وہ اپنی جوانی میں بڑی خوبصورت عورت تھی.....“

”ا“ ”تھا“ لہذا نے ایک ٹنڈا اسانس بھرا۔۔۔“ میں کھوہار میں کھپ گریں

میں گیا تھا اور وہ گھر نہ رہا جسے میں اپنے بچپن میں جانتا تھا۔ اب کے دیے میرے جانے پر نہیں چلے اور آباؤی حویلی تیار اور شکستہ حالت میں تھی۔ صرف ہمدردانہ میراثی نور علی وہاں طویلے میں اپنی کوٹھڑی میں رہتا ہے۔ سفیدہ اور بنگلے جیسے سفید بالوں کے ساتھ۔ اس کی ٹھکریں اور غول بھی اب وہ نہیں رہے۔ میں بعض دفعہ سوچنے لگتا ہوں کہ وہ سب اچھے مہربان چمکتے ہوئے محبت کرنے والے چہرے کہاں غائب ہو گئے۔ سب چلے گئے۔ وقت کے دھندلکے میں۔

شنا دا الحق اب خاموش ہو گیا، شاید گئی گزری چیزوں اور ہستیوں کو یادوں کے پردے پر دکھاتا ہوا۔ ایک بڑا نندو سا چاند درختوں کی اوٹ میں سے طلوع ہو رہا تھا اور اپنی تابیسیں و سکا ہٹ سے ٹہنیوں اور پتوں میں سفید پاشی کر رہا تھا۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا اور ندیا کے کنارے کے پتے ہماری طرف تیرتے ہوئے آئے، میرا دماغ غیر حاضر ہو جاتا ہے اور میں کہیں کہیں نکل جاتا ہوں۔ "شنا دا الحق بولا میں کیا کہہ رہا تھا؟"

احسان اور میں مسکرائے۔ یہ ہماری دوست شنا دا الحق کی پرانی عادت تھی۔ وہ ہمیشہ ایک واقعہ بیان کرنا شروع کرتا اور پھر بات سے بات نکل آتی اور وہ دُور بھٹک جاتا۔ یوں اصل واقعے کا سراغ دیا جاتا اور ہم اس کی ان طولانی "ڈائی گریشنز" (DIGRESSION) بھی کی وجہ سے اس سے محبت کرتے تھے۔ اگرچہ ہم بھی کسی بھی غیر حاضر دماغ اور نیم خوابیدہ سے ہو جاتے اور قطعاً بھول جاتے کہ وہ ہمیں اصل میں کونسا واقعہ بتانے چلا تھا۔

"بہت جلد میک ڈون" میں نے کہا "مات ابھی جواں ہے۔ ویسے تم

ہے۔ ان دنوں مجھے پورا یقین تھا کہ بچے آسمان سے گرتے ہیں۔ جب بھی میں اپنی ماں سے پوچھتا کہ میں کیسے پیدا ہوا تو وہ پراسرار طریقے پر مسکاتی اور کہتی: ”لالہ! میں تیس ہزار بار بتا چکی ہوں کہ تمہاری بوڑھی مائی مائی پھانسیاں تھیں اپنی گود میں لٹائے آسمان پر سے ہمارے گھر میں کو گرہی تھی۔“ ہمارے بعض بڑے مجھ سے اکثر سنجیدگی سے کہتے کہ مجھے میرے باپ نے مصلیوں سے پانچ دس روپے میں خریدا ہوا ہے۔“ ان بیانات میں تضاد مجھے حیران سا کر دیتا۔ پیدائش کا مسئلہ مجھ پر تب کھلا جب میں کافی بڑا ہوا تھا۔ تم یقین کرو نہ کرو۔

ہم چھپرے کے پاس شریچو کے کونٹے میں گئے۔ وہاں کالے رنگ کے تہبند اور کالے کرتوں میں گاؤں کی بہت سی عورتیں شریچو کے جاتک ہونے کی خبر سن کر آئی ہوئی تھیں۔ ایک ایسے پر تے کمرے میں جس میں سب دیہاتی کوٹھڑی کی طرح ایک طاق پر تانبے اور المونیم کے چمکے دھکتے برتن ایک دوسرے کے اوپر جمے تھے۔ شریچو ایک کھاٹ پر بیٹھی پھٹے ہوئے کپڑے میں لپیٹے اپنے بچے کو چھاتی سے دودھ پلا رہی تھی۔ شریچو ایک چوڑے ہڈ کاٹھ کی خرفاک عودت تھی۔ تو سب کی طرح کالی بھوت۔ موٹے اور بھدے سے خدو خال اور بال کھلے اور پریشان۔ وہ زیادہ غصوں کی عودت نہ تھی اور جب وہ بوہتی تو اس کی آواز کی کرخگی ایک کوڑے کی طرح لگتی اور اس کی ہسائیں کانوں پر ہاتھ دھرنے لگتیں۔ سب اسے اس کی کڑی کیلی زبان و دماغی سے ڈرتے ہوئے اسے اس کے حال پر ہنسنے دیتے اور اس طور اس سے بچتے جیسے وہ طاعون ہو۔ اس کے خاوند بھوٹا دھندلے نے اس کی بہ کلامی اور درشت مزاجی سے تنگ آکر لاہور میں چمکے

سے ایک اور شادی کر لی تھی اور ہر کوئی گستاخا کہ اس نے ٹھیک ہی کیا ہے۔ مگر ما
مرد ایسی عورت کے ساتھ زندگی بھر نہ کر سکتا ہے۔

شر بھونے کو ری پٹی آنکھوں سے ہمیں دیکھا اور بچے کو مدد دے پلانے
میں مشغول رہی۔

میری پھوپھی نے کہا ”شر بھو! بھابھ کی مبارک ہو۔ چچ جیسا ہے۔ بخدا اللہ۔
اس کے باپ کو اطلاع دے دینی تھی۔“

شر بھونے جل کٹ کر اپنے خاوند بھو اللہ داد کو ایک موٹی سی گالی دی۔
”داد سے ماڑھی لگیا۔ وہ اس بھونے حرامزادی لاہورن کے ساتھ جھک مار
رہا ہے اور اس کی جوتیاں اٹھاتا ہے۔ چچی ماڑھی اور ماڑھا خراب۔ اس بھونے کے
گھٹنے جھوڑ کر وہ کیوں آئے گا۔ یہاں آئے تو مسمیٰ وہ کبوتر۔ جی اس کے منہ پھوڑ
نہ ماروں تو شر بھو نام نہیں۔“

لیکن شر بھو۔ آخر وہ اس کا باپ ہے۔ اسے چچی تو کھوادو۔ ”میری پھوپھی
نے ننگیوں سے مصتی بھاگ بھری کر دیکھا۔

”چچی لکھو اے میری جتنی“ شر بھو بولی اد گالیوں اور پھکڑوں کی ایک
ندی اس کے موٹے مونٹوں سے نکل۔ دو تہی عورتیں تو بہتہ کرنے لگیں۔

پھر بھاگ بھری مصتی سے نہ رہا گیا۔ وہ گلنے لگی۔ اس نے بڑھاپا۔ ”ن سرفراز
بگیم اللہ داد پھیلے کتے میں آیا آہانا۔“

شر بھو کھلا کر اٹھی اد چپٹنے لگی۔ ”بھونے۔ تیرے داد سے ماڑھی لگیا۔ تیرے
ختم کو چد لے جائیں۔ میں تیرا مطلب سمجھتی ہوں۔ تو میرے بچے کو حرامی بتاتی ہے۔

تو حرامی تیری بے بے حرامی۔ تیری سات پیڑھیاں حرامی۔ وے اسمعیل۔ اس چڑیل کو بتا۔ تیرا باپ کتیس کے بعد پورہ میں رات کی رات مجھ سے معافی مانگنے آیا تھا یا نہیں اور جاتے ہوئے میں نے اس کی کیسی گت بنائی تھی۔ تو مجھے نہ پکڑتا اور بیچ میں نہ پڑتا تو میں اس کی ماراھی کا بال بال فوج لیتی اور وہ اس بھونڈا ہرول کے پاس کھودا کھسرا بن کر جاتا۔ وے اسمعیل تو نے اپنی بے بے کو اس دن پکڑ کر بڑا غلم کیا۔“

اسمعیل بھو اللہ داد کا بڑا کوئی سترہ سال کا ایک اکھڑ، ہونٹ ساڑ کا تھا۔ کچھ کچھ باؤ لا اور بالکل اپنی ماں پر گیا تھا۔

اسمعیل نے کہا ”چا چا پورہ میں آیا تھا اور بے بے کو میں نہ روکا تو وہ اُس کی من بچہ کہانی کر دیتی۔۔۔۔۔“

شریچو نے پھر معلّم اور سب عورتوں پر ایک نفرت بھری نہ ہر پٹی، جھنڈا دینے والی نگاہ ڈالی۔ اتنے میں کسی نے کہا کہ موہی ہو دیں آئے ہیں۔ بروہیوں والی مسجد کا امام میاں غوث محمد اندر آیا۔ وہ ایک امام مسجد کی بجائے ایک کڑیل و ہرقانی چھیرہ لگتا تھا اور اس وقت بھی ہاتھ میں ایک گڈڑیے کی لائٹھی لیے ہوئے تھا۔ میاں غوث محمد کی عملیت کی سادے گاؤں میں بڑی دھاک تھی۔ ابے بکلی روٹی کے سادے شعرا زہر تھے۔

غوث محمد نے لائٹھی کھٹکھٹاتے ہوئے اپنے کرخت و سیاہی لہجے میں عورتوں کو ہٹنے کے لیے کہا۔ ”کڑا یو۔ ایک طرف ہو جاؤ۔ شریچو۔ اللہ کی تم پر رحمت ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں“ اور اس نے پنجابی کے کچھ اشعار بچوں کی

برکت کے بارے میں پڑھے۔ ”ابھی اس کے کان میں کسی نے اذان تو نہیں دی؟“
شریح پوچھنے لگا۔ ”مولوی جی۔ آپ کے سوا اذان کو کون دیتا ہے۔“

”بھئیے“ مولوی عونت محمد ریٹکا ”حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے کان میں پہلی آواز کلمہ کی جانی چاہیئے۔۔۔۔۔“
مولوی عونت محمد نے نومو لو کے کان میں اذان دی اور اذان سے فارغ

ہونے پر شریح پوٹھی اور بھڑولی میں سے ایک رومال میں دو روپے مولوی کو گزرائے۔ اور مولوی عونت محمد کچھ مزید منے مسائل سمجھا کر اور دو تین طلبہ کے سروں پر ہاتھ پھیرنے کے بعد چلا گیا۔ اس کے بعد ہم بھی زیادہ دیر نہ ٹھہرے اور میری پھوپھی کے ایک دوپہر شریح پوٹھی کی ہتھیلی پر رکھنے کے بعد ہم گھر کو لوٹے۔ مجھے واپسی پر اپنی پھوپھی سے یہ پوچھنا یاد ہے کہ اگر بچہ آدمی رات کو آسمان سے گرا تھا تو وہ چھت میں سے کیسے شریح پوٹھی کی گرد میں اٹکی۔

”مثلاً دل۔ کیا الٹ پلٹ سوال تم پوچھتے رہتے ہو“ میری پھوپھی نے کہا۔
”جب تم بڑے ہو گے تو تمہیں خود بخود معلوم ہو جائے گا۔“ اور اس نے بھاگ بھری مصیقت کو کہنی ہدی، آنکھ میں شرارت لیے ہوئے۔

”میری چھوٹی پھوپھی ایک منٹ کچھ لائابانی طبیعت کی عورت تھی۔ زندگی کی رنگینی اور کھیل کود سے محروم۔“

خدا رالحق پھر کچھ دیر کے لیے گم سم ہو گیا اور کچھ توقف کے بعد بولا۔ شریح پوٹھی کے اس بچے کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ یہ بچہ یہ خبر بھی بھاگ بھری مصیقت نے آکر دی۔ یہ نام بچے کے نانا بڑے اور درشت کلام و مٹی اکبر نے تجویز کیا تھا جو ایک پیشو و دانشور

معلم تھا امداد کھو ہار کے دیہاتی ڈاک خانے میں ٹکٹوں کی فروخت اور ڈاک کی ترسیل کی ذمہ داری اسے سونپی گئی تھی۔ سب پرسٹ ماسٹر اس کے عہدے کے لیے کچھ زیادہ ہی اونچا نام ہے۔ اسے اس کام کے لیے ڈاک کے ٹکے سے صرف پندرہ روپے تنخواہ ملتی تھی۔ کچھ وہ گاؤں مالوں کی چھٹیاں لکھ کر کما لیتا۔ حزب کیرکٹر تھا۔ کرڈا امداد نہ ہر ملا، اپنی بیٹی شریچو کی مانند۔ اس کا ایک بیٹا جس کا نام عبداللہ تھا ادا اہل شباب میں فروت ہو گیا تھا اس لیے اس نے اپنے بیٹے کی یاد میں اپنے نواسے کا نام بھی عبداللہ رکھا۔

بھوٹا امداد بچے کی پیدائش کے کوئی تین چار دن بعد گاؤں آیا۔ غالباً اس کے خسر نے اسے پرسٹ کارڈ سے اطلاع دے دی ہوگی۔ اسے دیکھ کر اس شخص کو داد دینی پڑتی تھی جس نے پہلے پہل اسے بھوٹا کا لقب دیا تھا۔ یہ نام اس پر ٹوپی کی طرح فٹ بیٹھا تھا۔ میں نے اسے گاؤں میں کئی بار دیکھا ہے اور ایک بار اس کے ہاں کسی کام سے لاہور جانے کا اتفاق بھی ہوا۔ بھوٹا بھوٹا کی شکل۔ بوٹے خد و خال کا ماتمی چہرہ۔ مندی سے رنگی بوسیدہ واٹھی۔ سر پر کھڑکی دار میسے چکٹ کلاہ پر بند میسے چکڑی اور بدن پر ایک پرانی دھواڑھی اچکن پہنے جسے اس نے کئی برسوں میں تبدیل کیا تھا۔ اس کی ماری ذات گرم خردہ تھی۔ جب میں لاہور میں دل محمد روڈ پر اس کے بالکنی والے غلیظ مکان پر اس سے ملا تو اپنی دوسری بیوی سے اس کا ایک بچہ بوجھا تھا اور گھر میں اس کی حیثیت ایک بچے کو کھلانے والی دانی کی تھی۔ مجھے بیچارے بھوٹا پر رحم آیا اور اسے بچے کو ہاتھوں میں لے دیے ہر سٹے دیکھ کر ہنسی بھی۔ آسمان سے گل کھجور میں اٹکا۔۔۔۔۔

”میں تمہارے کان کیسے نہ لگا ہوں شتا والحق“ میں نے کہا۔

”شتا والحق ہنسا۔۔۔“ ہاں بجز اللہ کے گاؤں میں آنے اور شر پھیر کے استقبال کا منظر ایسا تھا جسے گاؤں والے برسوں میں نہیں بھولے۔ مصطفیٰ بھاگ بھری خود وہاں موجود تھی۔ بجز ایک بھوری مریلی گھوڑی پر سوار کچی سڑک پر ٹنچ ٹنچ آتا تھا گاؤں سے گھوڑے غامضے پر شر پھیرا سے ملی۔ وہ اپنے گدھے پر بیٹھی ہاتھ میں کلہاڑی اٹھائے بڑیوں میں سے کڑیاں کاٹنے جا رہی تھی۔ ذرا اس سےیں کا تصور کرو۔ بجز کا چہرہ اپنی خوفناک بیوی کو آتے دیکھ کر فح ہونگی اور اس نے باگ مردگر درختوں کی امٹ میں سے نکل جانے کی کوشش کی لیکن شر پھیر اس کے سر پر آپہنچی۔ کلہاڑی ہاتھ میں لیے۔ رد کے بال پھیلائے۔ گدھے پر سے پھیلا ننگ کر اتری اور سڑک کے بیچ گھوڑی کے رستے میں اپنی ٹانگیں پھیلا کر کھڑی ہو گئی۔ بجز کے لیے بچنا مشکل تھا۔ اس نے موت اپنے سامنے دیکھی۔ شر پھیر نے کلہاڑی کو بڑے وحشیانہ طریقے سے ہلایا اور موٹی گالیوں اور لعن طعن کی ایک نہ ختم ہونے والی برچھاڑ اس کے موٹے ہونٹوں سے چھوٹی۔ اس منظر کو دیکھنے والے اس عمدت کی زرخیز ماحفی پر حیران ہو گئے اور کانوں کو ہاتھ لگانے لگے۔ یہ عورت کوئی انسان کی بچی نہیں تھی یہ تو کوئی چڑیل تھی۔

”داد سے واڑھی لگیا۔ بجز آکھو دیا۔ خدا تیری بیڑیوں میں دٹے ڈالے۔“
 قہر نے مجھ پر سوکن ڈالی ہے؟ میرے گھر کی چو گھٹ کے اندر قدم تو دھر۔
 تیری بوٹی بوٹی نہ کر دوں تو میں رضی اکبر کی دھی سرفراز نہیں۔۔۔۔۔“
 بے چارے بجز نے کچھ دیر تو یہ صلواتیں سنیں۔ پھر اپنی جان کو خطرے میں

دیکھ کر اس نے گھڑی کا یڈ لگا کر بھاگ دیا اور شرچہ اپنے گدے پر سوار ہو کر اپنے
 ننگے پاؤں نیچے لٹکانے اپنے فلاح ہوتے ہوئے خاندان کے پیچھے گئی۔ گھایاں
 بعد جسے بھتی ادا اپنے چوٹے سروں کے سے سینے پر دم تڑا رتی ادا اپنے بال
 خچتی۔ اس طرح بچا اور اس کی بیوی گاؤں کی گلیوں میں سے گزرے۔ اور جس کسی نے
 بھی دیکھا بعد میں کہا کہ گھوڑا میں خاندان کی ایسی خاطر پہلے کسی جانی نے نہ کی تھی بچہ رات
 کو اپنے ایک شریک کے گھر رہا۔ میں نہیں جانتا کہ اس نے نو مرد کو دیکھا یا نہیں۔
 مگر وہ سب دن مزاحیہ اس نے گاؤں کو چھوڑ دیا۔ جب تک شرچہ جیتی رہی
 اس نے گاؤں میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کی۔

چاند اب مدختوں کی چڑھیوں کے اوپر اٹھ آیا تھا اور اس کی سفید نظریہ روشنی
 ہم پنج پر بیٹھے ہوئے دو تین دوستوں کو شادابی تھی۔

میں نے پوچھا ”کی شرچہ کا بچہ حرامی تھا؟“

”میں نہیں کہہ سکتا“ شاداب الحق نے کہا ”وہ حرامی تھا یا نہیں میری بھی

جینا اور بعض دوسری عقیدوں کو اس کے حرامی ہونے کا یقین تھا۔ (مگر بعد میں
 نے اس بات کی کافی کھوج کی) بچہ اللہ داد پر وہ میں رات کی رات آیا غزوہ تھا
 اپنی بیوی کے پاس گیا یا نہیں، کوئی نہیں جانتا۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے
 کہ وہ حرامی تھا یا نہیں۔ وہ خدا کی اس دنیا میں بعینہ اس طریقے سے آیا جس طریقے
 سے ہم صبا آئے ہیں۔ ایک عہد کے بطن سے۔ اور شادابی کیا ہے۔

مصطفیٰ لکال کہا کرتا تھا کہ ایک مگر گداؤں کے چند فقرے پڑھنے سے ایک عورت
 اور مرد کو اکٹھے ہونے کا لائسنس مل جاتا ہے اور اس اتحاد کو برکت اور پاکی مل

جاتی ہے۔ جب ان فخریوں کے بغیر ایک عورت مرد کے پاس جاتی ہے تو لوگ شور مچاتے ہیں کہ یہ بدکاری ہے۔ یہ گناہ کبیرہ ہے۔ اور دیکھو تو بات یکدم ہی ہے۔ کتنی ہی بچے بے محنت شادیوں کے ذریعے پیدا ہوتے ہیں مگر کوئی انہیں برا نہیں جانتا۔۔۔ میں نے کئی بالوں کو دوسری عورت کے ساتھ گھر بٹانے کے بعد اپنی پہلی بیوی کی اولاد سے قطعاً لا تعلق ہوتے دیکھا ہے۔۔۔۔۔

احسان احمد میں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ ثنا الرحمن اپنے خاص عہد کی عقیدوں کو ہوا سے رہا تھا احمد ہم جانتے تھے کہ اگر ہم نے اسے ٹوکا تو وہ بخلت کے خلاف اس کی تار ڈگھنے بھرنے جاری رہے گی۔

”تم کہانی سے بھٹک رہے ہو یک ڈنٹ“ میں نے کہا۔

”معاف کرنا۔۔۔ میں کہاں تھا؟“ اس نے پوچھا۔

”سرخچہ کے بچے کے حوائی ہونے یا نہ ہونے پر تم ہمیں فطرتی اخلاقیات کا دوس دینے لگے تھے“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ ہاں۔۔۔“ ثنا الرحمن نے یاد کیا ”اس طرح عورت سرخچہ کے

بیٹ سے عبادتِ شمس رات پیدا ہوا۔۔۔۔۔ ایک بھول کی مانند کھٹا ہوا۔

وہ اس چمکتے دنِ افسانہ صیری رات کی دنیا میں آیا۔۔۔۔۔

”..... سال گزرتے گئے۔ والد صاحب کی تبدیلی دہاڑی ہو گئی اور میں

چوتھی جماعت میں چڑھ گیا۔ ہر سال سنی یا جری میں ہم اپنے وطن اپنے مامے

دادی کے پاس آتے ساجی بھوپھیوں اور خالائوں سے ملتے۔ گاؤں کے بچوں

کے ساتھ دیہاتی کھیل کھیلتے۔ گھوڑیوں کی سواری کرتے۔ اپنے چمکے فدا دھن کے
 ماسے ماسوں جلال کے ساتھ پتی کے حاسن میں ڈھاکوں سے پٹے ہوئے میدان
 میں خرگوش کے شکار پر جاتے۔ میرا ماسوں جلال اب ختم ہو چکا ہے۔ اب
 کیا ہی عجیب آدمی وہ تھا۔ اس کی حریف کی ڈیڑھ سی میں ہمیشہ دوا دینے کا فن
 دال، پتل اور بانگی خاکسری رنگ کی کتیا میں بندھی رہتی تھیں۔ ان کی وہ وہ
 خاطر داری ہوتی تھی کہ الامان والہ فیض۔ تین چار مراٹھی اللہ کی خدمت کے لیے
 وقت تھے۔ کوئی انہیں تھلا رہا ہے اور گڑ رہا ہے۔ کوئی بیٹھا چھٹے سے
 ان کے کانوں کے اندر سے صبر و تحمل کا رہا ہے۔ ان کے لیے خاص بوٹوں سے
 مرکب طاقت کے کھانے پکھتے تھے اور دلی میں ایک بار یہ کتیا میں لگی اور شکر کی
 چوڑی کھاتی تھیں۔ میں نہیں جانتا کہ میرے ماسوں کے دوسرے شوق کیا تھے۔
 وہ سٹے مسائل بتانے میں کافی شہرت رکھتا تھا اور گاؤں والے اس سے سٹے
 پر پہنچنے آتے تھے۔ ”مولی جی۔ دھوکے بعد تبا کو پھینکے سے دھوڑتا ہے یا
 نہیں؟“ مولی جی۔ آج میں نے غصے میں اس نیک بخت شید کو تین دفعہ طلاق
 کہہ دی۔ ہمارا سماج ٹوٹا یا نہیں؟“ ہم جب بھی جاتے اسے کتیاؤں کی دیکھ بھال
 علاج معالجے میں مصروف پاتے۔ اپنی بیوی اور اپنے بچے گھاسڑ سے اگرتے
 لٹکے روتے وہ قطعاً نا تعلق تھا۔ میری چھوٹی چھوٹی زینب بی بی اس کے مگر
 تھی۔ وہ سارا دلی جیٹس سٹریٹ پر کھٹ کھٹ کرتی رہتی اور گاؤں کے لیے
 ایک ٹیلنگ شاپ کا مقصد پورا کرتی، وہ ایک ہنس کھ، لا ا بالی اور باتلا عورت
 تھی۔ خدا ماسوں جلال کو نانی یاد آ جاتی۔ ہم اس ماسوں کو ”کتیاں والا ماسوں“

میں ایک ملک سے محبت نہیں کرتا۔ سکاٹ لینڈ مالے اپنے قبیلے اور اپنی ہمدردی
سرخ ہوتی ہوئی پہاڑیوں کے گیت گاتے ہیں۔ دولتِ برطانیہ کے نہیں جس پر سے
سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ ایک صحرائی بڈ صرف اپنے صحرائی تین، کجوردن
اور خیموں سے محبت کرتا ہے۔ قوموں اور ملکوں کی باتیں کرتے ہوئے کہیں ہم
اپنے آپ کو دھرم کا تر نہیں دیتے؟

”یار کافی سناؤ جو تم نے شروع کی تھی“ احسان نے کہا۔ ”اگر خوار الخ تم
ایسے ہی بھگتے رہے تو یہ کبھی ختم نہ ہوگی۔ گیدر بھجے کے بعد پوسٹل کا پہلا ملک بند
ہو جائے گا اور پس دیواریں پتھاندنی پڑیں گی“

”اے میک ڈنٹ“ میں برا۔ ”جے تھو ایہ بھگت جانا اچھا لگتا ہے مگر
اب کافی دیر ہو چکی ہے اور جے کچھ سرحدی سی لگ رہی ہے۔“

”۱-۱“ ”ٹھیک لگنے سے ہو گا بھرا۔۔۔“ میں کہاں تھا؟

ہم نے اسے بتایا اور وہ پھر اپنی کافی کی طرف لڑا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ میری عزتِ نرسل کی ہوگی۔ میں چوتھی میں تھا اور ہم گانٹھ میں
آئے تھے تھے۔ ایک دن میری چھوٹی بھوپھی جن کے ہم بڑے دوست تھے جے
پھر بے صبرے ایک خادہ کے گھر لے گئی۔ جب ہم واپس آ رہے تھے تو ہم خرید
کے باپ بڑے ملکی رتنی بکر کے پوسٹ آفس کے پاس سے گزرتے پوسٹ آفس
کیا تھا۔ مکان کے باہر ایک سرخ لیرٹیکس لگا تھا۔ نیچے ایک پٹائی پر ایک
مستدقہ اور قنداریں ماسنے رکھے پوسٹ ماسٹر صاحب بیٹھتے تھے بٹلے بٹلے
اور دنیا جہان سے بیزار گشیہ میاں جسم، سر پر گچہ، مندی کی بھروان اور صوفی

مونچے سے سجاد رشت بہہ ہی چہرہ گنتی میں تاک تھی مگر مٹی اکبر کی۔ وہ صندوقچی میں سے ایک عورت کو دینے کے لیے کاڈ نکال رہا تھا مگر بڑی جلدی سے چٹائی کے سرے پر جو گئے رنگ کے کرتے میں ایک آدھ ننگا چار سال کا بچہ لیٹا تھا۔ پر اب ت گھسیٹ رہا تھا۔ اس کے بال گھٹے ہوئے تھے۔ چہرہ گول اور دلچسپ اور اس کی آنکھوں میں قدرتی شرارت اور ہنسی تھی۔

”وہ بے شمار۔ تمہیں پتہ ہے یہ جانک کوئی ہے؟“ میری پوچھی نے پوچھا۔
 ”نہیں۔ مجھے پتہ نہیں پوچھی جی۔“ میں نے کہا۔ ”اس کا کیا نام ہے؟“
 ”یہ شر پوچھا کاڑ کا ہے عبداللہ“ میری پوچھی نے کہا۔ ”تمہیں یاد ہے چار ماہ ہے کی بات ہے۔ تم یہاں تھے اور میں شر پوچھ کے گھر تمہیں لے کر آئی تھی۔“
 ”مجھے اچھی طرح یاد ہے۔“ اور پھر میں نے عبداللہ کو دیکھتے ہوئے زندہ سے کہا۔ ”پوچھی جی۔ پوچھی جی۔ یہ تو کبھی ہے۔“

عبداللہ کانٹے کا تھم اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑے اپنی طرف سے خوش خلی کی کوشش کر رہا تھا۔

عبداللہ نے کبچہ کے لفظ پر اپنی آنکھیں تختی پر سے اٹائیں اور منہ کھول کر مجھے ایک چمکیں مسکراہٹ دی مگر مٹی اکبر جس نے اپنے منہ کے متعلق یہ لفظ سن لیا تھا بھلا اس جھک کر کیسے جانے دیتا۔

اس نے ایک دھچکتی آواز میں کہا ”تو قیہں طایا بجو ہر دو گے۔“

میری پوچھی نے دار کو بڑی مضبوطی سے سنبھالا اور پھر نظر ہڑی خوش طبعی سے میں میں کربالی۔ ”یہ میرا بھتیجا بھکا ہے اور ہمارے دادا کے سب بھگے ہیں۔“

صراطِ مستقیم پر چلنے والے اور سیدھے کام کرنے والے۔ حلال کے سب بچکے
ہوتے ہیں میاں رضی اکبرؑ

”گڑھے۔ جا جا۔ راہ لے“ رضی اکبر نے نفرت احمد کی انکھیں، ہاتھائیں
اور گھیس گھیس لفظ اس کے موٹے ہونٹوں سے جلتے ہوئے انگاروں کی طرح نکلے۔
”میں تجھے بھی جانتا ہوں اور تیرے داد کوں کو بھی۔ یہیں گھاس مارا کرتے تھے میری
زبان نہ کھلا“

ایک اور عورت کو کارڈ دیتے ہوئے رضی اکبر کہنے لگا۔ ”راجو مصطفیٰ! تو دفعہ
اگر ایک تین چبیسے کا کارڈ لے جاتی ہے۔ تو کارڈ نہ لکھے تو تیری مصطفیٰ کے مٹ نہیں
پڑنے لگیں گے۔ تو کھتی ہے سرکار نے ٹاک خانہ تیرے لیے کھولا ہوا ہے؟“
عبداللہ نے اپنے تانا کے خٹکی بھر سے الفاظ کو بڑے لطف اور مزے سے
ستا۔ یہ اس کے لیے باتا دہ، تفریح تھی۔ اس نے میری طرف مسکاکر مجھے اپنا ہرازا
بنایا جیسے کہ رہا ہو۔ ”دیکھو راجو مصطفیٰ کی کیا گت ہی رہی ہے۔“

جب میری پھر بھی اور میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اس خنکس بوڑھے آدمی سے
رضعت ہوئے تو میری پھر بھی نے کہا۔ ”عبداللہ خدا جانے ان خٹکی چڑھوں کے
گھر کیسے پیدا ہو گیا۔ وہ ان میں سے نہیں نکلا۔ مزاج یا خٹکی کوئی بھی چیز تو اس کی
ماپیاں پر نہیں۔ پتہ نہیں بھوئی شریچہ اس کو کہاں سے لے آئی؟“

میں بعد میں اکثر وہاں سے گزرتا تھا۔ میری مدد میرہ خالائیں اس طرف رہتی تھیں
اور وہ مجھ سے بے حد پیار کرتیں۔ سیاہ گاڑھے کے لیے چلے اور سیاہ تہ بند میں
یہ خالائیں جب بھی میں جاتا تھا وہ شکر کا شیرہ گھول کر مجھے کھاتیں۔ کتنی مزیدار

وہ ہوتا تھا! ان دنوں میں کافی پیٹھ تھا۔ ان کی البتہ پوچھے مرنہوں سے میری جلائیں لینا
 مجھے ناپسند تھا۔ میرے وہاں سے بار بار گزرنے کی ایک وجہ ایسی تھی کہ تم ہنسو گے۔
 میں لیٹرکس کو دیکھتا چاہتا تھا۔ سرخ اور چمکیلا لیٹرکس اچھا ایک آدمی کی طرح گول مثل
 تھا اور جس کا ایک چھتے دار منہ تھا جس میں سے وہ کارڈ اور لفافے ہڑپ کر جاتا
 تھا۔ لیٹرکس گاؤں کے گلے پھیکے رنگوں میں ایک بھرکتی ہوئی آگ کی مانند تھا۔ تم
 پھر ہنسو گے۔ شاید بچوں میں میری اس سرخ گول ڈبے سے شینگل کاٹہ ہے کہ میں اب
 بھی جب ایک لیٹرکس کے پاس سے گزرتا ہوں میرا دل تھوٹا سا اچھتا ہے اور
 زندگی چمکیں اور پُرسرت لگنے لگتی ہے۔ اور پھر یہ خیال کہ تم اس لیٹرکس میں
 خطرہ اوروہ کئی سو میل سفر کرتا جاتا ہے! لیٹرکس۔ ہا۔ کہتے بچھڑے۔ دودھ و ماہ
 پٹے ساتھی اس کی بدولت ملتے ہیں۔“

”لیٹرکس پر بڑا اچھا ایسے ہے میک ڈون۔ اس کے متعلق تہذیبی شاعری
 ہم پھر کہیں نہیں گے۔ اب کہنا ہی سناؤ۔۔۔۔۔“

”باغ کے پاس ہی پولیس اسٹیشن میں گھنٹے پر ضرور کی آواز آئی۔ ایک۔ دو۔ تین
 — دس۔ ابھی سے دس! اور ہوا میں خشک تھی۔“

”اچھا میں مختصر ہونے کی کوشش کروں گا۔ مجھے لیٹرکس کے نیچے بیٹھے ہوئے
 خشکیں قیدہ پوسٹ ماسٹر اور ننھے ننھے ننھے تھکتے ہوئے یا پاس ہی کیستے ہوئے
 روکے میں کچھ شش سی لگتی تھی۔ میں دودھ سے انہیں دیکھتا گزر جاتا۔ عبد اللہ سے دوستی
 کرنے کو میرا دل چاہتا تھا مگر میں بڑے کی بد مزاجی سے ڈرتا تھا۔ دوسرے میری
 داد کی کور مٹی اکبر اور اس کے خاندان کے غلام کچھ پانے لگے تھے اور اس نے مجھے

ہدایت کی تھی کہ میں ان کے گھر نہ جایا کروں۔ یہیں کوئی لفاظی یا پوسٹ کارڈ منگوانا ہوتا تو میری دادی ہمیشہ فودے مراثی یا کسی امد سے منگواتی۔ اسی طرح ہر خط آتے ان کو لینے کے لیے بھی کوئی کٹی بیسھا جاتا۔ اسے دو تین چکر کاٹنے پڑتے کیونکہ میری دادی سے بدلہ لینے کے لیے بوڑھا رضی اکبر پہلے پھرے پر کسی کو یہ کہہ کر جھڑک دیتا کہ ”میں نے ابھی چھانٹی نہیں کی“ یا ”میرے کام میں ہرج ہوتا ہے میں اپنے وقت پر چھانٹی کر دوں گا“ حالانکہ گاؤں میں بہت کم چٹھیاں آتی تھیں امد وہ بھی ہنستے میں دوبار۔

ایک دفعہ میں نے عبداللہ کو لیسٹر بکس کے نیچے اکیلے بیٹھے ہوئے پایا۔ اپنے تانا کی نقالی میں پوسٹ ماسٹر بنے ہوئے۔ بوڑھا آدمی غالباً باہر بریڈوں میں گھاس پھیلنے گیا ہوا تھا یا کسی شریک کے ہاں کوئی جائداد کا جھگڑا طے کرنے۔ عبداللہ تختی پر آٹے ترچھے حروف میں قلم پر زرد دے دے کر ابجد کی مشق کر رہا تھا۔ مجھے شرمات سو جی۔

میں اس کے پاس گیا۔ ”پوسٹ ماسٹر۔ مجھے دو پیسے کا کلاڈ تو دینا۔“
عبداللہ نے وار پر سکراتے ہوئے دیکھا۔
”تمہارا تانا کہاں ہے؟“

”ماتھے ...“

میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”تہیں الف ب لکھنی آتی ہے؟“
”کیوں نہیں“ میں نے فخر سے کہا۔ یہ تو میں نے پہلی جماعت میں سیکھی تھی۔

”بے بے کنتی ہے اللہ میاں ہر جگہ جوتے ہیں۔ میں انہیں وہ خستہ اندھ چڑ
کے پاس ڈھونڈتا ہوں۔ مجھے تو نظر نہیں آتے۔ اُن کی داڑھی ہوتی ہے؟“
”اللہ میاں کی شکل نہیں ہوتی۔۔۔۔۔“

”شکل نہیں ہوتی؟“ یہ بات عبداللہ کو بڑی عجیب لگی۔ پھر اس نے کہا ہماری
میں نے کتنی دی ہے چلو تھیں دکھاؤں۔ نہیں پر میاں جی نے کہا تھا تم یہیں بیٹھ
رہنا۔ کوئی لفافے لے جائے اور پیسے دے۔۔۔۔۔ اور سوکھنا بڑی کا لڑکا
ہے نا۔۔۔۔۔ کل شام کرو وہ اس لڑکے کس میں روٹے ٹٹاٹا رہا۔ میاں جی نے
اسے ختب ماما۔“

اس طرح ہم باتیں کرتے رہے جو اب مجھے یاد نہیں۔ وہاں صندوقچی کے
پاس ایک کاغذ میں سودا خ کرنے والی مشین تھی۔ عبداللہ نے اس سے مجھے
سودا خ کر کے بتایا۔ یہ مجھے بڑی عجیب و غریب بات لگی اور ہم بے سٹ مارٹر کے
ایک نئے نئے سفید کاغذ کو شیش چلا چلا کر سودا خوں سے چھپتی کرتے رہے۔
سودا خوں کی جو گول گول کترنیں نکلتی تھیں وہ ہمارے لیے سونے سے زیادہ قیمتی
تھیں ہم ان کو بعد میں بانٹنے کے لیے منجھال منجھال کر رکھتے جاتے۔ وقت بڑھتا
گیا ساتھ میں میں نے نظر اٹھائی تو سامنے سے ہاتھ میں ہنگ والا عسائی بھد
کا پوسٹ مارٹر اپنی گھٹنی چال سے چلتا آ رہا تھا۔ میری توجہ جان نکل گئی۔ وہ مجھ سے
دینگ۔ ”یہ میاں کا لڑکا آج کیا لیٹھ آیا ہے؟“ ممکن ہے اس نے اسے اپنی
طرف سے خوش طبعی سے کہا ہو اور خوش آمدید کے طور پر۔ مگر میں اتنا ڈرا کہ وہاں
سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ اپنی قیمتی کترنوں کو بھول کر۔ بعد میں مجھے یقین

ہے کہ عبداللہ نے اسے بتایا ہوگا کہ شیخ سے اس کے کاغذ میں سداغ بھیجی گئی ہے۔
 کیے ہیں اور تختی پر چاندیہ چیزوں کی تصویریں بھیجی گئی ہیں۔ بانی ہیں۔ بلوٹھا غلام بڑا
 ہوگا مگر میرا خیال ہے اس نے عبداللہ کو معمولی سزا کی ہوگی۔ وہ دوسروں کے
 لیے بڑا کرما اور کھردرا تھا، اپنے خون پرست کے لیے نہیں اور اپنے چھوٹے
 خواہجہ موت کو اس کے لیے تو اس کا دل خاص طور پر نرم تھا۔

لیکن ایک بار میں بوڑھے رضیہ کی سخت خفگی کا سبب بنا اور وہ بھی مفت
 میں۔ عبداللہ چند دوسرے بچوں کے ساتھ چھپے پریشیدیں کھیل رہا تھا۔ میں
 وہاں سے گزرتا تھا ان کے ساتھ کھیل میں شامل ہو گیا۔ رشیدیں تم نے کھیل ہو گئی۔ میں
 پر ایک کیز سے ایک مستطیل کھینچ لیتے ہیں جسے خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ مگر
 چھوٹا کرنا بڑا۔ خانوں کے نام بھی عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ ایک خانہ نانی ہوتا
 تھا۔ ایک ٹاپو۔ ایک گھڑ گھڑا پو اور چھوٹا سمندر اس سے آگے بڑا سمندر۔
 کھیلنے والا پہلے پہلے خانے میں گٹی پھینکتا ہے اور وہ ایک ٹانگ پر پھینکتا ہوا
 پاؤں سے گٹی کو باہر سرکاتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ گٹی لکیر کے اوپر نہ آئے اور
 نہ ہی پاؤں لکیر پر پڑے ورنہ کھلاڑی آؤٹ ہو جاتا ہے اور دوسروں کی باری آجاتی
 ہے۔ نانی کے اوپر سے پھلانگ کر گزرتا پڑتا ہے اور اس میں گٹی چل جائے تو
 پھر پہلے خانے سے شروع ہونا پڑتا ہے۔ میں نے اپنے باری پر پہلے خانے لکیر
 کر لیے اور گٹی نانی میں پھینکی اور خانوں میں سے پھینکتا ہوا چلا تو عبداللہ نے
 شور مچایا کہ میرے پاؤں کی ایڑی لکیر پر لگنی ہے۔ میں نے اس سے انکار کیا اور
 عبداللہ کہنے لگا کہ تم دو دھارے دو ہم تم سے نہیں کھیلے۔ اس نے گٹی اٹھا لی

اور گھر کی طرف چل دیا۔ میں نے اس کی بڑی منت کی اور اسے یقین دلانا چلا کر میرا پاؤں پکیر رہی نہیں لگا تھا۔ مجھے کہیں میں مڑا آ رہا تھا۔۔۔۔۔ اور میں جیت رہا تھا عبداللہ بھی ضدی بلا تھا۔ نہیں ماتا۔ آخر میں نے غصے میں چڑھ کر کہا یہ نہیں کہیڈ تا توڑو۔۔۔۔۔ سب گھاؤں کے بچے لڑکے اور بڑے ایسے لفظ بغیر سوچے کچھ استعمال کرتے ہیں مگر عبداللہ نے تو بات کا تنگڑ پٹایا اور گھراپنے نانا اور بے سے جا کر میری شکایت کی کہ خدا راجی نے ایسے گندی گال دی ہے۔ میں تو وہاں سے چلا آیا مگر بوڑھے رضی اکبر اور شرچھو نے بڑا طعنان بچایا۔۔۔۔۔ "کون جیسا اسے ساڑھے دسے توں گالیں دینے والا۔ اب یہاں آئے تو کسی"۔ پوسٹ ماسٹر نے اس پر ہی اکتفا نہ کی بلکہ شام کو اپنے فرسے کے ہمراہ چوبارے پر میرے دواک پاس آیا۔۔۔۔۔ برسوں میں شاید پہلی بار۔ جس نے میرے دادا کو کہا کہ خدا راجی نے عبداللہ کو یوں یوں کہا ہے۔ جب دادا نے مجھ سے پوچھا تو بات سچ لکھی اس لیے میں انکار نہ کر سکا۔ میرے دادا نے مجھے خوب تھپکا کہ تو نے یہ گندی باتیں کہاں سے سیکھیں اور یہ کہ اسے علم نہیں تھا کہ مجھے بُری عادتیں پڑ گئی ہیں۔ میں بڑا شرمندہ ہوا اور اس شراوت کی سادی جڑ عبداللہ نے میری اس سرزنش پر خوب بغلیں بچائیں۔

میں اس گال میں پھر اس کے ساتھ کھینے نہیں گی۔ چھل خورہ خدایتی دفعہ

کہیں کا

میں نے کیش کو کوٹ کیا۔۔۔۔۔ میرا دل دیکھتا ہے اور ایک بٹلا دینے والی

سکتے کی کیفیت منجھ پر طاری ہوتی ہے۔۔۔ میک ڈونلڈ

احسان نے کہا: ”یار ہمیں دیوار پھاندنی پڑے گی۔ اگر پھر بچے گئے تو ریلوے پر جائے گی۔“

شہداء الحق نے اپنی کہانی جاری رکھی۔ اپنی گزری ہوئی یادوں کے تازی میں ڈوبی ہوئی۔ جس کا ایک ایک لمحہ وہ دوبارہ جی رہا تھا۔ وہ ایک طاقت ور شراب کے نشے میں سرشار انسان تھا۔ اور ہر سال ہم اپنے وطن میں تقریباً ساون بھادوں کے مہینوں میں آتے تھے جب یہیں چشیاں ہوتی تھیں۔ میں اکثر عبد اللہ کو دیکھتا۔ کبھی گاؤں کے بچوں کے ساتھ گولیاں اور شیدیں ادا لٹی ڈنڈا کھیلتے۔ کبھی چھڑ میں اپنی بھینس کو نہلاتے۔ کبھی دیا کے اُس پار واٹرے میں اپنے جانوروں کو چراتے۔ وراثتی لیے گھاس پھیلنے کے لیے برڈیوں کی طرف جاتے یعنی وہ مختلف کام کرتے جو سب غریب دیہاتی لڑکے کرتے ہیں اور جو میری رائے میں خشک الفاظ رہنے یا سود مرکب کے سوال مل کرنے سے کہیں زیادہ مہتمم اور مفید کام ہیں۔ حدیث و فقہ کی قوسی کی طرح وہ سوج ادب و دانش کی چھینٹوں میں بڑا ہوتا رہا۔ جب بھی ہم ملتے ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکاتے اسادھر ادھر کی باتیں کرتے جو اب مجھے یاد نہیں۔ ہم دونوں اس کی چیٹل خودی کر بھول گئے تھے اور وہ اب ہمارے درمیان ایک ہنس کی بات تھی۔ اس نے قرآن حفظ کرنا شروع کیا اور گاؤں کے اسکول میں بھی جانے لگا۔ ایک دفعہ اس نے اپنے منشی کے بولنے کی جو بیوقوفانہ کر کے یہیں بڑا بنایا۔ اس کا نام غلام رسول تھا مگر وہ مشہور غنی چھڑ کے نام سے تھا۔ اگرچہ اس کی کوئی خاص وجہ نہ تھی۔ عبد اللہ نے بڑی ہنستی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

یہ چھڑ لوگوں کو بڑی سزا دیتا تھا۔ جب کسی لڑکے کو سبق نہ آتا تو اس کے پاس ناگر پیٹ، بھٹ یا ناگنوں پر زور زور سے چکیاں لیتا۔ لڑکے ٹاپتے دوڑے چلاتے اور چھڑ بڑا خوش ہوتا۔ سب اس سے ڈرتے تھے۔ ایک دن اس نے میرے ساتھ بھی ایسا کیا۔ میں نے تناول بدلے میں چھڑ کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی انگلی پر زور سے چک مارا۔ پھر تو چھڑ صاحب کھانی یاد آگئی۔ زور سے "ہاؤ" کیا۔ وہاں چھڑ نے مجھے دھمکی دی کہ "بے وقوف، بدتمیز، نکلائی۔ میں تیرے نام نہ نہی اکبر سے تجھے پڑاتا ہوں۔" وہاں سے بھاگا اور ڈاک خانے میں میاں صاحب کے سامنے میری شکایت کی کہ آپ کے خا سے بے گستاخی کی ہے اور میری انگلی کاٹ لی ہے۔ میاں صاحب کی عادت تم جانتے ہو۔ انہوں نے کہا "چھڑ۔ تیرے کتوت ہی ایسے ہیں۔ اس کی سزا تجھے ملی۔" عدہ عبداللہ بڑا نیک ہے۔ "میری بے بے چھڑ کی ہال ہال سس کر بدعانی لیے آگئی اور پھر تو آگے آگے مسٹر چھڑ اور پیچھے میری بے بے بدعانی اٹھائے اور چھڑ کی ایسی تیس کرتی ہوئی۔ چھڑ کو راجہ کے کمرہ تک چھوڑ آئی۔ وہ دن اور آج کا وہی پچھڑ نے پھر کسی لڑکے کی چکیاں نہیں دیں۔ مجھے آتا دیکھتا ہے تو کترا کر نکل جاتا ہے۔ چھڑ کی ایک اور عادت یہ تھی کہ اچھے کھاتے پیتے لوگوں کو تلوں تالی بجا کر بلاتا "اے منظر ا۔" (تالی) جاپنی بے بے سے تازہ کھس لے آ۔ "یا" اونے۔ تالی۔ شیطان دی تالی (تالی) آغا، فشی جی کو سبق روٹی کھلا۔ جس طریقے سے عبداللہ یہ باتیں سنانا تھا اور جس سوز سے انداز میں۔ ہنسی سے بل پڑ پڑ جاتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے گاؤں کے بچوں کو ٹیکری پر کھیلتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے عبداللہ کی سرکردگی میں تالی کو گیر رکھا

تھا اور تالیاں بجا بجا کر ایک ساتھ کورس میں گارہے تھے۔

تانی گتے دی تانی جلا پور جانا پیا

تانی بیچارہ نے لگا اور پھر ملتے میں کوئی سوراخ دیکھ کر نکل بھاگا سب چھوٹے شیطانوں کا گٹھ تانی گتے دی تانی جلاتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ آگے آگے عبداللہ میں نے جا کر تانی بچدے کو ان شرارتی لڑکوں سے نجات ملائی۔ تب میری بارہ تیرہ سال عمر تھی اور میں خاماڑا اوندھ گڑا تھا۔

خانا ۱۹۴۶ء کی بات ہے۔ میں نے اسلامیہ کالج لاہور میں فٹ ایر میں داخلہ لیا۔ داخلے کے بعد ہی گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہو گئیں اور میں وطن چلا گیا۔ مادامی تب حلیل تھے اور میرے جانے کے کوئی ایک ماہ بعد وفات پا گئے، آخری دم تک ہوش میں رہے اور اپنے بستر سے ایک بادشاہ کی طرح ہدائیں دیتے۔ میں گھوڑی پر اسی طرح کہیں دن ڈھلے وہاں پہنچا۔ دادا سے مل کر نیچے آیا تو چوپڑی جینا نے باتوں باتوں میں بتایا کہ حیدر پہلے شر پھو مر گئی ہے۔ شر پھو کی موت بھی بالکل اس کی دنگ جفاکش اور وحشیانہ زندگی کے عین مطابق تھی۔ وہاں وہی رات کو اپنے گہرے پر پتی سے لکڑیاں کاٹ کر لاہری تھی کیونکہ دن کو وہاں محکمہ جنگلات کے سیکرٹریوں کی پروہ مارہری رہتی تھی۔ اندھیری کالی سیاہ رات تھی اور یہ دو جنوں تہنی دلیر عورت اکیلے دم پہنڈی سے اتہدی تھی کہ ایک مراد سے (جنگلی سوند) نے اس پر حمل کیا۔ شر پھو کے لکڑی میں کلہاڑی تھی اور اس شیر کی بچی نے اس سے مراد سے کا جی مار ڈالا۔ جنگلات مالوں نے بعد میں پتہ چلایا کہ انھوں نے اس رات ہی میں

”یاعلیٰ مدو“ کانفرہ سنا تھا اور اس کے بعد ایک محنت کی عجیب ہولناک چٹیں اور بدعائیں۔ اس مقابلے کو کسی نے نہیں دیکھا اور کوئی نہیں جانتا کہ کیا ہوا اور شریچھو پڑا۔ جنگلی سڈ سے کیسے لڑی مگر دوسرے دن صبح گاؤں کے باہر شریچھو کا گدھا کھڑا ہوا۔ گٹھے سے لدا ہوا دیکھا گیا۔ اپنی ہسکانے والی کے بغیر۔ اس سے ہر ایک کو تعجب ہوا اور جب شریچھو دیر تک نہ آئی تو بوڑھا رضی اکبر۔ اس کے بیٹے اور دو پوتے گاؤں کی ایک جماعت کے ساتھ تلاش میں ہی گئے۔ ایک پہاڑی پر چند میٹھے اور اچھلتے ہوئے گدھوں سے سراخ پاکر وہ آدھر گئے اور وہاں ایک جھاڑی کے پاس انھوں نے شریچھو کا زخمی مسخ شدہ اکڑا ہوا جسم پایا۔ آنکھیں سٹا کا نہ انداز میں کھل اور پھیلے ہوئے ہاتھ کی مٹھی کے ساتھ کھڑی جس پر خون جما ہوا تھا۔ پاس ہی دو قدم پر جنگلی سڈ سرخیں کھڑی کے پھل کا قاتل زخم لیے مردہ پڑا تھا۔

میری بھوپتی جیتانے کہا ”جو کچھ کہو۔ حق شریچھو کوئی سچ کی بچی۔ جو عورت ایک مرید سے کو کھڑا رہے سے مار سکتی ہے اس کے بگڑے اور زور کو دھم ہے۔“

لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ساتھ جوڑا لے جایا گیا اور جب اسے دفنایا گیا تو زون کھو ہار جگہ اس پاس کے گاؤں کے لوگ بھی آئے تھے۔ میری بھوپتی نے ڈرائیو اخلاقی میں یہ واقعہ سنایا تو میں نے محسوس کیا کہ شریچھو جاتے جاتے گاؤں کی تبلیغ میں ایک اور (Legend) تھوڑی گئی ہے جو چشموں میں نہیں بھلائی جائے گی۔

دوسری صبح میں شریچھو کے گھر اس کے بیٹوں سے تعزیت کرنے اور فاتحہ پڑھنے گیا۔ رضی اکبر اپنے لیٹرکس کے نیچے پٹائی پر بیٹھا تھا۔ خمیدہ اور شکستہ۔ وہ اپنی بیٹی کی موت کے صدمے سے دنوں میں بہت بوڑھا ہو گیا تھا اور پہلے سے بھی زیادہ

مدد کھا اور تھرا۔ اس کی آنکھیں خالی اور کوری نظر آتی تھیں جیسے وہ پتھر کی ہوں۔
میں نے جا کر کہا = اسلام علیکم چا چاچی۔

اس نے پہلے مجھے اس طرح دیکھا جیسے نہیں پہچانا۔ پھر اس نے کہا ”علیکم اسلام۔
آؤ جی۔ جی آیا ہوں۔“ لڑنے کا ڈٹ لینے آئے ہوئے“ وہ اچھی طرح میرے آنے کا مقصد
جانتا تھا۔

”نہیں چا چاچی۔ اجازت دیں تو بیٹھ جاؤں۔ جاسی سرفراز کے انتقال کا سہی کر
بڑا افسوس ہوا۔ بڑی شیر دل عورت تھی۔ مشیتِ ایزدی کے سامنے کوئی چارہ نہیں۔“
”مشیتِ ایزدی رضی اکبر دے خداں واسطے ای وہ گئی ہے۔“ وہ بڑبڑایا اور
پھر ایک زہر خند کے ساتھ اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔

”میں نے کہا کہ ہر ایک کی زندگی لکھی ہوئی ہے اور سب کو باری باری جانا ہے۔
لیکن کئی تو یہاں دھڑنا مار کر بیٹھے ہیں۔ ایہ بڑے نیاز احمد جودی علی صلیب
نے۔ مرے نہیں؟“

اپنے دادا کے بارے میں اس کا یہ حوالہ ایک جلتا ہوا انگارہ تھا مگر میں اسے چبا
گیا۔ رضی اکبر کا غالباً پڑھا ہے کے مدد سے داغ چل گیا تھا۔

میں نے کہا۔ ”چا چاچی۔ آپ کی اس بات کے بعد مجھے فاقہ نہیں کہنی چاہیے۔
مگر سرفراز بیگم آپ کی بیٹی تھی۔ میں مرحومہ کی فاقہ کیسے آیا ہوں۔“

میں نے ہاتھ اٹھائے۔ اس نے ہر سر پر ہاتھ بے دلی سے ہاتھ اٹھائے اور
رحم نے فاقہ پڑھی۔ فوراً بعد رضی اکبر نے کہا۔ ”نیاز احمد کے پاس میرے نواموں
کی کچھ زنجیر گردی رکھی ہوئی تھی جس پر وہ قبضہ کر بیٹھا ہے۔ اس کو کہہ کر میرے نواموں

کا حق نہ مارے اور اس سے پہلے کہ فرشتہ اجل اس کی روح کو واپس لے کرے اس ظلم سے قہر کرے۔“

بوڑھے کی باتوں نے میرا دل بڑا میلایا۔ میں نے تحمل سے کام لیا اور اٹھتے ہوئے اس سے پوچھا ”عبداللہ کہاں ہے؟“

”عبداللہ — حافظ عبداللہ۔ وہ واٹر سے پٹے کاٹنے گیا ہوگا۔“

میں وہاں سے نہر کے پار واٹر سے میں گیا۔ سورج چمک رہا تھا اور سماج کے ادھر کٹے کھیت سنری دھوپ میں نہر ہے تھے۔ ایک باڑ کے پاس میں نے عبداللہ کو ایک ٹیکری پر دیکھا۔ وہ ایک درختی سے کچر کچر گھاس کاٹ رہا تھا ایک دیہاتی لڑکے کی طرح تانہ رُو اور صحت مند۔ اس کے چہرے پر طمانیت اور سکون تھا اور ہونٹوں پر مہیا کی گنگناہٹ۔

”آؤ بھائی شادول۔ کدے بھر رہا۔“

ہم نے ہاتھ ملائے۔ ”مجھ سے چار پانچ سال چھوٹا تھا۔“

”میں تمہارے نانا کے پاس فاختہ پڑھنے گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ تم واٹر میں گئے ہو۔“

”بے بے نے مراد سے کہہ مار ڈالا۔“

”ہاں مجھے پتہ لگ گیا تھا۔ تمہاری بے بے بڑی بہادر تھی۔“

”جینا والا دل تھا بے بے کا۔۔۔۔۔ وہ پھر دہانتی چلنے لگا۔“ شادول

میں نے قرآن حفظ کر لیا ہے۔“

”حافظ عبداللہ ہی گئے ہو گویا۔“

”اور میں اب بچپن کے سکول میں جاتا ہوں کھوہار میں تو صرف پانچ جماعتیں ہیں۔ بچپن میں ہائی سکول ہے۔ مجھے بھی اسے۔ بی۔ سی آگئی ہے۔۔۔ دس ازبیرنیم۔ ہاؤڈوی ڈو۔ دن ٹو نکل مائی شو“ امد وہ فخر سے مسکرایا۔

بھروسہ بولا ”شنا دل۔ یہ جو ہوائی جہاز اڑاتے ہیں کیسے بنتے ہیں؟“
”کیسے کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ سیرادل کرتا ہے میں ہوائی جہاز اڑایا کروں۔ ہوائی جہاز مجھے بڑا پسند ہے، پریمیاں جی کہتے ہیں وہ گر پڑتے ہیں۔“

”ہاں گر تو پڑتے ہیں۔“ میں نے اسے دیتیں ہوائی جہازوں کے گرنے کے حادثات سنائے۔ جرمین زیمس کا قصہ بھی جسے ہوا میں اگل لگ گئی تھی۔

ہم گھاس کی کٹر کترا اور پرندوں کی چپھا ہٹوں میں بہت سی باتیں کرتے رہے۔ وہ سوال پوچھتا تھا کہ میں نے اسے بتایا کہ بائیسکوپ کیا ہوتا ہے۔ اس نے فریبہ بی بی کے گھر بھروسہ نو دے گلاسٹون کے ریکارڈس سے تھے اور مجھ سے پوچھا کہ اس میں کوئی گانے والی مود بھی ہوتی ہے۔ اتنی باتیں ہم نے کہیں۔

میں نے کہا ”تم درانتی سے گھاس بڑی تیزی سے کاٹتے ہو۔“

”تم کاٹو۔ بڑا آسان ہے۔“ اور اس نے درانتی میرے ہاتھ میں دے دی۔

میں نے گھاس کاٹنے کی کوشش کی مگر اسے اتنا آسان نہ پایا۔ وہ ہنسنے لگا

اور پھر اس نے مجھے اس کا گر سمجھایا کہ درانتی کو اس طرح پکڑتے ہیں اور اس درخ

چلاتے ہیں اور یہ کہ درانتی کا پھل پہلے ٹھیک کر لینا چاہیے اور پھر کسی پھنڑے تیز۔

میں نے پھر کوشش کی تو اپنا ہاتھ تھوڑا سا کاٹ لیا۔ خون بہنے لگا۔ اور عبداللہ

ہنر کے کلاس سے ملتی پر دیت لے آیا جسے اس نے زخم پر لکھیر دیا۔ پہل دفعہ ہاتھ ہر کسی کا کٹتا ہے ” اس نے میری حوصلہ افزائی کی ” تم میرے ساتھ آیا کرو۔ میں تمہیں فاسٹ سکھا دوں گا۔ میں اب گھر کے بہت سے کام خود کرنا ہوں۔ پہلے تو میری بے یے تھی۔ میں ایشیوں سوت بھی کات لیتا ہوں اور سوجے بھی گانتھ لیتا ہوں مگر جہاڑی جھاڑاٹا نا مجھے نہیں آیا ۔“

” جہاڑی جھاڑ تمہارے پاس ہے کہاں؟“

” تمہارے پاس ہے؟“

” ہاں۔ اگلے سال میں آؤں گا اور سم دونوں اسے اڑایا کریں گے۔ گاؤں

کے اوپر اور پتہ کے اوپر۔“

” ہا۔ ہا۔“ وہ درانتی پھینک کر خوشی سے ناچنے لگا۔ اور پھر اس نے

شکایت کی کہ میرے پاس تھا تو میں اس پر کیوں نہیں آیا۔ ریل گاڑی میں کیوں۔ میں نے کوئی مناسب عند کیا۔

ہم واپس ایک بڑا سا گھٹا لے کر آئے اور چھتر کے پاس بھرٹنے کا وعدہ کر کے لوٹ گئے۔

ایک بار میں پھر اسے ملا۔ میں ساوی گھوڑی پر اپنے ایک رشتہ دار کو ملنے پنجیس جادہ تھا۔ راستے میں سڑک پر عبد اللہ اور اس کے پانچ چھ ساتھی بستے بغل میں دابے پیدل سکول کو رواں تھے۔ میں نے اس کو گھوڑی پر اپنے پیچھے بٹھایا۔ ساوی گھوڑی، میں نے کہا ہے امیرانہ خوب کی دستدار گھوڑی تھی اور بعض وقت وہ اتنی چکینہ ہو جاتی تھی جتنی کوئی گھوڑی ہو سکتی ہے۔ مجھے اپنی بیٹھ پر سراسر کرانے

سے وہ خوش نہیں ہوتی تھی اور گویا اخلاقاً اور مجبوراً ایسا کرتی تھی۔ اب جب میں نے عبداللہ کو زہری کے پیچھے بندے کے تر پر بٹھایا تو سادی نے اسے ناپسند کیا۔ وہ بھری۔ اس کے نختے نختے سے پھر کئے گئے۔ وہ اگلی ٹانگیں اٹھا کر ہمیں گراتے کی نیت سے کودی۔ مگر میں نے اسے لگام سے قابو رکھا اور رگاہوں میں پاؤں مضبوطی سے جمائے۔ جیسا کہ فوسے مراٹھ نے مجھے سکھایا تھا۔

”دیکھو۔ دیکھو“ عبداللہ نے کہا ”سادی خشتاں کرنے لگی ہے۔“

میں ابھی اچھا سوار نہیں تھا اور سادی کی تنکوں مزاجی سے ڈرتا تھا میں دل میں ڈر گیا لیکن ہی ہر اڑتی بھاری سے کہا۔ ”اس حماس کو کبھی کبھی جی چڑھتا ہے میں ابھی اس کو سیدھا کرتا ہوں۔“

جب سادی ہمیں گراتی تھی تو وہ بھری ہوئی اپنی خود سری سے پوہ میں بوگنی۔ میں اس کی ایک آنکھ میں غصے ایسی کہنے کی دمک دیکھ سکتا تھا اور اگرچہ میں نے عبداللہ پر شب ڈالنے کے لیے بڑے مشتاق شاہسوار کا طور اختیار کیا جو گھوڑوں کی منہوں اند چالوں سے واقف ہو کر دل میں میں بے حد خائف تھا۔ میرا پسینہ چھوٹ گیا۔ عبداللہ نے کہا۔ ”بھائی شامل۔ تمہیں گھوڑے کی سادی نہیں آتی۔ اسے کھڑا کرو۔ کھڑا کرو۔۔۔ دُر۔ دُر۔ سادی کے پٹے کرنی اسے۔ دُر۔ دُر۔“

ہم ایک رستے پر جا رہے تھے جس کے ایک طرف لیکر کے کانٹوں کی باز تھی۔ سادی نے کیا کیا کر اپنے بدن کو باڑ کے ساتھ ساتھ رگڑ کر بھاگنے لگی تاکہ ہمیں کانٹے نہ چھیں۔ وہاں سے وہ پل کے پاس منر کی پڑوسی پائی۔ اسی طرح کودتی ہوئی مشریت پر آمادہ۔ اد میں اپنی بیٹی بھول گیا تھا۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ اس کا ہاتھ

بہیں ہنریں اچھا لپکنے کا ہے مگر اس کا ارادہ یہ نہ تھا۔ صرف وہ برے فوٹو سوانوں کو بھانپ لیتی تھی۔

وہ پڑوسی پر بھاگی۔ ہم اس کی میٹھ پر جھے رہے۔ عبداللہ نے کہا: اس کی باگیں مجھے پکڑاؤ۔ شادول: مگر اتنے میں زہی کا تنگ کسی طرح ڈھیلا ہونے سے زہی اٹھ گئی اور اس کے ساتھ میں زہی پر آدم۔ گھوڑی کی رفتار بھی ہلکی تھی۔ عبداللہ بھی کود کر نیچے اتر آیا۔ سادی فوراً وہیں کی وہیں کھڑی ہو گئی۔ اس کی ٹانگوں کی نسین کانپ رہی تھیں۔

عبداللہ خربہ بند۔ پھر اس نے گھوڑی کو تھاپیاں دیں اور پھر اس نے ندے کے تر کو پکھا کر اس پر زہی کے تنگ کو مناسب طریق پر کسا۔ نہ کم اور نہ زیادہ۔ اس نے کہا: نہیں سادی نہیں آتی۔ اب شادول۔ میں آگے بیٹھتا ہوں اور تم پیچھے۔ اب سادی خشتان نہیں کرے گی۔

اس نے مجھے چٹھایا اور پھر خود کتاب میں پاؤں رکھ کر بڑی ٹھہرتی اور صفائی سے اوپر زہی پر کود گیا۔ باگیں اٹھتے میں سنبھاہیں پہلے تو سادی نے اپنی پہلی ہڈی کرنے کی کوشش کی۔ کبھی گھومتی کبھی اچلتی مگر عبداللہ نے تھکیوں، بولسیوں اور باگ کے اشاروں سے اسے رام کر لیا۔ وہ بھانپ گئی کہ اب اس کی پشت پر ایک سوا ہے اور اس کی کچھ نہ چلے گی۔ وہ اب عبداللہ کی مرضی پر کبھی ہلکی چلتی کبھی پیچھا اور کبھی آہستہ آہستہ۔ راستہ بھر عبداللہ مجھے گھوڑے کے گر سکھا تا رہا جس طرح اس نے ایک دفعہ مجھے رہائی سے گھاس کاٹنا سکھایا تھا۔ وہ پیچھے ترس گیا اور میں زہی پر۔ اب کے میں کافی مدد دیا تھا اور سادی نے راستہ بھر کوئی

حجت کی چیمے اُسے پر ہی نے عبداللہ کو سڑک کے دو شاخے پر اتارا اور خدا آگے
 موج پر کی سمت چل پڑا۔ وہ کچھ دیر وہاں کھڑا اُٹھے دیکھتا رہا۔ سکھاتا ہوا اللہ
 اپنا ہاتھ ہلاتا ہوا۔ بایاں ہاتھ۔ عبداللہ ابھی کبھی ہوتا۔

اس کے بعد میں ایک مدد فرم گھر گیا اور پھر حالات کے تحت تین چار سال تک
 نہ جاسکا میرے دادا کی وفات کے بعد کھو ہوا وہ پہلا سا کھو ہوا نہ رہا۔ وقت کے
 ساتھ کتنے ہی انقلابات آجاتے ہیں۔ چیزوں میں اور انسانوں میں ہم خود بدل جاتے
 ہیں اور ایک طرح سوچو تو نہیں بھی بدلتے۔ میں اپنے بچپن اور لڑکپن سے اپنے
 آپ میں بڑی تبدیلی پاتا ہوں لیکن شاید اسی زمانے کے تاثرات، عادات، خوشبو
 اور نظاروں نے ہی مجھے وہ آدمی بنایا ہے جو میں اب ہوں۔ ممکن ہے اپنی اصل
 میں میں ہی معصوم، کھویا ہوا، شرماتی بچہ ہوں۔ مگر یہ میں جانتا ہوں کہ چیزوں میں
 وہ پہل سے تازگی اور بھرپور اب مجھے دکھائی نہیں دیتی۔ زمین پر پھیلی ہوئی ایک سنہری
 دھندلک اٹھ گئی ہے دادا کے تین ماہ بعد میری دادی بھی میسر میریں
 سے گر کر اللہ کو پیاری ہو گئی۔ اگلے سال میری مدفنوں پر وہ خلائیں بھی کیے بعد دیگرے
 وخصت ہو گئیں۔ پہلے بڑی خالہ ندیاں تپ بھر تو میں مر گئی۔ میری چھوٹی خالہ کو
 اپنی بہن سے بڑی محبت تھی۔ اگرچہ بڑی اسے جھڑکتی اور ٹوکتی رہتی تھی۔ وہ
 گھٹنے لگی اور آخر ایک جینے کے بعد اپنی بڑی بہن سے جا ملی۔ میری چھوٹی چھوٹی
 جینا اپنے خالہ ندیوں سے ماما غلام رسول کے ساتھ گاؤں چھوڑ کر خانیوالہ کے
 پاس چلی گئی۔ جہاں انہیں آباد کاری کی شرائط پر کچھ مریضے زمین مل گئی تھی
 ۱۹۳۸ء میں میں گاؤں چند روز کے لیے گیا۔ وہاں بچی کی زمینوں پر چاہے

چند شرکیوں نے قبضہ کر لیا تھا اور میرے والد نے مجھے لکھا کہ وہاں جا کر اس ٹفنے کو چکائوں۔ میں رات کو اپنے چوبیسے پر جا رہا۔ میرے دادا کے پرانے مراثی گھر کی گھر والی نے مجھے روٹی کھلائی۔ دوسرے دن شام کو میں چوہدری سے مل کر گھڑی پر واڑے سے آ رہا تھا کہ راستے میں خاندان کے قبرستان کے پاس میں فاتحہ پڑھنے کے لیے رُکا۔ جب میں بچپن میں اپنے دادا کے ہمراہ یہاں آیا کرتا تو سی پختہ اینٹوں کی کائی سے سبز قد آدمی چار دیواری تعزیمات محفوظ تھے اور ایک چھوٹا سا چکر کاٹنے والا آہنی دروازہ تھا تاکہ گاؤں بھینسیں اندر نہ جاسکیں۔ میں اس دروازے پر جھوٹے لیا کرتا تھا۔ اندر لمبی گھاس میں ہمارے مرے ہوئے بڑوں کی پختہ قبریں تھیں۔ ہر قبر کے اوپر ایک کتبہ تھا جس پر مرنے والے یا مرنے والی کی تاریخ پیدائش درج تھی اور اس کے نیچے ایک تعریفی شعر جس سے مرحوم کی تاریخ وفات نکلتی تھی۔ میرا دادا ایک عالم اور شاعر تھا اور یہ کتبوں پر اشعار اس کے تھساب میں نے دیکھا کہ چار دیواری بالکل ٹوٹ پھوٹ چکی ہے اور لوگ اس کی اینٹیں اکھاڑ کر لے گئے ہیں۔ چکر والا آہنی پھاٹک بھی غائب تھا۔ قبریں سب شکستہ حالت میں تھیں اور اونچی گھاس اور جھاڑیوں میں ڈھنسی ہوئیں۔ میں شام کے دھندلکے میں کتبوں کی عبارت پڑھنے کی کوشش کرنے لگا جواب مٹ چکی تھیں۔ تب میں نے ایک دیہاتی لڑکے کو سڑ پر ڈھٹا بنا دیا ہے اور ہاتھ میں کوئی چیز لیے سامنے سے برہمنوں کی طرف جاتے دیکھا۔ اس کی چال اور وضع میں مجھے کوئی چیز آشنا لگی اور پھر میں پکارا ”عبداللہ حافظ عبداللہ“ وہ ٹھٹکا۔ اور پھر اس نے نیچے مڑ کر نظر ڈالی کیونکہ یہ وہی تھا۔ اب سترہ اشعار برس کا لہبا، ترمذی کا جوتانی کی سرس

پر۔ وارثی کا سبز ہندوار۔

”شمار الحقی۔ بھائی شمار الحقی؟“ اس کی آواز میں بغوغت اور مردانگی کا بھاری
 پہ تھا۔ ”اسلام علیکم۔ کب آئے ہو؟“ خیر خیر بت ہے؟“

اس کی آنکھوں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں آئی اور مجھے عجیب سا لگا شاید
 میں نے سوچا۔ اس کے آبا کے خون میں رچی ہوئی جدی ٹھکانی اور درشتی اب
 جب کہ وہ جوان ہو گیا ہے اپنا اثر دکھانے لگی ہے۔ اس کے انداز میں کچھ
 رازداری، کچھ بھید کا شائبہ میں نے محسوس کیا۔ اس کی آنکھیں میری آنکھوں سے
 ملنے سے کتراتیں رہیں۔ خدا جانے کیا بات ہے؟

”کہاں جا رہے ہو عبداللہ؟“

”بروٹیاں۔ پٹھے کاٹنے۔“

”اس وقت؟ اندر منہ پر ڈھانٹا کیوں باندھا ہے؟“

”منہ سوچ گیا ہے اس لیے رومال باندھ لیا ہے؟“

”آج کل کیا کر رہے ہو؟ چا چار رضی اکبر کا کیا حال ہے؟“

”چا چا ٹھیک ہے۔ میں نے ٹرل پاس کر کے سکول چھوڑ دیا ہے۔ اچھا تم

اب کچھ دن رہو گے؟ میں کل ملنے آؤں گا۔ اچھا خدا حافظ؟“

وہ جلدی میں تھا۔ جیسا سے اس گھر سے جوتے جھپٹے میں لیے لیے ڈگ بڑھتے
 دیکھتا رہا۔ یہ تعجب کہتے ہوئے کہ وہ کس طرح بدل گیا ہے اور کیسے اتنا
 بے رخصا اور دکھا ہو گیا ہے۔ پھر قبرستان میں کچھ وقت گزار کر امجد فاطمہ چڑھنے
 کے بعد آگے گاؤں کی طرف چل دیا۔

میں گاؤں کی آوازوں میں جب ویٹے سے روشنی کمرے میں کھانا کھانے بیٹھا تو نور امراٹی نیچا کڑوں میں بیکھڑ کر امداد چتا ہوا مجھے گاؤں کی خبریں دینے لگا۔ وہ ایک چھوٹا بچہ کڑا سا آدمی تھا۔ ایک بکرے جیسی چھدری داڑھی کے ساتھ جواب سفید ہر چلی تھی۔ اس میں اپنی نسل کی ساری لطیف گوئی اور نقل کرنے کی صلاحیت تھی اور اس کے چٹکوں اور باتوں نے مجھے خوب لطف دیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ مولوی غوث محمد نے دوسرا نکاح پڑھوایا ہے۔ چچی داڑھی اور آٹا خراب۔ لاوا پاچھی کی بیوی بچوں کے عیاں کھد کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ بابا فضلے کے دونوں بچے فروج میں چلے گئے ہیں۔ میں نے اس سے قبرستان میں حافظ عبداللہ سے ملاقات کا احساس کے عجیب بے پروائی کے رویے کا ذکر کیا۔ اس کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ عبداللہ اب گاؤں کی گلیوں میں بے گم گھومنے کی طرح ستایا پھرتا ہے، ہر وقت دشمنی لاچر میں خلیں جھیلنا بنا ہوا۔ بات بات پر ہنستا ہے اور گاؤں کی گھواریوں کو دیکھ کر اس کے منہ پر ہر دانت شاہ یا مایہ کے بول آجاتے ہیں۔ وہ رانجھا اور مہینوں بننے کی کوشش کر رہا ہے۔

”فرسے“ میں نے کہا ”جوانی دیرانی ہوتی ہے۔ ہم سب اس منزل میں سے گزرتے ہیں۔“

”ہج ہے میان شہدال۔ کنیوں پر اس آندھی کو چڑھتے دیکھا ہے۔ یہ جنہوں کا بھوت بڑا اثر ہے۔ حافظ مجنوں کو دیکھو۔ نہ صورت نہ شکل۔ اس عمر میں بھی مجنوں کی مجلس میں جا بیٹھتا ہے اور جب لڑکیاں اس سے ٹھٹھا محفل کر کے اٹھا دیتی ہیں تو کہتا ہے۔ مل کریندا مجلس کریئے باہیں نہ دیندیاں گڑیاں۔ اگلے دن مجھے سکول

کے پاس ملا اور کہنے لگا۔ ساتھ دوسرے کا ہو گیا یہ حافظ مجنوں نگر اب بھی جنائی کو دیکھ کر دل پھل جاتا ہے۔ گناہ کلمہ کی بات ہے۔ جنائی شے ہی خدا نے عجیب بنائی ہے اور ہر ایک جنائی کا الگ الگ سوا۔ تو میاں شادول۔ حافظ عبد اللہ پر تو مست جہان گھر کرائی ہے۔

پھر اُس نے مجھے حافظ مجنوں کی نعل کر کے خوب خوب ہنسا یا اور میں سو گیا۔ صبح کا ذب کے وقت مسجد میں اذان سے میری آنکھ کھل۔ تم جانتے ہو میں نماز کم ہی پڑھتا ہوں مگر گاؤں میں خدا جانے کیوں مسجد میں جا کر جماعت میں نماز پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔ مجھے سادہ دہقانی لوگوں کے ساتھ نماز پڑھ کر عجیب بطن حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے مسجد میں جا کر مولوی غلام غوث کی امامت میں نماز پڑھی۔ اس کا لہجہ اسی طرح دہقانی اور اکھڑا تھا مگر وہ میرے کانوں پر گرا نہ گرا۔ وہ مجھے اس ماحول میں کچھ اچھا ہی لگا۔ دعا پڑھنے اور حاضری سے علیک بیک کرنے کے بعد میں اٹھا تو میں نے حافظ عبد اللہ کو وہاں دیکھا۔ ہم اکٹھے جوتیاں پہن کر باہر نکلے۔ گلی میں مولیٰ اپنے گلے کی گھنٹیاں ٹٹٹاتے گھاس چرنے برڈیوں میں جا رہے تھے۔ گاؤں جاگ اٹھا تھا۔

”عبد اللہ“ میں تے کہا ”مجھے پتہ لگا ہے کہ اس گاؤں میں راجے کی رفات

اب تمہارے دم قدم سے ہے۔“

”تمہیں کس نے بتایا بھائی شادول؟“ اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔

میں نے سمجھا کہ اس نے اس کا برا مانا ہے۔ پھر وہ کھل کھلا کر ہنسا اور اس نے

میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ بالکل ایک جہان کی طرح۔

”بھائی شامل - مجھے معاف کر دو۔ میں کل شام تم سے اوپر ملا۔ میں ایک ضروری کام سے جلدی میں تھا۔ تم نے پتہ نہیں اس سے کیا سمجھا ہو گا۔ اب میں قدرخ ہوں اور میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں“

بسم اور پوچھ بارے میں آئے اور بیٹھ گئے۔

”بھلا پوچھو بھائی شامل۔ میں کل شام کو کہاں جا رہا تھا؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ تم نے ہی مجھے بتایا تھا کہ تم مریشیوں کے لیے چارہ کاٹنے جا رہے ہو۔ میں دل میں حیران تھا کہ اس کام کے لیے یہ کونسا وقت ہے؟“

”میں تمہیں بتا دوں تو تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ لیکن تم میرے پرانے بلی اور بڑے بھائی ہو۔ تم سے کیسے چھپاؤں۔ میں ایک آدمی کو ٹوکے سے قتل کرنے جا رہا تھا۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں ”کیوں! تم نے اسے قتل کر دیا ہے؟“

”نہیں۔“ عبداللہ نے کہا ”اس کی قسمت اچھی تھی۔ وہ مجھے مل جاتا تو میں اس کو کبھی نہ چھوڑتا۔ اس کی نگرہ بوٹی کر دیتا۔ وہاں جا کر مجھے پتہ چلا کہ وہ فوج میں بھرتی ہو گیا ہے۔“

”تمہاری قسمت اچھی تھی۔“ میں نے تلخی سے کہا ”تم خون کر دیتے تو پولیس تمہیں پکڑ کر لے جاتی اور تم پہاڑی چڑھ جاتے۔ تم اتنے اچھے لڑکے تھے۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم بڑے ہو کر قاتل بن سکتے ہو۔“

”بھائی شامل۔ تم تو غصے ہو گئے۔ وہ حواضرزادہ بڑا بھیرا آدمی تھا اس نے میری شاماں کے ساتھ فحش مذاق کیا تھا اور اس پر دست دلائی کر لے کر بھیج کر شش

کی تھی۔ میں بڑا بے غیرت ہوتا تھا جس کو پی جانا۔ میں مرد ہوں۔“

پھر اس نے مجھے سلمیٰ کہانی سنائی۔ گاؤں کے ایک سفید پوش برکت کی لڑکی جس سے وہ دیوانہ وار محبت کرتا تھا اپنے چھوٹے دس سال بھائی کے ہمراہ اپنے ماموں کے ہاں رسول پور گئی تھی۔ جب وہ گھوڑی پر واپس آرہے تھے تو ایک شخص غلام خمد گامی اور اس کے ایک ساتھی لنگے نے انہیں راستہ میں ایک کیکروں کی ڈھک کے پاس روک لیا اور شاداں کو چھوڑنے لگے۔ شاداں ایک دلیر اور پرمحلہ لڑکی تھی اس نے ان کو خوب خوب سنائی، مگر آخر وہ اکیلی عورت تھی اور اس کے برابر مقابلہ دو کر کے نہ جاتا! اور وہ دل میں بڑی ہڈی۔ مگر بڑی بیابان تھی۔ گامے نے بڑھ کر لڑکی کو بازو سے نیچے پکھنے کی کوشش کی۔ شاداں کا چھوٹا بھائی رونے لگا۔ خدائے اس کی آبرو کی حفاظت کی کیونکہ اس وقت سڑک پر سوڑھی شریف کے پیر صاحب اور ان کی جماعت کے کچھ لوگ اچانک گھوڑیوں پر آتے نظر آئے۔ گامے کی ان کو دیکھ کر سچی گم ہو گئی اور شاداں کو دھمکی دے کر کہ وہ اس کے ہاتھ سے نہیں بچے گی، گاما اور اس کے ساتھی کیکروں میں گم ہو گئے۔ شاداں نے اپنی گھوڑی کو تیز کیا اور اسے دوڑاتی ہوئی پیر صاحب کی جماعت کے پاس سے گزری۔ وہ ایک لڑکی کو اس طرح تیز گھوڑی دوڑاتے دیکھ کر بڑے حیران ہوئے اور پیر صاحب نے پوچھا بھی ”دیئے خیر ہے؟“ مگر شاداں نے جانور کی رفتار کم نہ کی اور اس طرح اپنے گاؤں میں ہانپتی کانپتی پہنچی۔

شاداں نے تین چار روزہ ہوئے اس وارے میں اس کا ذکر روتے ہوئے کیا اور میں نے قسم کھائی کہ میں گامے کو نہیں چھوڑوں گا اور وہ زندہ نہیں رہے گا۔

ایک دن رسول پور جا کر اس کے متعلق مجھے پتہ لگا کہ اس کا باپ باب جہلم میں سکونت پذیر ہے جہاں وہ کسی دیکھل کا مٹی ہے۔ گامی پھپھے کہنے کو تو زمین کی دیکھ بھال کرتا ہے مگر اس کا اہل اس کی لٹنگوں کی ٹولی کا کام سوائے میل میل کرنے اور گاؤں کی لڑکیوں سے چھیڑ خانی کرنے کے اور کچھ نہیں۔ میں نے اس کا گھر دیکھا اور اس جگہ کا پتہ لگایا جہاں "سوتا تھا۔ کل شام کو میں اسے ختم کرنے کے ارادے سے گھر سے نکلا۔ اسی لیے میں تھارے پاس گیا۔" دیر نہ بھر سکا کیونکہ رسول پور آٹھ کوس ہے اور مجھے کافی دیر جانا تھا۔ مگر افسوس اس کی حیاتی کچھ دن اور لکھی ہوئی ہے۔ ایک دن پہلے وہ اپنے باپ کی سرزنش سے بگڑ کر جہلم جا بھرتی ہو گیا۔

"تمہارا مطلب ہے تم کل شام رسالہ پھر گئے بھی اور نوٹے بھی؟ سو کہ کوس؟"

"یہ کوئی بات نہیں۔ میں کوئی تین بجے مسجد میں آیا۔ گھر بھی نہیں گیا۔ میں صاحب فکر کر رہے ہوں گے۔ دیکھو شاد دل تم کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا" پھر بولا "شاد دل تم نے میری شادیاں کو دیکھا ہے؟"

"نہیں۔"

"میں تمہیں دکھاؤں گا۔ سارے گاؤں میں اس جیسی سوہنی اور جاندار کڑی اور کوئی نہیں۔ اور تم مان جاؤ گے کہ عبداللہ یونہی اس کے لیے ہونگے نہیں بھرتا۔ ہم ورگا اس کا بڑا قصہ ہے اور اس کی آنکھیں نئے کے کٹورے ہیں۔ پھول گلاب کا ہے شادیاں"

میں ہنسا۔ "عبداللہ۔ تم تو شاعر ہو گئے ہو۔"

"شاد دل چیز ہی ایسی ہے۔ چپ شاد دل وہ دیکھو۔ وہ آم ہی ہے۔"

چال دیکھو ۵

میں نے لکڑی کی بچی باگن میں سے دیکھا۔ گلی کے موڑ پر سے 'ٹنگے پاؤں' نیلے تہبند اور سبز چھینٹ کی لمبی قمیض میں ایک لڑکی سر پر گھڑارکھے آڑھی تھی — دوسری دیہاتی لڑکیوں کی طرح کنویں پر سے پانی بھرے جاتی ہوئی۔ وہ واقعی خوبصورت تھی۔ بالکی اور چھیل چھیل — رنگ میں صباحت تھی اور اس کے چہرے کے خدو خال ٹکے تھے۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ اتنی شرمیل اور محسوس کرتی تھی جیسے اس نے کبھی کسی فوجیوں دیہاتی لڑکے کی خواہش سے ملنے ہوئی نظروں کو اپنے جسم میں کھینچتے نہ محسوس کیا ہو۔ جیسے کبھی اس کے ارمان نہ جاگے ہوں۔ سب دیہاتی فوجیوں لڑکیاں ایسی ہی لگتی ہیں اور ان کے سینوں میں جذبات کا کتنا متلاطم طوفان ادا کتنے رنگیں پہنے ہوئے ہیں یہ ضاری جلتا ہے۔

پھر ایک عجیب بات ہوئی اس کی جگا = اوپر اٹھی اور اس نے ہمیں باگن پر کھڑے اور اسے دیکھتے ہوئے پایا۔ اس کے چہرے میں آگ سی دوڑ گئی اور اس کی چال میں آپ ہی آپ لڑکھڑاہٹ آگئی۔۔۔۔۔ اور اس کے سر پر کپڑے کے پچھلے پر رکھے ہوئے گھڑے کا توازن قائم نہ رہ سکا۔ پیشتر اس کے گردہ اپنے لہجے نازک ہاتھوں سے گھڑے کو سنبھالتی رہا اور ایک تراخ سے گلی کے فرش پر گر کر ٹوٹ پھوٹ گیا۔ عبداللہ نے اوپر سے کہا "کڑیے۔ گھڑا توڑ دتا ای۔ تینوں بے بے ہارے گی ۵"

گھڑے کے ٹوٹنے سے وہ بڑی پریشان ہوئی اور کچھ دیر وہاں گم سم کھڑی رہی اور پھر چہرے پر ایک مسکراہٹ لیے وہ اٹھ پائوں بھاگی۔ سامنے سے بابا شاہر اپنی

لاٹھی لیے آتا تھا۔ شاداں اس سے ٹھکرائی اور شاہو کی لالٹھی گر پڑی۔ شاہو نے گری ہوئی لالٹھی کو اٹھایا اور بھاگتی ہوئی لڑکی کو دیکھتے ہوئے اس نے لٹھی کو ستایا۔ اسے برکتے دی کر ڈیئے۔ تو مجھے بھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

”اس کا گھڑا تم نے تڑپایا ہے“ میں نے عبداللہ سے کہا۔

وہ زود سے ہنسا اور پھر وہ سنجیدہ ہو گیا ”تم میرے بھائی ہو۔ میری مدد کرو۔“
 قول دو کہ تم میری مدد کرو گے۔“

اس نے مجھے بتایا کہ شاداں کی بے بے قراری سے پسند کرتی ہے لیکن برکت خلیل کا رشتہ اپنی بہن کے لڑکے سے کرنا چاہتا ہے۔ دونوں میاں بیوی میں اس بات پر ناچا جاتی رہتی ہے۔ تم برکت سے بات کرو۔“ عبداللہ نے کہا ”تمہاری بات کا بٹا آخر ہو گا۔ آخر مجھ میں کوئی نقص تو ہے نہیں میں خدا کے فضل سے جوان اور تعدد مست ہوں اور میں اپنے چاچے کے ساتھ مل کے آٹھ کی مشین کا کام شروع کر رہا ہوں۔ خدا اس میں برکت دے گا۔ تم برکتے کو کہنا کہ شاداں کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ پیراجی شاداں میں اس کو بڑا خوش رکھوں گا۔“ میں اس کے بغیر نہیں نہ سکتا۔

ایک محبت میں مخمور نور جوان کی طرح باتیں کرتا رہا۔ میں مسکایا اور اس سے وعدہ کیا کہ میں برکت سے ضرور بات کروں گا۔ وہ چلا گیا۔ تو میں تھوڑی دیر کے بعد برکت کے ہاں گیا۔ وہ میرے دادا کے پرانے دوستوں میں سے تھا۔ وہ اٹھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے طریقے سے لکھن کے لیے اچھڑتے ملنے کی مشکلات کا ذکر کیا۔ تم میری دوگوں کو اکسائے کی صلاحیت تو جانتے ہو۔ اپنی ساری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر میں نے کوئی دو گھنٹے کی

تقریر کے بعد اسے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ شاداں کا رشتہ عبداللہ سے کر دے گا۔

”پتر شاداں الحق“ اس نے کہا ”تم مجھے نہ کہتے تو میں کبھی نہ مانتا تم بڑے سیانے ہو اور تمہاری بات کو میں موثر نہیں سکتا۔ لیکن مجھے شک ہے کہ بڑھاوا دینی رضی اکبر میرے پاس عبداللہ کا کشتہ مانگنے آئے گا۔“

”وہ آئے گا“ میں نے کہا ”اور اگر وہ نہ بھی آئے تو کوئی بات نہیں عبداللہ بھجوا دے شرجھو کا لڑکھو ہے۔ تجھ کو خود لاہور سے آکر تمہارے پاؤں پرٹے گا۔“

”میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ برکت کو میں نے بڑی تدبیر سے شیشے میں اتنا دیا ہے۔“ عبداللہ شام کو آیا تو میں نے اسے یہ خوشخبری دی۔

وہ بے حد خوش ہوا ”میں جانتا ہوں میرے بخت اچھے ہیں شاداں تمہنے مجھ پر اتنا احسان کیا ہے کہ میں اس کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔۔۔۔۔ تمہارے پاؤں دباؤں!“

”مگر عبداللہ۔“ میں نے کہا ”کیا رضی اکبر برکت کے پاس شاداں کا رشتہ مانگنے آئے گا؟“

”یہ میرا کام ہے“ وہ بولا ”میاں جی دوسروں کے لیے کتنے ہی دوست ہوں، میرے ساتھ ان کا بڑا لاٹھ ہے۔۔۔ وہ جائیں گے۔“

میں گاؤں میں تین چاندی اور سدا۔ میرے جانے سے پہلے معاملات طے ہو گئے تھے احساس کی شادی کی بات چیت کی ہو چکی تھی۔

عبداللہ مجھے اسٹیشن پر چھوڑنے کے لیے آیا۔ سارا راستہ وہ ہنسی مذاق

کی باتیں کرتا رہا اور لمبیا گاتا رہا۔ اس نے مجھ سے شادی میں آنے کا وعدہ لیا اور کہا کہ وہ مجھے کارڈ لکھے گا۔ وہ اس وقت کتنا خوش اور بے فکر تھا، ایک ایسے شخص کی طرح جس کی عزیز قریبی خواہش پوری ہو گئی ہو۔

پریس اشیش کے گھنٹے نے بارہ بجائے۔ چاند اب یوں کی طرح سفید اچھا اور صاف نظر آ رہا تھا اور تارے نیلے سیاہ عبا میں چاروں طرف چھٹکے ہوئے۔ دم ٹھنڈا ہے تھے۔ کبھی کبھی پتے ہوا کے ایک ہلکے جھونکے سے کھڑکھڑاتے۔ ”ہمیں اب دیوار پھانڈ کر ہی جانا پڑے گا۔ بارہ بج گئے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تھک مت کرو“ خنارالحق نے کہا۔ ”رات جواں ہے اور رات بھاری ہے۔۔۔۔۔ اور کتنا کچھ میں تمہیں بتا سکتا ہوں۔“ کتنی یادیں میرے دماغ میں جھوم رہی ہیں۔ مگر کبھی اور وقت۔ تم ٹھک گئے ہو گے اور تمہیں نیند آ رہی ہوگی۔ میں اب زیادہ دیر نہیں لوں گا۔۔۔۔۔ ہاں حافظ عبداللہ کی شادی میرا خیال ہے، مارچ ۱۹۴۰ء میں مجھے لاہور اپنے کالج کے پتے پر اس کا کارڈ ملا کہ اس کی شادی فلاں تاریخ کو ملے پائی ہے اور میں ضرور آؤں۔ میں ان دنوں امتحان کی تیاری میں مصروف تھا لیکن میں نے ایک دن کے لیے گاؤں جانا ہے اور شادی میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا۔ جوشے اشیش پر ہمارا ملائی نوڈا گھوڑی سے کہ پہنچا ہوا تھا یہ سادی نہیں تھی جو میرے دادا کی وفات کے دو دن بعد ہی مر گئی تھی۔ یہ اس کی جوان بھیری تھی، اپنی ماں کی طرح سفید نہیں بلکہ خاکستری رنگت کی، کنوئیاں کھڑکی کیسے اور جھونکوں کی طرح چمکدار، پھرتیل اور چاق چوبند۔ اس پر وہی پانی اپنی

ماں کی انگریزی زیریں کسی تھی — گاؤں کی واحد انگریزی زیریں — سب جاننا بہتیاں گزر جاتی ہیں مگر ان کی استعمال کی چیزیں ان کے پیچھے رہ جاتی ہیں اور ہماری گاؤں کی حویلی میں ابھی تک ایک صند وچھی پڑی ہے جس میں میرے دادا کی صینک، بڑا کی ٹوپی والی کالی دوات اور کچھ پرانے خطوط اور مسودات رکھے ہیں — ماضی سے ملانے والی ایک ترخیر کی مانند.... فرسے نے مجھے بتایا کہ تجواللہ دادا اپنی دوسری بیوی کے ساتھ اپنے بیٹے کی خاموشی پر آیا ہوا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس خبر نے مجھے کیوں حیران کیا۔

خام کو میں اپنی حویلی میں پہنچا۔ دوسرے دن عبداللہ کا نکاح تھا۔ عبداللہ اپنی شادی کے انتظامات میں لگا تھا۔ مگر میرے آنے کا سبک دقت نکال کر میرا شکریہ ادا کرنے کے لیے آیا۔ وہ ایک بانکا گھبرو لگتا تھا۔ بادشاہ کی طرح خوش۔ وہ چاہتا تھا میں اس کا شہباز بنوں۔ میں نے کہا ایک تو میں وہ کپڑے نہیں دیا جو اس سوتے کے لیے ضروری ہیں۔ دوسرے شہباز ایک چھوٹے لڑکے کو ہونا چاہیے جو اس کے پیچھے گھوڑی پر بیٹھ سکے۔ وہ ہنسا اور کہنے لگا ”شاول۔ تمہیں وہ دن یاد ہے جب سادو نے لڑکی کی تھی اور تم میرے پیچھے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر بیٹھتے اور کپڑوں کا کیا ہے۔ میں تمہیں اپنا لالچ دے دوں گا۔ تم بڑے اچھے شہباز بنو گے۔“

میری عادت ہے کہ مجھے تمنا بخینے سے بول آتا ہے اور آخر میں نے اسے اکسایا کہ وہ اپنے چھوٹے سوتیلے بھائی رحمت کو شہباز بنائے۔

رات کو میں اس کے گھر گیا اور اس کے اعزاء اور قریب سے چ۔ بوڑھے سڑی

رضی مگر کے چہرے پر میں نے پہلے بار سکرابٹ سے ملتی جلتی کوئی چیز دیکھی۔ اس کے
 ”جی آئی انوں۔ شکر الحق۔“ میں حقیقی محنت کی گرمی تھی۔ وہ اس حد تک پرتقاضی تھا
 کہ اندر سے دہن کا جوڑا بھی دکھانے کے لیے لے آیا۔ گونے کناری کا سرخ بانا
 جوڑا جو اس نے خود جہلم میں ایک دندنی سے سلوایا تھا اور جس پر ڈیڑھ سو روپے
 لاگت آئی تھی۔ میں نے جوڑے کے کپڑے اداس پر کام کو بہت سراہا اور اس سے
 رضی مگر بہت گھنگنے لگا۔ رات بھر گاؤں کی لڑکیاں گھڑوں پر پیادے اور شادی کے
 گیت گاتی رہیں اور دیہاتی مصلوں نئے تہ بندوں اور صافوں میں طبوس حقہ پیٹتے اور
 اور مرد حمر کی باتیں کرتے رہے۔ دوسری صبح حافظ عبدالقدوس پر ٹکلی باندھے
 اجلا ریشمی لاچر اور اچکن پھنڈے چھیل چھیلانے بنا برایتوں کے ہمراہ دہن کے گھر ڈھکا۔
 ”ہماری سادی کی بھیری پاننگری زری زری میں سدا تھا۔ اس کا چہرہ سرے سے دھنپا
 ہوا۔ اور چھوڑا رحمتا اپنے نئے کپڑوں اور کلمے ستارے والی گول ٹوپی میں غور غور
 خوش اس کے پیچھے اس کی کمر میں اپنے بازو محال کیسے۔ دہن کے گھر تک زیادہ
 فاصلہ نہ تھا اس لیے ہم سب پیدل چلے۔ مولوی غلام غوث نے نکاح پڑھایا۔
 چھوہارے بانٹے گئے۔ اس کے بعد شاماں کا دارج جو اس کے باپ بکت نے
 اسے دیا تھا، باہر لایا گیا۔ رنگین پیل پائیل کے پلنگ اور پلنگریاں، چمکتے ہوئے
 پیتل اور ایلمونیم کے بھانڈے، ایک بڑا صندوق، ایک لال چمپا چرخہ، دو
 لالٹینیں، ایک دودھ بلونے کی ”مٹی“ دھانی کے ساتھ، رنگدار لکڑی کے
 چمچے اور ڈوئیاں، چادر پانچ اچھے کھل بستر اور ایک سنگرٹیں۔۔۔ دارج میں ایک
 بھینس بھی تھی۔ جب براتی دارج کو دیکھ چکے تو مصطفیٰ شاماں کے دارج کو پلنگوں

پھر رکھے سارے گلاؤں میں پھرانے لے گئے تاکہ سب لوگ دیکھ سکیں کہ شادیاں
کے باپ نے اپنی بیٹی کو کیا کچھ دیا ہے۔

دوپہر کی روٹی میں نے دلہن کے گھر کھاٹی۔ مٹی کے برتنوں میں کمرے کے
گوشت کا سالن اور گھی میں تر بڑا آٹے کی میٹھی کڑھائی۔ ہر کوئی ہنسی مذاق کی ترنگ
میں تھا۔ خود سٹری رضی اکبر نے ایک دو مذاق کیے۔ اس نے ایک موم سے پانڈی
کا ذکر کیا جو کہا کرتا تھا کہ کڑھائی سلونے سے پہلے کھانی چاہیے تاکہ آدمی اچھی
چیز سے شکم سیر ہو جائے تو پھر سلونے کو ہاتھ لگائے۔ اس نے حافظ بجنوں کا
بتایا جس نے ایک دفعہ کڑھائی کی پوری دو تین پاتیں کھالی تھیں اور جب وہ
نکونک ہو گیا تو دوا دیوں کو اسے جھوٹے کی طرح اٹھا کر اس کے گھر پہنچا پٹلہ
حافظ بجنوں نے جو موجود تھا اور کڑھائی کو دونوں ہاتھوں سے شپڑ شپڑ کھا رہا
تھا، اس قصے کی صداقت سے انکار کیا لیکن سب اس پر ہنستے۔ جب اسے
زیادہ چھیڑا تو وہ اپنے اذیت دینے والوں کو دہر کرنے کے لیے اپنی لاشی ہما
میں گھس تا ہوا وہاں سے بھاگا۔ وہ یہ دہیاتی شادیاں یہ تہہ کے شہروں
کی شادیوں کی طرح پھیل کر اور بے روح نہیں ہوتیں۔۔۔۔۔ چار بجے ہم رخصتی گئیوں
کے درمیان شادیاں کی ٹولی عبداللہ کے مکان پر لا بٹے۔۔۔۔۔ میں نے عبداللہ
کو بات بات پر ہنستے ہوئے دیکھا۔ اس کے سنگلی ساتھی اس سے مروانہ، براہ راست
ننگے محول کرتے تھے اور وہ جواب میں ہنس دیتا تھا۔ مجھے شام کو گاڑی پکڑنی تھی
اور جب میں وہاں سے چلا تو حافظ عبداللہ ایک رنگین پائیوں کی پینکڑی پر کھڑا تھا
اور اپنی خالائیں اور پھر پھیپوں اور دوسری عورتوں سے ہنستا ہوا سلام کرائی و وصل

کر رہا تھا۔ وہ اب شادی شدہ تھا۔ گھر بار والا۔ ایک پورا مرد۔

جب اگلے سال میں گاؤں گیا تو عبداللہ کا ایک بچہ ہو چکا تھا۔ وہ اپنے پہلے گھر سے جہاں اس کا بڑا بھائی ادا اس کے بچے رہتے تھے اٹھ آیا تھا اور پھر کے پار اپنی کلکی (اٹے کی مشین) کے احاطے میں ایک کچے گارے سے بے کھٹے میں رہتا تھا۔ ایک دوپہر کو ایک گاؤں سے لوٹتے ہوئے جہاں میری بڑی بھوپھی ایک ٹھیکیدار سے بیاہی تھی، میں کلکی میں اس سے ملنے کے لیے رکا۔ کلکی کی ”کرہ گوہ“ اور ٹوپی دار لمبی چٹنی سے نکلتے ہوئے دھوئیں سنے میں نے اغانہ لگایا کہ آٹا پس رہا ہے اور حافظ عبداللہ کا کام مل پڑا ہے۔ اس سے مجھے اطمینان ہوا۔ بری چکھٹ کے کھلے دودھ کے بہہ رہے تھے چار گدھے اناج کی بوریوں سے لدے کھڑے تھے۔ میں گھوڑی پر سوار ہوا کیونکہ عبداللہ کو مشین کے کھٹے کے بار ایک بڑی گھڑی میں کچھ دیر سے توڑتے ہوئے پایا۔ اس نے مجھے دیکھا اور ایک ہنستے ہوئے خوش آمدید بھرے چہرے کے ساتھ کام چھوڑ کر بھاگتا ہوا آیا۔ میں گھوڑی سے اترا جسے ایک کوندہ پشت کہیں نے سنبھال لیا اور ہم ایک دوسرے کے بازوؤں میں بندھے۔ اس نے مجھے محبت سے دودھ دانی کے سے انداز میں خوب بھینچا اور ہم ہنسنے لگے۔ وہ اب سوچہ رکھے تھا۔ اس کے بال لنگھی چوٹی سے جھے ہوئے تھے اور تیل سے چمکدار۔ اس کی کلائی پر ایک گھڑی بندھی تھی۔

مختلف۔ تمہارے آنے کا پتہ ملا تھا اور اس کے بعد میں دودھ دہنار سے مکان پر پہنچا ہوں۔ اس نے کہا کہ تمہیں میرے پاس ٹھہرنا چاہیے تھا۔ خدا کے فضل سے

میری اتنی حیثیت ہے کہ تمہارے جیسے مکان کو بستر اور روٹی دے سکوں۔
 وہ مجھے اپنے کوٹھے کے اندر لے گیا۔ صحن میں ایک بھینس اور کئی کھرنی کے
 پاس بندھی تھیں اور اس کی بیوی اپنے بچے کو گود میں دھکے دے دیتی ایک پرچہ
 پرٹی کے چوڑے کے پاس بیٹھی ہانڈی پکڑ رہی تھی۔

”شاداں! شاداں! شاداں! آیا ہے۔ اٹھ سلام کر۔ یہ تیرے باپ سے میری
 سفارش ذکر تا تو تیرے گھر کبھی نہ آتی۔ شاداں! ہمارا ایک جانک ہے۔“
 شاداں اپنے بچے کو چھاتی سے لگنے لگی اور جھکی آنکھوں سے کہنے لگی ”جی
 آیاں نرن۔ بھائی جی“ اور اس نے اپنے بچے کو آگے بڑھایا۔

میں نے گل گو تھنے ننگے بچے کو اپنے بازوؤں میں اٹھالیا۔ وہ ایک صحت مند
 موٹا بچہ تھا۔ بیٹنوں کی آنکھوں والا۔ بالکل اپنے باپ پر۔ وہ رونے لگا اور میں نے
 اسے اس کی ماں کو دے دیا۔

”نام کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”سکندر حیات“ اس کی ماں نے غرور اور خوشی سے کہا۔

”مولوی غوث محمد نے کہا تھا کہ اس کا نام سکندر حیات رکھو۔“ عبداللہ نے

کہا ”بڑا ہو کر بخت والا ہو گا اور وزیر بنے گا۔“

میں نے شاداں کو خود سے دیکھا۔ وہ سال میں ہی پوری عورت بن گئی تھی۔ جسم
 بھرا بھرا اور گند دایا ہوا۔ خچر کی طرح مضبوط اور پختہ بیاہی عورت کا چہرہ مدھاپ
 جس ایک حکم کی طرح حسین اور پُر وقار تھی۔ وہ ایک بہن بنی ہوئی نزاکت سے چلتی تھی۔
 ہم پے پستے صاف ستھرے چمکیے برتنوں سے بچے ہوئے کمرے میں داخل

ہم نے تو ایک طاق میں رکھے ہوئے ٹنائم پیس کا الارم بجنے لگا۔

عبداللہ نے مسرت سے کہا : ”شبابا شبابا۔ گھڑیے گھڑیے بول۔ شامل آیا اسی نے
میں رنگیں پاویں کی چنگڑی پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں شامل کے راج کا سدا سا مان
ایک عجائب گھر کی طرز پر سجا ہوا تھا۔ ایک بڑے بھونپو والا گراموفون بھی تھا۔ وہاں
بیٹھے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ اس کمرے سے زیادہ آرام دہ اور پر تعیش کوئی شاہی
محل ہو سکتا ہے۔ شامل میٹھ لسی ایک خیمے کے جگ میں لے آئی اور ہم نے دو دو
گلاس پیئے۔ عبداللہ نے اپنی بیوی کو چھیڑا : ”شامل۔ میں تم سے تمہاری بہن کی ایک
شکایت کرنا چاہتا ہوں۔ جب سے سکند حیات خان ہمارے گھر میں تشریف لائے
ہیں تمہاری بہن نے میری پروا میں کمی کر دی ہے۔ نہ یہ اب میری ٹانگیں مباتی ہے
نہ میرا سر سلاتی ہے۔“

شامیں شرمان ہوئی قوماں باہر مل گئی۔

عبداللہ نے کہا عشاواں نے مجھے بڑا سکھ دیا ہے۔ اس کے آنے سے میری
جون ہی بدل گئی ہے۔ یہ سچ ہے نیک بخت عورتیں اپنی قسمت ساتھ لاتی ہیں۔ اس کے
آنے کے چھ مہینے کے اندر اندر مجھے کسی کی محتاجی نہیں رہی۔ میں اپنے پاؤں پر
کھڑا ہوں۔ اپنا گھر بار اور اپنا کاروبار۔

پھر اس نے اچانک کہا: "شامل، تمہیں جانی کی خواہش نہیں ہوتی؟ تم اپنا گھر کیوں نہیں دیکھتے؟"

میں نے جواب دیا کہ ابھی دقت نہیں۔ میں ڈپر ہو رہا ہوں اور حبیب میں ٹپھائی سے فارغ ہو جاؤں گا تو شادی کی سوجھ بوجھ ملے گی۔“

”جانی کے بغیر ایک مرد کی کچھ زندگی نہیں۔ آدمی گناہ سے بچتا ہے تم کیسے عورت کے بغیر رہتے ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔“

میں وہاں عبداللہ کے گھر کوئی دو گھنٹہ بیٹھا۔ اس نے مجھے اپنی کھانک کے کاروبار کے متعلق بتایا اور یہ کہ وہ کچھ پیسے آنے پر آنے سے اوروں کے کشیش بھی لگائے گا اور وہ رکھتا ہے۔ ہم نے بھونچو والے گراموفون پر کچھ ریکارڈ بھی سنے۔ اس کی سوری ایک لکڑی کی طشتری میں کھاتا لے کر آئی۔ ساگ اور تازہ کھن اور خورد کی روٹی۔ کھانے نے بڑا لطف دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں سکند جیات کے ہاتھ پر دور و پسند کھ کر اس خوش بابرکت گھر سے رخصت ہوا۔ اپنی زندگی کے بھرپور اور تنہائی کا سوچتا ہوا میں کچھ اداس اداس حویلی کو لوٹا۔

میں اپنے تعلیمی گورنر پڑھنے سے ہمیشہ گھبراتا ہوں۔ اداس کی وجہ سے میں متواتر دو سال بی۔ اے میں فیل ہوتا رہا۔ والد صاحب قبلہ سخت ناراض تھے۔ کیونکہ مجھ سے انہوں نے کافی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ اس مدت میں میں گاؤں نہ جاسکا۔ حافظ عبداللہ اداس کا ایک ساتھی دشمنو کھتری جو گاؤں میں کینک بنا ہوا تھا، ایک بار لاہور مشینری کے کچھ پرزے خریدنے کے لیے آئے۔ عبداللہ ریڈیو محوشل میں مجھ ملنے کے لیے آیا۔ اس کا جسم ابھی تک کسرتی تھا مگر خوشحالی اور بے فکرگی کی وجہ سے کچھ فریبی کی طرف مائل۔ اوائل شباب کی تازہ رمل کی جگہ ایک مردانہ پختگی نے لے لی تھی اداس نے بھی ترکیبی مرنجیں لگائی تھیں۔ جن کی لوگوں کو وہ مسلسل بل دیتا رہا۔ وہ بے ساختگی سے ہنستا تھا۔ اس نے مجھ

بتایا کہ اب اس کا ایک اور ڈاکا بھی پیدا ہو چکا ہے۔

”اُمید اس بار تم نے اس کا نام خضر حیات رکھا ہو گا؟۔۔۔ سکندر حیات کے بعد خضر حیات“ میں نے کہا۔

”وہ ہنسنا۔“ نہیں نہیں۔ اس بار میں نے سب تجویزوں کو رد کر دیا۔ میں نے اس کا نام اس کے چاچا پرستادہ لکھ رکھا ہے۔“ اس نے خضر سے میری طرف دیکھا اور میرے دل کا کوئی اندرونی حقد سترت سے دھکا۔

”چاچا رضی اکبر نے اس کی مخالفت نہیں کی؟“ میں نے پوچھا۔ ”اسے ہم ٹرانس سے بڑی کہہ رہے۔“

”سچ کہوں۔ میاں جی نے مخالفت کی مگر میں نے کہا کہ اس کا اصل چاچا نہ لکھ رہے اُمید میں اس کا نام بھی رکھوں گا۔“

”اُمید بہن شادیاں کیسی ہے؟“

”ٹھیک اور خوش ہے۔ ہاں میاں جی سے اس کی نہیں بنتی اور مجھ پر بھی غصے ہوتی رہتی ہے کہ میں میاں جی کی پامرداری کرتا ہوں۔ شادی کے وقت مجھے پرت نہیں تھا کہ اتنی تیز مزاج نکمے گی۔ ایک دو بار تو وہ اس بات پر سیکے چلے جانے کی دھمکی بھی دے چکی ہے لیکن میں اس کو راضی کر لیتا ہوں۔ جتنا کہ بھی انہی کی طرح ٹھنڈا کرنا پڑتا ہے۔۔۔۔۔ میں کچھ سوچ میں چلا گیا۔“

”اے خوش رکھو۔“

”ہاں۔“ وہ چونکا ”خوش اتم تے اے مجھے دلایا ہے۔ میں اب بھی اس سے پہلے کی طرح محبت کرتا ہوں۔“

دشمنو کھتری ایک لمبے کوٹ میں ایک چھوٹا سا آدمی تھا۔ چھوٹے کانوں میں مندیوں پہنے بولا۔ "لاہ سکھی رام کا قول تھا کہ جب عورت ہنٹ پڑتی ہے تو صرف ایک چیز اسے درست کر سکتی ہے۔ سونٹے کی مار۔۔۔۔ اور وہ۔۔۔۔" میں نے دیکھا کہ دشمنو کھتری کے کوٹ کی جیب میں سے ایک بند بوتل کا منہ تھوڑا سا نکلا ہوا ہے۔ وہ مجھے شراب کی بوتل لگی اور میں تعجب کرنے لگا کہ کہیں حافظ عبدالقدوس بھی چپک لگانے کی لت تو نہیں پڑ گئی۔ وہ آدھ گھنٹے کے بعد چلے گئے۔

۱۹۴۳ء کے جہان جلائی کے سینے میں مجھے اپنے والد کی ہدایت کی تکمیل میں پھر گاؤں جانا پڑا۔ میں اس مشن پر جانے سے قطعی غرض نہیں تھا اس وجہ سے کہ فریقِ ثانی فرمی چڑھا اور تبلیغِ کلام بوڑھا حافظ عبداللہ کا نانا رضی اکبر تھا۔ ایسے خانگی تانے بڑے تدبیر انداز محصلے ہی سے پیٹلئے جا سکتے ہیں۔ وہ بھی اس صورت میں جب دوسرا فریقِ معاہدہ کی ماہ اختیار کرے اور کچھ جھکے۔ رضی اکبر ایسا شخص نہ تھا۔ وہ ساری زندگی نہ خدا کے سامنے جھکا تھا نہ شیطان کے سامنے۔ اور میرا خیال ہے کہ بارگاہِ ایزدی میں اس کے سجدے نیاز مندی اور عبودیت سے مدد ہی ہوتے تھے۔ اس کا معبود وہ خود تھا۔ اس کا غرور اور اس کی اتار دیرا کے پار ہماری کچھ متنازع زمینیں ہیں ایک آدھ ایکڑ تھی اس کے بڑے نواسے سہیل نے ناجائز قبضہ کر رکھا تھا۔ والد صاحب نے اسے اور رضی اکبر کو کئی بار لکھا کہ وہ قبضہ چھوڑ دیں مگر یہ ایسی بات تھی جو رضی اکبر کے سینے میں ہمارے خاندان کے خلاف بھرتے ہوئے زہر کو امداد دہ گھورتی۔ میں نے سوچا کہ میں اس معاملے میں بوڑھے کی

بجائے حافظ عبداللہ سے بات کر دیا گا کہ وہ اپنے ناہ کو سمجھائے۔

جب گاڑی جوڑے کے اسٹیشن پر پہنچی تو مطلع ابراہیم تھا۔ کالی سیاہ گھٹاپتی کی ہاٹریوں پر سے اُٹتی ہوئی آسمان پر چڑھتی آہری تھی اور پریت کی ٹھنڈی ہوا ایک ہر اہل دستے کی طرح درختوں کو تھپڑے مارنے لگی تھی۔ نور سے نے جو گھوڑی لے کر آیا ہوا تھا مجھے کہا کہ زور کی برسات آنے والی ہے اور بہتر ہو گا کہ چودھری علم دیں گے ڈیڑے میں بادشہ کے کہنے تک آرام کر لیں۔ مجھے پی کے شام اب گھر سے نیلے پلٹ لیکروں اور بھیکوڑوں کے درمیان لہراتی سیاہ ہوتی ہوئی سڑکیں، چمکتے کڑکتے بادلوں کے نیچے کلاتے ہوئے پردوں کی فوٹائیں، سب اتنے بھلے اور سحر انگیز لگے کہ میں نے اس موسم میں گاؤں جانے کا ارادہ کر لیا۔ ”بادشہ آتی ہے تو آئے۔“ میں نے کہا۔ ہم چل پڑے۔ آگے آگے جتنی گھوڑی ریمیں اور کچھ پیچھے سامانی سے لدے گدے پر نور امراٹ۔

ہم کمال پور سے گئے اور بادشہ پھر بھی نہ آئی ساگر چہ ٹھنڈی ٹھنڈی فر فر کرتی مہمانی سے لدی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر کے ایک چھوٹی ٹی کے اوپر ہم نے ایک خمیدہ کندھوں والے سلاٹھی ٹیک ٹیک کر چلتے ہوئے بوڑھے آدمی کو بائیا۔ میں پاس سے گزرتا تو میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھ دیکھ کر ہار کا پوسٹ ماسٹر رضی اکبر تھا۔ بڑھاپے اور ضعیفی اور کپڑے پی کے باوجود اسی طرح مغرور اور ساری دنیا کے خلاف کینڈ پالے۔

”السلام علیکم چاچا جی“ میں نے گھوڑی روکتے ہوئے کہا۔ ”کہاں سے

آہے میں؟“

”علیکم السلام“ وہ رکھائی سے غرا یا اور اسی طرح لالٹھی ٹیکتا ہوا چھوٹی مضبوط ٹانگوں سے کچی سڑک پر چلتا رہا۔

”چاچا۔ میں شاد الحق ہوں۔ عطار الحق کا بیٹا۔ آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟“ میں نے کہا۔

”اچھا! اچھا۔ میری میٹھی گزرد ہو گئی ہے۔ مگر میں ٹوانوں کو ایک میل سے سونگھ لیتا ہوں۔ ان کی بو اتنی تیز ہے۔ شاد الحق خاں ستار سے باپ کا ایک مال ہے؟“ وہ خیریت سے ہیں۔

”خیریت سے؟“ اس نے اپنی لالٹھی ہوا میں لہرائی ”اسے میری طرف سے کہہ دو کہ ظلم کسی نہیں بنتا۔ جب تک رضی اکبر زندہ ہے اسے دانشے والی زمین کا ایک چپہ نہیں مل سکتا۔“

”چاچا!“ میں نے کہا ”زمین کی کس نے بات کی ہے؟ آپ گھوڑی پر چڑھ بیٹھیں۔ کھوپڑ کا کافی فاصلہ ہے اور بارش آ رہی ہے۔ میں پیدل آ جاؤں گا۔“

وہ اس اخلاق پر حیران ہوا۔ وہ اپنے زہر کو اگلنے کی خاطر تلخ کلامی کے لیے زمین ہمسار کر رہا تھا اور یہاں اس کے شریک اور دشمن عطار الحق کا بیٹا اسے ساری کے لیے اپنی گھوڑی کی پیشکش کر رہا تھا۔

”جاؤ۔ جاؤ۔“ بولا ”میری ٹانگیں گھوڑی سے زیادہ مضبوط اور تیز ہیں۔“

میں نے ایک بار ادا ادا کیا اور پھر اس کی کھل کدورت کو دیکھ کر میں نے گھوڑی کو اڑانے لائی۔ ایک فرلانگ آگے سڑک کے موڑ پر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا وہ اسی طرح خمیدہ، لالٹھی ٹیکتا، تیز تیز چلتا ہوا آ رہا تھا سر پر صاف زنجیروں والے

تعلیق چہرے پر لال بھرداں داڑھی۔ لمبی ہونی خشک آنکھیں، ایک تنہا کھوٹا ہوا بوڑھا آدمی۔ اس وقت وہ مجھے ایک المیہ کر دار لگا۔

پہلے جھینٹے گلیاں کے گاؤں سے کچھ آگے ہم پر پڑے۔ کھو ہاں یہاں سے بس ایک کوس تھا۔ ہم نہ رُکے اور بڑھتے گئے۔ پر سے پتی کی پتلیوں پر بڑی موسلا و صابری باریش برستی معلوم ہوتی تھی۔ اگرچہ یہاں ابھی بوندا باندی ہی تھی۔ آسمان پھری ہوئی سیاہ گھٹاؤں کا ایک آتش کڑا ہوا تھا۔ ہم کھو ہاں میں داخل ہوئے تو بارش موسلا و صابری بننے لگی اور حیران کن پہنچتے ہم بالکل بھیگ گئے۔ یہ ایک سیلابی بارش تھی اور اس غلطی میں بھی جو بارشوں کے لیے مشہور ہے۔ میں نے آسمان کو اس طرح برستے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اب میں نے سوچا ہفتوں تک گاؤں کی گلیوں میں گھٹنوں گھٹنوں کی چھڑ ہے گا اور ہر کوئی ہاتھ میں لٹھی لیے اور اپنے تئیں کو اوپر اٹھائے اپنے کام پر نکلے گا اور نہ ہر لیے میر یا کے ٹھہر چھتوں میں پیدا ہو کر انسان اور جانور کی زندگی اجیرن کر دیں گے۔

میں نے چوبیسے میں کپڑے تبدیل کیے۔ در سے فٹ مٹی کی آگشتی میں بھونک مار مار کر آگ بلائی اور آگ کے سامنے بیٹھے ہوئے بستر کو خشک کرنے کی تدبیر کرنے لگا۔ گاؤں پر خاموشی سی طاری تھی اور سوائے مٹی چادر وں میں گرتی ہوئی بارش اور بجلی کی کڑاک کے اور کوئی آواز نہ تھی۔

میں اس بالکونی پر کھڑا ہو کر اس ہولناک بارش کا نظارہ کرنے لگا۔ اچانک پتی کی طرف بھلی کسنا معلوم نہیاں کے سروپ کی شکل میں گوندی اور مارا آسمان روشن ہو گیا اور پھر ایک دھلا دینے والی گواڑا ہٹ سے ایک چند عیادینے والی روشنی کی

تواریس نیچے لپکی۔ دس توپوں کی گولہ باری کے ساتھ۔

نور سے نے خوف سے کہا۔ ”میاں جی۔ گاؤں کے نزدیک کہیں بھلی گری ہے۔ اللہ رحم کرے۔“

میرا خیل ہے کوئی آدھ گھنٹے کے بعد طوفانی بارش کے شور میں میں نے دو عورتوں کی آواز سنی۔ ”نی شر پھوڑو سے عبد اللہ بے چارے تے بھلی پئی لے۔“ دوسری عورت نے کہا ”ہائے ہائے نی بے چارا۔ میں مر گئی۔ ہائے جلالہ ہی تھی۔“ میرا دل ٹھب گیا اور میں دعا کرنے لگا کہ میرے کانوں نے غلط سنا ہو بارش ذرا تھکی تو رخصتا اور میں باہر بھاگے۔ گلی میں بہتے پانی اور گارے میں شیشیا تے اور دیواروں کو پکڑتے۔ کھلکی میں پہنچتے پہنچتے ہمیں کچھ وقت لگا۔ کھلکی کے کونے کے پھونس کی چھت گری ہوئی تھی اور مشین کا انجن نڈا مڑا اور سیاہ اپنی آہنی پنجر نمایاں کئے پڑا تھا۔ چھ سات دیہاتی عورتیں اور مرد جمع تھے۔ انجن اور مشین کے درمیان پٹے کے نیچے کھٹے کی طرح سیاہ، ٹسکڑا اور تھکسا ہوا حافظہ عبد اللہ کا جسم پڑا تھا۔ بالکل ناتاہل شناخت۔

بعد میں روتی ہوئی شاماں نے مجھے بتایا کہ جب چھت کے گرنے کا دھماکا ہوا تو عبد اللہ اس کے منہ سے گرنے کے باوجود یہ دیکھنے کے لیے بھاگا کہ اس کی مشین کو کچھ نقصان تو نہیں پہنچا۔ پھر بھلی بڑے زور سے کڑاکی اور مشین پر گری اور عبد اللہ جھانپنی آئی سے پاس کھڑا تھا بل نہیں گیا۔

اوہ! وہ کہیں جردیہاتی بوڑھیوں نے اپنے بازو لہر لہرا کر اس کی میت پر کیے! عبد اللہ کا جسم رسی اکبر کے گھر کے صحن میں چار دیو میں ڈھنپا ایک چار پائی پر پڑا

تھا۔ ارد گرد اس کی غلاٹیں، پھر پھیاں اور دوسری عورتیں سیاہ کپڑوں میں اکٹری بیٹھی تھیں ایک ایک اٹھتی اور سرے ہوئے شخص کی طرف ہاتھ بڑھا کر اور اسے مخاطب کر کے دنگلاز بنی کرتی۔ دیہات میں جب کوئی مرتا ہے تو اس کا مناسب نام کیا جاتا ہے اور گاؤں کے سب لوگ اس میں حصہ لیتے ہیں۔

ارد جب ہم شام کو اس کی میت کو اٹھائے دفنانے سے گئے تو ہر ایک کی آنکھوں میں آنسو تھے اور لبوں پر رنج و غم کے الفاظ سوائے ایک شخص کے۔ یہ اس کا تاتا رضی اکبر تھا۔ بوڑھے ضدی آدمی کی آنکھ سے ایک آنسو نہ بہا۔ میں اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس کی آنکھ کودی اور غالی تھی۔ وہ کھرے تنج لیجے میں موسم اور فصلوں کی باتیں کرتا رہا۔ ایک بار اس نے مجھ سے میری پڑھائی کے متعلق بھی پوچھا۔ ہاں جب میں نے شعیب ایزدی کا ذکر کیا تو وہ بھرپور اٹھا اور حقارت اور غرور سے عرض کیا "مشییت کا کرم ہمیشہ رضی اکبر کے گھر پر ہی ہوتا ہے"..... میں نے جانی لیا کہ اس کے لیے اب اس دنیا میں زیادہ دیر زندگی نہیں۔

خدا الرحمن خاموش ہو گیا۔ چاند کچھ بھیکا پرٹنے لگا تھا اور پہلے مرحلوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

اب یہ ایک آدمی کی زندگی کی کہانی ہے۔ میں نے حافظ عبداللہ کو اس دنیا میں آنے پر دیکھا اور مولوی کر اس کے کانوں میں کلمہ پڑھتے سنا۔ پھر وہ میری آنکھوں کے سامنے بچپن اور بلوغت کی منزلوں سے گزرا جس میں سے سب انسان گزرتے ہیں۔ وہ اس طرح بڑھا جیسے ایک بھول نہیں سے گتا ہے۔ وہ جوان ہوا اور جوانوں کی طرح ایک لڑکی کی چارست میں دیوانہ ہو گیا۔ میں نے اسے اس کی شادی کے وقت

چادر پائی پر کھڑے مسکراتے اور سلام کر مائی قبول کرتے دیکھا۔ میں نے اسے ایک ذرا دیر
 مرو بٹتے، گھر بساتے اور باپ بٹتے دیکھا اور پھر میں اس وقت بھی موجود تھا جب
 اسے سونہمی مٹی کے نیچے آرام کرنے کے لیے ٹایا گیا۔ سب آدمی ان سب
 منزلوں میں سے گزرتے ہیں اور آخر میں زمین ان کو اپنی کوکھ میں بلا لیتی ہے اور
 وہ سائیں کی طرح زندوں کی آنکھوں اور ذہنوں سے غائب ہو جاتے ہیں۔ ان کے
 سب خواب، ارمان پچھتاوے اور مستقبل کے ارادے ایک مشت خاک بن کر
 ہواؤں میں اڑ جاتے ہیں مگر ایک طرح وہ باقی رہتے ہیں — دوسرے انسانوں
 کے سینوں میں۔ اس میں بڑی سچائی ہے کہ سب آدمی ایک دوسرے کے دست و
 بازو ہیں۔ جب ایک مرتا ہے تو ہم سب اس کے ساتھ مرتے ہیں.....

پھر ہم پنج سے اٹھے اور اپنے اپنے خوابوں اور خیالوں میں کھوئے ہوئے
 ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے خاموش سڑک پر ہوسٹل کی صحت چل پڑے۔

(”فنون“ لاہور)

دس پیسے کے بارہ

آخر نثار حسن کاظمی ایم۔ اے کو نوکری مل گئی۔

نوکری کا پروانہ ملے تین دن ہو چکے تھے۔ اس کی والدہ بھلے کی عورتوں سے مبارکبادیاں وصول کر چکی تھیں اور نثار حسن کاظمی اپنا بستر باندھ چکا تھا۔ نوکری ملنے کی خوشی تو ضرور تھی لیکن آج کافی ہاؤس میں اس کی آخری شام تھی اور جب دوستوں کی مجلس برخلت ہوئی اور وہ گھر جانے کے لیے اٹھا تو اس کا بچہ چاہا کہ کافی ہاؤس کی کرسیوں میزوں سے لگے ملے۔ دودھ دیا رے لپٹ کر روئے۔ وہ دوستوں کے جوہ میں گھرا ہوا کافی ہاؤس سے یوں نکلا جیسے میکے سے وطن کی ڈول نکلتی ہے۔

دوست احباب رخصت ہوئے اور وہ اکیلا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا گھر کی طرف روانہ ہوا۔ سالہا سال سے اس کے قدم ہزار ہا مرتبہ این راستوں کو تپ چکے تھے۔ کرشن نگر، لانچ اور کافی ہاؤس این راستوں کا ہر درخت، بجلی کا ہر کھمبہ، سڑک کا ہر موڑ اس کا آشنا تھا۔ ————— اسکل سے نئی زندگی ہوگی نئے راستے۔ نئے لوگ، نیا کام۔

اس نے سوچا کیا ہوا جو شہر میں نوکری نہ مل سکی۔ اندھیرا تو گاؤں ہی میں ہے۔ اصلی پاکستان تو انہیں دیہات میں بستہ ہے۔ پاکستان کو ترقی کرنی ہے تو سب سے پہلے

تو گاؤں میں روشنی پھیلانی پڑے گی۔ وہ بھی سوچتا ہوا اڑے دفتر کے قریب سے گزر کر کرشن نگر کی طرف مڑ گیا۔ اس کا اصل وطن قراہ کرشن نگر ہی تھا۔ انھیں گلیوں میں کھیل کر بچپن گزارا اور وہیں جوانی مائی۔ بریلی کی تو شاید ہی کوئی یا اس کے حافظے میں محفوظ ہو۔ اور ہر ترقی بھی کیسے۔ وہ قراہی چوتھے درجے میں پڑھتا تھا کہ اس کا خاندان بریلی سے اٹھ کر پاکستان آ گیا۔ اس کے والد بریلی کی کچھری میں پیشکار ہوتے تھے۔ اب انھیں لاہور کی کچھری میں نوکری مل گئی اور وہ لوگ کرشن نگر میں گھولناٹ کر کر رہیں گے جو رہے۔ گھر میں تو اردو بول جاتی تھی مگر شارحی خواجھی خاصی پنجابی بولنے لگا تھا لیکن پھر بھی کبھی کبھی کوئی فصیح پنجابی بولنے والا ایسا لفظ بول جاتا کہ شارحی کی ترکی تمام ہو جاتی اور وہ ششدر اس کا منہ دیکھتا رہ جاتا۔

ایم۔ اے تک پہنچتے پہنچتے اسے محنت کی اچھی خاصی عادت پڑ گئی تھی خاندان کی مالی حالت بہت خوشحال کسی نہ ہر ملکی اس۔ لیسا سکول کالج کی پڑھائی کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی بیچ بیچ میں ملازمت کرتا رہا کبھی ٹھکے میں کسی امیر آدمی کے لڑکے کی ٹیوشن پڑھا دی۔ کبھی اخبار میں ترجمے کا کام کر دیا۔ لیکن اب ایم۔ اے کے بعد تو اسے مستقل ملازمت کی تلاش تھی۔ چنانچہ اس نے ریڈیو پاکستان، انکم ٹیکس، خاندانی منصوبہ بندی، کسٹم اور محکمہ آبکاری میں درخواستیں دے دیں اور آخر کار نصیب محکمہ خاندانی منصوبہ بندی میں گھلا اور اسے ایک معقول تنخواہ پر اس ٹھکے میں ملازمت کی پیش کش ہوئی۔ وقت صرف یہ تھی کہ ملازمت دیہات کی تھی لیکن اس کے علاوہ چارہ بھی کیا تھا۔ اس نے دل کو سمجھایا اور اپنی نئی ملازمت پر روانہ ہو گیا۔ ملازمت کا پہلا پڑاؤ ضلع کا صدر مقام تھا۔ لاہور سے قدریں ضلع میں اسے

کام کرنا تھا اس کے صدر مقام پر تمام نئے بھرتی ہونے والے افسروں کو بھرتی کیا گیا تاکہ دیہت میں بھیجنے سے پہلے خدا کی مناسب تربیت کی جائے۔ پہلا ایک پھر ضلع کے ڈپٹی کمشنر نے دیا جس میں اس عظیم کام کی اہمیت واضح کی گئی جو یہ سب نوجوان شروع کرنے والے تھے۔ اس مسئلے کو ملک کے لیے بہت جلد چیلنج قرار دیا گیا اور ان نوجوانوں کے دلوں میں اس کام کی عظمت اور اہمیت کے چراغ روشن کیے گئے۔ حکومت ان کے کام کی پشت پناہی کرے گی۔ کھڈوں روپے کا بجٹ اس کام کے لیے مخصوص ہو چکا ہے۔ ان کے کام پر اس ملک کے مستقبل کا دارو مدار ہے۔ آنے والی نسلیں صحت مند، ذہین اور ذمہ دار ہوتی چاہئیں۔ ضلع کے ڈپٹی کمشنر واقعی گفتار کے غازی تھے پہلے لیکچر ہی میں ان نوجوانوں پر جا دو کر گئے اور اس تقریر کے بعد جب انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو محسوس ہوا کہ ہر شخص اپنا پ کو عظیم کام کے لیے میدان سپر کرنے پر پوری طرح آمادہ ہے۔ پھر دو ہفتے تک ان کی تربیت ہوتی رہی۔ ڈاکٹروں اور جنسیات کے ماہروں کے لیکچر۔ علم البدن کے پروفیسروں کے لیکچر، بچوں کی پیدائش اور افزائش نسل پر لیکچر۔ مائع حمل، تلایہ پر لیکچر۔ آبادی اور اقتصادیات پر لیکچر۔ وہی معاشرت اور خاندانی منصوبہ بندی پر لیکچر۔ عرصہ تک یہ دو ہفتے علم کی گھاگھی اندھے ساتھیوں کے میل جول میں گزر گئے۔ کچھ ایسی مصروفیت رہی کہ لاہور اور لاہور والوں کا کچھ خیال نہ آیا۔ نئے کام کی تربیت مکمل ہو چکی تو ان کے تبادلوں کے احکام آگئے اور مدہی روز میں نوجوانوں کا یہ گردہ چڑیوں کے چنبے کی طرح اڑ کر منتشر ہو گیا مثلاً جس کاظمی کی تعیناتی ضلع کے صدر مقام سے ستر میل دور ایک گاؤں میں ہوئی جس کا

نام تعارکھاں والا۔

مشرقیل کا یہ سفر کوئی چھ گھنٹے میں طے ہوا اس لیے کہ دس میل کے بعد کچی
سڑک شروع ہو جاتی تھی اور اس سڑک پر ہر روز کاری کے آنے جلتے سے سڑک کی
مٹی پیسے ہوئے باریک میدے کی طرح ہو گئی تھی۔ جلدی کے ٹائرا اس میں دھستے
چلے جاتے تھے۔ پھر سڑک میں گڑھے بھی تھے مگر لاری ڈرائیور کسی نہتہ مشت حرج
کی طرح جو ساملی چٹانوں سے بچا کر کشتی کو چھوٹے چھوٹے جزیروں تک پہنچاتے
ہیں، لاری کو کمال احتیاط سے ان گڑھوں سے بچاتا ہمارکھاں والا کی طرف لیے
جبار تھا۔ لاری کی سفرز آیا دیں میں تھانے کا ایک سپاہی، ایک چھوٹے سے طرے
والا زیندار جس نے گلے میں پستول لٹکا رکھا تھا اور ڈائرسن کاٹھی تھے۔ باقی آبدی
عام دیہاتی عقیدوں اور مردوں کی تھی۔ راستے میں دو تین مقام ایسے بھی آئے جہاں
لاری نے اطمینان سے ٹک کر آرام کیا۔ یہ راستے کے چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے
جہاں بچوں نے گڑوالے چنے، عورتوں نے بامی پکوڑے اور میٹھلے مالے
زیندار نے کھوئے کے پیڑے خریدے جن کا رنگ سفید سے پیازی ہو چکا تھا
اور اُس نے جیب سے پیسے نکالتے ہوئے دوکاندار سے کہا: ”اوٹے بدینت
لکھیاں تو جھلیا کر“۔ زیندار جس کاٹھی نے بڑے درخت کے نیچے لگے ہوئے
جینٹل پیسے نکال کر پانی پیا اور لاری پھر چل پڑی۔

کوئی دو گھنٹے بعد زیندار جس کاٹھی نے لاری میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف
نظر اٹھائی تو اسے محسوس ہوا کہ ان کے اندر حال ان کے چہرے کیسے تبدیل ہو چکے
ہیں۔ تازگی، جو سفر کے شروع میں چہروں پر تھی اب غائب ہو چکی تھی۔ گرد کا

ایک دیو سبیل ہو لایا تھا کہ لاری کے ساتھ ساتھ اڑتا چلا جا رہا تھا اور دونوں طرف کی جھاڑیوں اور درختوں کو آندھی کی طرح اپنی لپیٹ میں لیتا چلا جا رہا تھا۔ شار حسن کاظمی ایم۔ اے فیمل پلاننگ آفیسر رکھان مالاہر لخط اپنی منزل کے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔

رکھان مالاہر دیک کے کنارے ایک چھوٹے سے ٹیلے پر آباد تھا۔ شار حسن کاظمی نے پتھروں سے گرہلی تھیں جھاڑتے ہوئے بے تابی سے چاروں طرف دیکھا۔ مسافر لاری کی چھت سے اپنا اپنا سامان اتار رہے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے گھڑیاں سروں پر رکھے گاؤں کی گلیوں میں گم ہوتے جا رہے تھے۔ ایک شخص نے اندازے سے پوچھتے ہوئے اس سے کہا۔ ”آپ خانمانی منصوبہ بندی ...“

جی ہاں جی ہاں شار حسن کاظمی کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے اسی ایک لفظ سے رکھان مالاہر کی ساری اجنبیت ختم ہو گئی۔ ”تو پیلیے میں آپ ہی کو لیٹے آیا ہوں۔ میں یونین کونسل کا سیکرٹری ہوں۔“

شار حسن کاظمی اس کے ساتھ ہویا۔ لاری کے اڈے کے ساتھ ہی ایک جوہڑ تھا جس کے بند پانی پر گہری سبز کافی کی تہہ جم گئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ کوڑے لڑکٹ کے ڈھیر تھے جن پر مرغیاں چو نہیں مارا کر کوڑے کو چاروں طرف پھیلاتے ہیں مشغول تھیں۔ اس کے ساتھ گاؤں کی مسجد تھی اور پھر پرائمری سکول تھا جس کی محراب پر جلی حروف میں لکھا تھا۔ ”ہر کہ خدمت کرد او نخدم شد“ باہر کے دروازے پر خوش آمدید لکھا تھا مگر بارش کی وجہ سے اس طرح پڑی تھی کہ ”آ“ مل گیا تھا اسباب صرف ”خوش آمدید“ باقی رہ گیا تھا۔ جس دہستے پر وہ چل رہے

تھے وہاں سے چھوٹی چھوٹی ٹیرھی میڑھی گلیاں گاؤں کے اندر چلی گئی تھیں جن کے دونوں طرف مٹی کے کچے مکان تھے جن میں بعضوں کی دیواریں پوتی گئی تھیں مگر اکثر گھروں کی دیواریں لیمپ پوت کی محتاج تھیں۔

نثار حسن کاظمی کے میزبان نے اس سے کہا: ”اچھا ہے آپ گاؤں کے باہر ہی رہیں گے۔ ہم نے یونین کونسل کے دفتر ہی میں آپ کی رہائش کا انتظام کر دیا ہے۔“ یونین کونسل کا دفتر گاؤں کے پرانے مندر کی عمارت میں واقع تھا۔ بندھنوں کے چلے جانے کے بعد سے اب تک یہ مندر اور اس کے ملحقہ کمرے دیباں ٹپے تھے۔ شروع شروع میں ہتھک اور حصار کے مہاجر میاں آکر ٹھہرے تھے مگر جب ان کو قریبی موضع میں زمینیں الاٹ ہو گئیں تو مندر پھر دیباں ہو گیا۔ اب یونین کونسل نے اس کی مرمت کرا کے یہاں اپنا دفتر قائم کیا تھا۔ اس عمارت کے ایک مختصر سے کمرے میں نثار حسن کاظمی کی رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس کو ٹھوڑی میں ایک چارپائی تھی۔ ایک ٹمکتہ سی کرسی تھی اور ایک میز پر لائیں رکھی تھی۔ یونین کونسل کے سیکرٹری نے نثار حسن کاظمی کی طرف تھیں طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا: ”آپ ٹھہرے آ رہے ہیں۔ ہم نے آپ کے آرام کا ہر طرح سے خیال رکھنے کی کوشش کی ہے۔ امید ہے آپ کو اچھا کرہ پسند آئے گا۔“ نثار حسن نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ یہ کہتے ہوئے رخصت ہوا۔ ”اب آپ آرام کریں۔ شام کا کھانا تو میں آپ کے لیے لاؤں گا اور کل صبح آپ کا کوئی بندوبست کر دیں گے اور مل جل ہمارے چیئر میں صاحب بھی آپ سے ملنے آئیں گے۔ آج وہ پارکے ایک گاؤں میں گئے ہوئے ہیں۔“

نثار حسن کاظمی کا بستر چار پائی کی پائنتی پڑا تھا اور وہ اس سے ٹیک لگائے چھت
 کی کڑیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شام کا جھپٹا ہو چلا تھا اور سورج دریا کے دوسری
 طرف وہ خٹوں کا اوٹ میں چھپنے لگا تھا۔ نثار حسن کاظمی جیسے گھرے خواب سے جاگ
 کر اٹھا اور مندر کی عمارت سے باہر نکل آیا۔ اس نے صدر دروازے پر لگا ہوا
 بورد پڑھا۔ "دفتر یزین کو نسل مکان والا" اور پھر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا
 دریا کی طرف نکل گیا۔ صدر حد نظر تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ پنج پنج ہی سیم اور
 مقور کی لکائی ہوئی بھر بھری سفید سفید مینیں تھیں۔ سر پر آسمان کی چھت تھی اور
 دور دور تک کوئی چیز نظر میں شامل نہ ہوتی تھی۔ ہر شے خاموش تھی "خاموش اور
 ساکت۔ دریا کا پانی بھی انتہائی خاموشی سے بہہ رہا تھا اور ہر شے آہستہ آہستہ
 سرسبز اندھیرے میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ قند ٹیلے پر گاؤں کی مسجد کے منار اور پھیلے
 ہوئے کوٹھے ایک گھرے عباد میں چھپتے جا رہے تھے اور خاموشی جز نثار حسن کے
 دل کے اندر تھی اور اس کے باہر تھی اسے ایک عجیب طرح کا سکون پہنچا رہی تھی
 جیسے جدائی کے زخموں پر مرہم کا کام کر رہی ہو۔

لگے روز یزین کیسٹ کا چیرمین نثار حسن کاظمی سے ملنے آیا۔ اُد پر ملل کا ڈھیلا
 ڈھالا آستین کا کرتا۔ نیچے نیلے رنگ کا تہد، سر پر چھوٹا سا چنگا جو اس طرح بانڈھا
 گیا تھا کہ اس کے تیل لگے ہوئے پٹوں کی چمک پر عادی نہ ہو سکتا تھا۔ مرنچیں جن کے
 سروں کو تادے سے گردا سا اوپر کی طرف اٹھا دیا گیا تھا اور سر پر تیل لگانے کے
 بعد ہی ہاتھ موٹھوں پر بھی پھیر دیا گیا تھا۔ عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان گھٹنی
 کا رنگ سفید جو مندر کے بیرونی صحن میں پیڑ سٹکے بانڈھ دی گئی تھی۔ چیرمین کے

خسے سے پہلے گاؤں کے کافی لوگ کیٹی کے دفتر میں پہنچ چکے تھے۔ یہ سب لوگ ملاقات کے مقصد تھے۔ میزدار، یونیورسٹی کے لبریری کے رکھ، جو دھری اور ملاقات کے با اثر لوگ جن سے شارح حسن کاظمی کا تعارف کرایا گیا اور اس سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے کام اور اپنے فرائض کے متعلق انہیں تفصیل کے ساتھ کچھ بتائے۔ اب شارح حسن کو اس طرح کی تقریر کرنے کا موقع مل گیا جس طرح پہلے دو ڈپٹی کمشنر صاحب نے کی تھی۔ گاؤں کے لوگ خاموشی سے اس کی تقریر سنتے رہے مگر اس کو حیرت تو اس بات پر ہوئی کہ تقریر کے بعد جو سوال پوچھے گئے ان میں سے بیشتر کا تعلق اس کے کام سے نہ تھا مثلاً آپ کی ذات کیا ہے؟ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ کس خاندان سے آپ کا تعلق ہے؟ صاحب ہیں یا مقامی؟ تعلیم کتنی ہے؟ شادی ہو چکی ہے یا نہیں؟ اور جب یہ میٹنگ ختم ہو گئی اور مجمع آپس میں گھل مل کر منتشر ہو گیا تو ایک فقرہ جو شارح حسن کاظمی نے دے دیا۔ بے لفظوں میں دو تین مختلف لوگوں سے ملتا تھا کانسٹی کے تھال کی طرح اس کے ذہن میں جھنجھٹا رہا۔ ”پرچی جو دھری صاحب جو روح دنیا میں آئی ہے اسے بھلا کون روک سکتا ہے۔ قدرت کے کارخانے میں کس کا دخل ہے؟“ اور اسے یوں لگا جیسے یہی فقرہ اس کے سامنے کی سب سے بڑی کھائی ہے یا تو وہ خود اس میں گر جائے گا یا سمت اچھی ہوئی تو اسے پھلانگ کر نکل جائے گا۔

اپنی ہدایات، تربیت اور حیرتوں کے شہر سے سے شارح حسن کاظمی نے باتامنگ سے اپنا کام شروع کر دیا۔ سب سے پہلی ضرورت تو یہ تھی کہ لوگوں کو اس کام کی اہمیت سے آشنا کیا جائے اور پھر اس کام کے پرچار کے لیے کام کرنے والوں کا

ایک پناہ دہستہ گاؤں کی آبادی پر چھوڑ دیا جائے جو ہر شاوی شدہ مرد اور عورت کو خانمانی منصوبہ بندی کے فوائد سے آگاہ کرے۔ شارح حسن کاظمی کی تربیت اور علم کے مطابق دیہاتی آبادی کے دو گروہ ایسے تھے جن کی صفت آرائی اس سلسلے کا اولین کام تھی۔ ایک گاؤں کی مائیاں اور دوسرے گاؤں کے حکیم۔ چیرمین کے افضیات کو استعمال میں لا کر یونیس کونسل کے سارے علاقے کی مائیوں کو طلب کر لیا گیا اور شارح حسن کاظمی نے ان کی تربیت کا باقاعدہ آغاز کیا۔ آج ان کا پہلا لیکچر تھا۔ پانے مند کے بڑے کمرے میں جہاں آٹھ سے بربع صدی پہلے تک محرومی اور بدبودار پتھروں کی پرچا ہوتی تھی، آج شارح حسن کاظمی نے ایک نئی تدریس کی ابتدا کی۔

اس کے سامنے پچیس مین دیہاتی عورتیں بیٹھی تھیں۔ جن میں بیشتر اچھڑ عمر کی تھیں۔ کوئی کوئی ڈھلتی جوانی کی تھی۔ جس نے جوانی میں بیوہ اور بے سہارا ہو کر دائمی کام شروع کر دیا تھا۔ چہرے عمر سے سب کی سب تجربہ کار اور کچی پیرھنیں معلوم ہوتی تھیں۔ شارح حسن کاظمی عجب غصے میں گرفتار تھا کہ بات کا آغاز کیاں سے کرے۔ سب سے پہلے اُس کے منہ سے نکلا۔ ”بھلا اور بی بیوہ پھر خاموشی چھا گئی پھر اُس نے سوچ کر کہا۔ ”میں اُسی کام کے متعلق آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں جو آپ برسوں سے کر رہی ہیں یعنی بچے کی پیدائش۔“ اس فقرے کے بعد جیسے شارح حسن کاظمی اپنے موضوع پر قائم ہو گیا اور اس نے پورے وثوق اور علم کے ساتھ اپنی تقریر جاری کر دی۔ زمین کی گھٹی ہوئی پیداوار اور ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی۔ لمبے چٹے خاندان کی مصیبتیں۔ تعلیم کی ضرورت، اقتصاد کی بد حالی اور خوش حالی کی وجوہات، مختصر کہنے کے فوائد غرضیکہ ایک دیرپا تھا جو آہستہ دہی سے بتا چلا

جابر ہاتھ اور دیہات کی یہ دایاں بربرس دایاں سے اس علاقے کی آبادی میں اضافہ کے خوش ہوتی اور مبارکبادیاں وصول کرتی چلی آئی تھیں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھیں کہ ان کے بظاہر نیک کام کے کیسے خطرناک نتائج نکل سکتے ہیں۔ پھر اس نے گریزی انداز اپنی تقریر کا رخ آبادی کو کم کرنے کے لیے امتیاطی تدابیر کی طرف موڑ دیا۔ مائع حمل تدابیر سے پہلے ضروری تھا کہ وہ بچے کی پیدائش اور افزائش نسل کی ابتدا کا تذکرہ کرے چنانچہ اس نے طرح طرح کے چارٹ منبھال کر سامنے لٹکا دیئے یہ دیکھئے نسل انسانی کا آغاز اس ایک جرثومے کے دوسرے جرثومے سے طاپ کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس نے لمبی سی چھڑی اٹھا کر ایک چارٹ کی طرف اشارہ کیا۔ اس نقشے میں عورت کا جسم اور ابھی وہ فقرہ پورا بھی نہ کر پایا تھا کہ اس نے دیکھا کہ سامنے بیٹھی ہوئی دونوں عورتوں نے اپنے دوپٹے کاٹو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا اور دوسری صفت میں بیٹھی ہوئی تینوں عورتیں چارٹ پر سے نگاہیں ہٹا کر دیوار کی طرف دیکھنے لگیں پچھلے سے ایک عورت کی دلی ہوئی آواز ”ہائے ہائے میں یہ ڈاکٹر کیسی بے شرمی کی باتیں کر رہا ہے۔“

کمرے کی فضا میں اب ایک ایسا کھچاؤ پیدا ہو گیا تھا کہ تقریر جاری رکھنا مشارع کاظمی کے لیے مشکل ہوتا جا رہا تھا اور قریب تھا کہ وہ گہرا کرکڑی پر بیٹھ جاتا گہرا سے اپنی تقریر کو کیسے لے ایک اور سارے کا خیال آیا۔ اس نے پھر کہا۔ ”بہنو اور بیٹو! مجھے انسوس ہے کہ جو کام آپ ساری عمر کرتی رہی ہیں اس کے بیان پر آپ کو خواہ مخواہ ہچکچاہٹ ہو رہی ہے مالا لکہ آپ سب خدا کے فضل سے مسلمان ہیں اور آپ نے سن رکھا ہے کہ شرع میں مشرم نہیں ہوتی۔ یہ اگر

ایسا ہی مضمون ہوتا تو خدا کے کلام اور رسول اللہ کی احادیث میں بچے کی پیدائش کا ذکر نہ ہوتا۔ آپ جانتے ہیں کہ افزائش نسل تو ایک اعتبار سے خدا رسول کے حکم کی بجا آمدی ہے۔ اب کمرے کی فضا میں پھیلا ہوا کھچاؤ ٹوٹ گیا۔ آنکھیں پپر پڑتے ہوئے دوپٹے نیچے گر گئے، دیوار پر لگی ہوئی نظریں واپس چارٹ پر پھلکیں اور پھیل دیو سے ایک بڑی عمر کی دائی کی آواز آئی جو اپنے قریب بیٹھی ہوئی عورت سے مخاطب تھی۔ "اٹھیے ڈاکٹر ٹیکسہم ہی تو کہتا ہے شرع کے آگے کیا شرم جو چیز تم ساری عمر دیکھتی رہی ہو اس کی تفسیریں دیکھنے میں کیوں شرماتی ہو؟"

خدا خدا کر کے شاد حسن کاظمی نے اپنی تقریر ختم کی اور دائیوں کو اگلے روز صبح نو بجے دوسرے لیکچر کے لیے آنے کی ہدایت کر کے وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

پودے، اشارہ، دل، دائیوں کی تربیت پر صرف ہوئے۔ شاد حسن کاظمی کا کام آسان نہ تھا۔ صدیوں کے قہر مات اللہ کے دلوں سے دُور کہنے تھے صرف علم ہی کافی نہ تھا۔ کوشش یہ تھی کہ وہ اس کام کی اہمیت سے واقف ہو جائیں اور اس کے اچھا اور ضروری ہونے پر ایمان لے آئیں۔ سب سے بڑی وقت یہ تھی کہ اگر وہ خالص علمی انداز سے گفتگو کرتا تو وہ بیزار ہو کر بے تعلق ہو جاتیں اور اگر وہ انہیں ذرا ڈھیل دیتا تو وہ ایسی کھل کر باتیں کرنے لگتیں کہ کلاس روم کی گفتگو اور فقرے بازی بے حیائی کا نمونہ بن جاتی۔ ایک روز جب وہ نہایت علمی اور صاف علمی انداز میں مراد و عورت کے احتلاط کے وقت احتیاطی تدابیر کا ذکر کر رہا تھا تو ایک دائی نے ہنس کر کہا: "ڈاکٹر جی آپ کی تو شادی بھی نہیں ہوئی، آپ کو یہ باتیں کیسے معلوم ہو گئیں؟" اور اس پر سب کی سب اس طرح کھلکھلا کر ہنسیں کہ شاد حسن کاظمی

کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔

ہن سب مشکلات کے باوجود وہ خوش تھا کہ اُس کے کام کو آگے بڑھانے والا یہ میسر و دستہ آہستہ آہستہ کام کی اہمیت سے واقف ہوتا جا رہا تھا۔
 مانع حمل دواؤں اور احتیاطی تدابیر پر اُن کو مفصل یکپہلو دیئے گئے تھے اور شارح حسن کاظمی کو یقین تھا کہ جب یہ عورتیں تربیت مکمل ہونے پر سارے علاقے کے گھروں میں پھیل جائیں گی تو گویا اس علاقے میں خاندانی منصوبہ بندی کا پہلا موڑ چہ قائم ہو جائے گا۔

خاندانی منصوبہ بندی کا دوسرا موڑ چہ علاقے کے مقامی طبیب، حکیم اور سیانے تھے۔ چیئر مین نے یونین کو نسل کے سارے ممبروں سے کہا کہ اپنے اپنے علاقے کے حکیموں کی فہرستیں اسے بھیج دیں۔ یونین کمیٹی نے تمام حکیموں کو خط لکھ کر اپنے دفتر میں بلا لیا اور مقررہ روز سارے علاقے کے حکیم گھوڑوں پر سوار دفتر میں پہنچ گئے۔ قریبی مواصلات کے حکیم پیدل چل کر بھی آئے۔ غرضیکہ اچھا خاصا مجمع ہو گیا۔ شارح حسن کاظمی کو اپنے دعوت ناموں کا یہ رد عمل دیکھ کر انتہائی خوشی ہوئی۔ وہ ہنس ہنس کر ہر ایک سے ہاتھ ملاتا۔ اس کا نام یہ اپنے رجسٹر میں درج کرتا اور انہیں اپنے کام میں شریک کرتا جاتا۔ حکیموں کا کام دائیوں کی نسبت زیادہ آسان تھا۔ دایاں تو دراصل ایک طرح کی فضیلت کا لم تھیں جنہیں حکیم حضرات میں گھس کر بغاوت پھیلاتا تھی مگر حکیم تو میدان جنگ تک گور بارود سپلائی کرنے والے دھتے کا کام کرنے والے تھے اور پھر اس خدمت کے لیے اقتصادی مفادات

اگ تھے۔

نثار حسن کاظمی نے علاقے کے تمام حکیموں کو سمجھا دیا کہ یہ کار خیر ان کے تعاون کے بغیر نہ ہو سکے گا۔ احتیاطی تدابیر کے لیے لاکھوں روپے کا سامان دیہاتوں میں بھیجا جا رہا ہے۔ اس کی فروخت آمد تقسیم کا کام حکیم صاحبان کو سنبھالنا پڑے گا۔ پھر نثار حسین کاظمی نے اپنا بکس کھولا۔ ”یہ دیکھئے اس ڈبیا میں جھاگ والی گولیاں ہیں اور میں گولیوں کی قیمت صرف چار آنے سے اور یہ بھی ربڑ، دس پیسے کے بارہ۔ شہر سے یہ چیز خریدیں تو آپ کو صرف ایک کے تمام آٹھ دس آنے پڑیں گے لیکن سرکار کی مہربانی ہے کہ آپ لوگوں کی مالی حالت کو مد نظر رکھتے ہوئے انہوں نے اتنی کم قیمت مقرر کی ہے، یعنی دس پیسے کے بارہ۔ میری گزارش ہے کہ آپ ان مددوں چیزوں کا شاکی اپنی اپنی دکانوں پر رکھ لیجئے اور ضرورت مندوں کو سپلائی کیجئے مددوں احتیاطی تدبیروں میں سے اگر ایک کا بھی استعمال کر لیا جائے تو کافی ہے۔“

تقریر کا یہ حصہ سس کر حکیموں کے چہروں پر دلچسپی کی کوئی خاص لہر نظر نہ آتی تھی بلکہ وہ چیر میں کی طرف ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے خاموشی سے اس کو کہہ رہے ہوں کہ آپ نے آخر ہم کو کیا سمجھ رکھا ہے۔ کیا اب ہم سے ایسے کام لیے جائیں گے۔

اب نثار حسن کاظمی نے تڑپ کا پتہ بھید نکالا۔ ”جناب حکیم صاحبان اس کار خیر میں شرکت کے لیے ہم آپ کی تنویدی بہت مالی امداد بھی کریں گے حکومت نہ صرف اس ملک کی بستی اور خاندانی منصوبہ بندی کی کامیابی میں دلچسپی لے رہی ہے

بلکہ آپ کی مالی بہبود بھی اس کے پیشِ نظر ہے۔ طریقہ اس کا یہ ہو گا کہ آپ ہمارے پاس سے اگر دس روپے کا مال خرید کر اپنے پاس رکھیں گے تو اس کو بیچ کر ہیں صرف پانچ روپے واپس کر دیں گے باقی پانچ اپنی خدمات کے عوض منافع کے طور پر اپنے پاس رکھ لیں گے۔

اب معزز حکیم صاحبان کی دلچسپی خاندانی منصوبہ بندی میں خزانوں تر ہونے لگی اور ہر طرف سے اس تجویز کو فروغ آمیزہ کہنے اور اس کی کامیابی کے لیے مزید تجویز پیش کرنے کی پیش کش شروع ہو گئی۔ ایک حکیم صاحب نے فرمایا کہ مسجد کے خطیبوں سے بھی اس کارِ خیر میں شرکت کرنے کے لیے کہا جائے لیکن شارس کاظمی نے اس کی حاشیہ زبہری۔ پرائمری اسکولوں کے مدرسوں کے متعلق خیال یہ تھا کہ جہاں تک اسکولوں کے اندر کا سوال ہے وہاں تک ان کا دائرہ عمل بچوں تک محدود ہے اسکول سے باہر البتہ اگر وہ چاہیں تو نئے خیالات کی ترویج میں کافی اہم کردار ادا کر سکتے ہیں بعض حکیم صاحبان نے ان احتیاطی تجاویز کو حفظانِ صحت کے لیے بھی مفید قرار دیا اور جب ان اشیاء کو اپنی دکان پر اشاک کرنے کا وقت آیا تو معلوم ہوتا تھا ہر شخص دوسرے سے باری لے جاتا چاہتا ہے۔

شارس کاظمی نے کہا: ”جناب حکیم صاحبان سرکار کا حکم یہ ہے کہ میں پانچ روپے نقد لے کر دس روپے کا مال آپ کو دے دوں۔ یہ دس روپے کا مال بذاتِ خود چالیس پچاس روپے سے کم نہیں یہ تو صرف دیہات کی مالی حالت اور نئے خیالات کو عوام تک پہنچانے کے لیے ایسے کم داسوں پر آپ کو دیا جا رہا ہے لیکن آپ کے چیرمین صاحب آپ پر مزید مہربانی کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال

ہے کہ آپ میں سے جو صاحبان ہم کو یہ حلف نامہ لکھ دیں کہ وہ دس روپے کا مال ہم سے وصول کر رہے ہیں اور اس کو فروخت کر کے ہم کو پانچ روپے واپس کر دیں گے اور پانچ روپے خورد کھ لیں گے اُن کو مال فی الحال بغیر قیمت وصول کیے دے دیا جائے اور قیمت صرف اسی وقت وصول کی جائے جب مال فروخت ہو جائے۔

اب حکیم صاحبان نے جھاگ والی گولیاں اور ریڑ اس ذوق و شوق سے حاصل کرنے شروع کیے جیسے کچھ دار تاجر منڈی میں عام سستے دیکھ کر زیادہ سے زیادہ مال خریدتا ہے۔

اب دوسرا سوچ بھی قائم ہو چکا تھا۔ شارحین کاظمی نے اپنی کارکردگی کی ممانہ زبردست اپنے انصراف بالا کو بھین شروع کر دی۔ وہ اُس کے کام سے خوش تھے اور وہ بھی اپنی کامیابی سے مطمئن تھا کبھی کبھی دیہات کی دایاں اس کے دفتر میں آکر اسے اطلاع دیتیں کہ کیسے ابتدائی ممانعت کے بعد گھروں میں مٹی چولے کا کام کرنے والی عورتیں اب ان کی باتوں پر کان دھرنے لگی ہیں اور کبھی کبھی وہ خود اپنے علاقے کے دیہات میں آئی حکیموں کی دکانوں کا دورہ کرتا اور خداؤں سے گشگو کے اپنے کام کے متعلق نتیجہ نکالتا۔ جب وہ اپنے دیئے ہوئے مال کی قیمت فروخت اُسی سے وصول کرتا تو اس کا دل باغ باغ ہو جاتا کہ حق بھگتا پانچ رہا ہے اور دایاں جو اس ہم کے ہر اہل دستے کا کام کر رہی ہیں نئے خیالات پھیلا کر حکیموں کے مال کی بکری کے راستے کھول رہی ہیں۔

شارحین کاظمی کے انصراف کے کام سے خوش تھے اور اُس کو ہدایات اور پی

تھیں کہ اب ... اپنے علاقے میں اگلا قدم اٹھائے اور قریبی شفا خانے سے مل کر احتیاطی مریدانہ آپریشن کے لیے بھی رضا کار مہیا کرے اور اگر ہو سکے تو اپنے علاقے کی عورتوں میں زیادہ مستقل احتیاطی تدابیر کو عام کرنے کی کوشش کرے لیکن نثار حسن کاظمی ابھی اس کے لیے تیار نہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اُسے ان کاموں کے لیے کس قدر سخت جنگ لڑنی پڑ رہی ہے۔ گاؤں والے ابھی تک اسے ایک باہر سے آئے ہوئے جنسی کی طرح مٹتے تھے۔ گاؤں کی زندگی اور طور طریقوں کو اختیار کرنا اس کے لیے آسان نہ تھا لیکن اس کے باوجود اُس نے اپنے اوپر جبر کر کے اپنے اندر دیہاتی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ گاؤں والے نہ اس کی عزت کرتے تھے نہ اس سے ڈرتے تھے محض اس لیے کہ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے پاس دراصل کوئی سرکاری اختیارات نہیں ہیں۔ ایک دن ایک دیہاتی نساء سے پوچھا تھا۔ ”ڈاکٹر جی یہ ٹھیک ہے کہ آپ نے سول جمائیں پڑھی ہیں۔“

اس نے کہا یہ درست ہے تو دیہاتی بے ساختہ بولا۔ ”پھر بھی آپ کو تحصیلدار کی نہ ملے؟“ نثار حسن نے کہا۔ ”ہاں مگر میں نے تو تحصیلدار کی کوشش ہی نہیں کی۔“ مگر دیہاتی نے فوراً کہا۔ ”یار ڈاکٹر تحصیلدار کی نہیں جتنی تھی تو گنہ گاری کیلئے۔“ نثار حسن کاظمی جب میر کے لیے نکلتا تو گاؤں کی عورتیں جو سامان واپس لے کر گاؤں کے سامنے بغیر گھونگھٹ نکلتے اور صرے اور پھرتی رہتیں اُسے دیکھ کر فوراً گھونگھٹ بجنے لگتیں اور نثار حسن کو احساس ہوتا کہ ... اس گاؤں میں باہر والا ہے۔ گاؤں والے اس کے پاس آکر یونیورسٹی کے چیرمین کو لاکھ لاکھ گالیاں دیتے

اُسے شکیت اور دستگیر کہتے لیکن جیب اُس کے سامنے آتے تو اس کی خوشامد بھی کرتے۔ اُس کے پاؤں بھی چھوڑتے اور گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے محض اس لیے کہ اس کے پاس اختیارات تھے۔ وہ بے لیس سے نفرت کرتے مگر قتلے کا ایک سپاہی بھی نگر گاؤں میں آجاتا تو گاؤں کا ہر شخص مذہب ہو کر اس سے بات کرتا۔

آہستہ آہستہ شہر میں کانٹلی پراس کائنات کے اسرار و رموز کھلنے لگے تھے اور وہ سوچتا تھا وہ یہ بات میں کام کرنا کسی شہر والے کے صبر اور ذہانت کا آخری امتحان ہے لیکن اسے ایک بات کا ہمیشہ سہارا رہتا تھا اور وہ یہ تھی کہ اُسے اپنے کام کی اہمیت اور ضرورت پر ایسا قہر تھا کہ اُسے یقین تھا کہ وہ جو کام کر رہا ہے اس میں اُس کے ملک کی بھلائی ہے اور بھی وجہ تھی کہ وہ اس زندگی کی ہزار مصیبتیں برداشت کر رہا تھا اور اُس نے گاؤں کی زندگی کی آداسی کو بھی برداشت کر لیا تھا جو گھس کی طرح اُس کی روح کو کھائے جا رہی تھی۔

گیہوں کے کھیت سے بھرے بھورے ہو کر کھٹے شروع ہو گئے تھے اور فضا میں گرمی اور آداسی پھیلنے لگی تھی۔ فصلیں کھٹے لگ چکیں اور درگاہوں اور مراہوں پر عرس اور میلے لگنے شروع ہو گئے تھے۔

شہر میں کانٹلی پراس کو نسل کے صحیح میں روخت کے نیچے بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا کہ ساتھ کے گاؤں کا نمبر دار اس کے پاس آیا اور ملازمت کے لیے اس سے کچھ باتیں کرنے لگا۔ باتیں کرتے کرتے ایک دم اُس کی آواز میں غصہ بڑھنے لگا اور وہ اونچی آواز میں بولا۔ دیکھئے میں آپ کو بتا رہا ہوں سدا گاؤں

ٹانگیں لے کر آپ کے اُس حکیم پر ٹوٹ پڑے گا اور اُس کا سر توڑ دے گا۔ آخر
بے شرمی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے ؟

نثار حسن نے بنزداد کو تسلی دی اور بار بار یہ کہا آپ گھبراہٹے نہیں میں خود آکر
اس کی تحقیق کروں گا۔ آج ہی تحقیق کروں گا۔ یہ بھلا ہو کیسے سکتا ہے یہ تو سرکاری
مال ہے ۔

سپر کو نثار حسن کاظمی اپنے گاؤں سے نکل کر پیدل چلتے ہوئے قریبی گاؤں
میں پہنچا۔ گاؤں کے میدان میں چھوٹے چھوٹے ٹکے، لڑکیاں کھیل رہے تھے۔
دن بھر ٹوٹتی رہی تھی اور اب ٹوٹنا تو بند ہو گئی تھی مگر مٹی کے ذرے ہوا میں معلق
ہو گئے تھے جس سے گرمی اور بڑھ گئی تھی۔ میدان میں ہر طرف گرد اڑ رہی تھی اور
گاؤں کے بچے دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز اپنے کھیلوں میں مشغول تھے وہ
گرد و خرابا اڑاتے اور سر سے اُدھر بھاگے پھرتے تھے۔ اُن کے پاس آٹھ دس
غبارے بھی تھے جنہیں کبھی وہ ہوا میں اچھالتے تھے اور کبھی فٹ بال کی طرح پاؤں
سے ٹھوکر لگا کر اس کے پیچھے بھاگتے تھے۔ ایک چھوٹا سا لڑکا ایک طرف کھڑا
یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ نثار حسن کاظمی نے اُسے محبت سے اپنے پاس بلا دیا۔
”کیوں پتیر خرابا سے تم کہاں سے بیٹے ہو؟“ ”حکیم جی کی دکان سے“
اس نے بے تکان جواب دیا۔ ”کتنے میں آتا ہے۔“ نثار حسن نے پوچھا۔ ایک
آنے میں ؟ لڑکے نے کہا۔

نثار حسن کاظمی نے جیب سے ایک آدھ نکال کر اُسے دیا اور کہا۔ ”لو بیٹا تم بھی
ایک خریدو۔“ لڑکا اکٹھے لے کر گلی کی طرف بھاگا۔ نثار حسن کاظمی جلدی جلدی قدم اٹھاتا

اس کے پیچھے چل کر گلی کے موڑ پر رُک گیا جہاں سے حکیم صاحب کی دکان صاف نظر آتی تھی۔ رُکے نے ایک آنہ حکیم صاحب کو ہتھکڑیا۔ انہوں نے اپنے سامنے پڑی ہوئی صندوقچی کا ڈھکنا اٹھایا۔ اندر سے ایک بڑا نکالا اُسے کھول کر منہ کے قریب لے گئے۔ دونوں ہونٹ اُس کے اوپر رکھے اور پچھلے پچھلے کی ساری سہا پورا دند لگا کر اس کے اندر بھر دی۔ شاعر حسن کو کبھی خیال بھی نہ آیا تھا کہ یہ کمبخت چیز پھیل کر اتنی بڑی بھی ہو سکتی ہے۔ اب وہ غبار پھول کر ایک اچھے خلع سے تر بوڑھتا بڑا ہو گیا تھا۔ حکیم صاحب نے اپنی صندوقچی میں ڈالی اور غبار سے پر دھاگہ باندھ کر بچے کے سارے کر دیا جہاں سے لے کر بھاگتا ہوا آیا اور باقی بچوں میں شامل ہو گیا۔ شاعر حسن کاظمی میدان کے کنارے اپنا سر تھامے کھڑا تھا اور اس کے سامنے کائنات میں ہر طرف غبار سمی غبار سے اٹتے پھرتے تھے۔ دس پیسے کے بارہ مگر آنے کا ایک ایک !

(” نقدش “ لاہور)

دُخُون

رات تکیک تھی۔ مگر عورت راستے سے واقف تھی۔

سیاہ چادر میں لپیٹی ہوئی وہ سڑک کے کنارے کنارے چلتی گئی۔ تھکی سے اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ مگر دھیمی رفتار قائم تھی۔ اندھیرے میں اسے سامنے بی آؤ بی نہر کا بانٹا پورا دالائی نظر آیا۔ تقابست سے لڑتے ہوئے اس نے گرد لٹاٹھا کر دیکھا تو مائدوں بھرے آسمان کی ہلکی روشنی کو ایک مینار کا تاریک بیرولا کلاٹ رہا تھا۔

یہ مینار نہر کے غریبی کنارے پر ایک یادگار ہے۔

یہ اس خون کی یادگار ہے جو ایک منظم قاعد کے لیے نہر کے گہرے پانی اور سڑک کے سخت سینے پر فزادوں کی مانند اُجلا۔ حمایت علی شاعر نے کہہ کر:۔
میں بخون رنگِ رخ چمن ہے خراب دمن ہے ہر باپ کا بدن ہے
..... بھائی کا بانٹپن ہے ہر ماں کے دل کی دھڑکن ہے بچوں کا
بھونپن ہے کھیت کی بھین اور مزدور کی لگن ہے یہ خون سرمایہ
وطن ہے۔“

یہ یادگار زنجیروں کے حلیے میں ایستادہ ہے۔ گولی فرشی پر پھولی چوڑی،

جس کے ماتھے پر تھڑبالیس کے متاعِ حیات لٹانے والے شہیدوں کے نام
گندے ہوئے ہیں۔ چوتھے کے اوپر چوکر مینارِ فضا میں اُبھرتا ہے۔ جس پر
گندہ ہے

” اُن شہداء کی یاد میں ”

جرپاک و بھارت جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء میں کام آئے
اس راہ سے گزرنے والے ہر وطنہ اسلام کے ابنِ سپاہیوں
کو خراجِ عقیدت پیش کرتے جاؤ جو اپنا سب کچھ قربان کر کے ہماری بقا کا
سامان کر گئے۔

مینار کی چوٹی پر ایک گنبد ہے۔ مسجد کے مینار والا گنبد۔ اس ماحول کا نمائندہ
جس کی بقا کے لیے خون بہا۔ جو ان جسموں کے حقیر مائے اثر سے۔ شہلِ بازوؤں
اور بھرپور رانوں کی تاشیں کٹ گئیں۔ فولادی ہاتھوں اور فولادی پیشانیوں کے خفق
دنگ ٹکڑوں نے توپوں کی پُربول گولی گرج کے ساتھ سرخ فضا میں ابدیت کا ترن
کیا۔ جی سے سکھ ہو کر دشمن ایک قدم آگے نہ بڑھ سکا۔

وہ عورتِ مات کی تاریکی میں اس یادِ گام کے پاس آکر کڑکی۔

وہ یہاں پہلی دفعہ نہیں آئی تھی۔ اپنے گاؤں سے سات میل فاصلہ پیدل چل
کر وہ دو چار دفعہ پہلے بھی یہاں آئی تھی۔ کبھی ساتھ والے درخت کے نیچے بیٹھ
کر قرآن پڑھتی رہتی اور کبھی حاشیے والی زنجیروں کو تمام کر چوتھے کو کھٹکے پانچھے
دیکھتی رہتی جس پر دین کا نام دسرت تھا۔

دین اس کا ہمسایہ تھا۔ بچپن اور جوانی کا ہمسایہ۔ جو بعد میں فوج میں

بھرتی ہو گیا تھا۔

وہ کسیت پر اس کے لیے لستی لے کر جایا کرتی تھی۔ کیونکہ دونوں کی زمینیں ملحقہ تھیں۔ جب وہ اپنے بابا کے لیے روٹی لے جانے لگتی تو دینو کے گھر میں بھی جھانکتی۔
 ”مامی، میں جا رہی ہوں ادھر۔ لستی دینی ہے تو دے دو۔“

اور مامی لگاتار ”عائیں دیتے ہوئے اسے ایک پوٹلی اور مٹی کا برتن دے دیتی جو وہ اپنے لچکدار کو لے پرٹا کر دھڑکتے دل اور لڑناں قدموں سے دینو کے آگے لے جا کر رکھ دیتی۔

یہ عورت ان دنوں ہلکی بھلکی نازک اور سبک تحصیل تھی۔ مرم حجم کے پتی تو دینو کے دل میں برکھا ہونے لگتی۔ جو گاؤں میں گستاخ کیلئے والا پٹھا تھا۔ کبڈی کا پھر تلا کھلاڑی تھا۔ اور چاندنی راتوں میں سر بجے گلے کی اونچی تان پر ماہیا گانے والا تھا۔
 ان کا گاؤں سرحد کے پاس ہی تھا۔

پاکستان بنایا بنا تھا۔ اور ہجرت کی خون بھری داستانیں ابھی تازہ تھیں قاتلوں کے لٹنے، معصوموں کے قتل اور بربریت کی گواہیاں ابھی لوگوں کی آنکھوں میں تیر رہی تھیں۔ لٹن ہوئی عصمتوں کی پٹمرہ داکھ ابھی سلگ رہی تھی۔ کشمیر کی جنگ جاری تھی۔ ایسے میں شام کے وقت لوگ حقے کے کش لگاتے ہوئے ذکر چھیڑتے کہ شاید ہندوستان حملہ کر دے۔ اور ان کا گاؤں تو سرحد کے پاس ہی تھا۔

کیا وہ ڈرامہ بھر ہو گا؟ دینو غصے سے کھول کر سوچتا۔ اور یہی سوچتے سوچتے اس نے ایک دن فرج میں نام لکھوا لیا۔

”یہ زمینداری کرتے کرتے تمہیں فرج کی کیا سوجھی ہو گی؟“ چودھری نے

گلی سے گزرتے ہوئے پوچھا۔

”چودھری جی ! دینو نے بٹے جذبے سے کہا تھا۔ ”ہم لوگ مرنے کو تیار ہوں گے تو گاؤں کی بیٹیوں کی عصمت محفوظ رہ سکے گی۔ آئیں تو سی ہندوستانی ادھر۔ چمڑا نہ اُدھڑاؤ دل اُن کا۔“

اور ودانے کی ارٹ میں چھپ کر سننے والی لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اب وہ کس کے لیے تھی لے کر جائے گی ؟
دینو چلا گیا۔

لڑکی کی شادی گاؤں کے ایک اور نوجوان سے ہو گئی۔ اور جب ایک دن دینو روہی پہنچے گاؤں میں آیا تو اس نے بٹے دیکھے ہوئے دل سے اس لڑکی کی شیر خوار بچی کو پانچ روپے اور ایک جھنجھا دیا تھا۔ اور بٹے بٹے بھٹ بھٹا گھر سے باہر نکل گیا تھا۔ بچی کی ماں گہری آنکھوں سے جانے والے نوجوان کی کوٹھیتی مہی۔ اور پھر مڑ کر بے اختیار اپنی بچی کو چوم لیا۔ جس کی حفاظت کے لیے اس نے روہی پہنچی تھی۔

بچی سولہ سالہ شیار تھی۔ اور اس کی ماں ایک بھرپور عصمت تھی۔ جب ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہندوستان نے واقعی حملہ کر دیا۔

مگر دینو کی مدد ہی نے دونوں کی عصمت بچائی۔ احمد اس کے لیے سراپا نظر تھیں۔ اس لیے کہیں کبھار اس مینار پر فاتحہ خوانی کے لیے آتی تھیں۔ اور ایک دفعہ تو لڑکی بھی آئی تھی۔ مگر آج وہ عورت اکیلے تھی۔ اس کا خاوند جو ایک بڑے زمیندار کا مزارع تھا، پیچھے گھر میں تھا۔

یادگار کے پاس پہنچ کر اس نے دوڑنا شروع کر دیا۔ حالانکہ وہ سخت تھکی ہوئی تھی۔ جب وہ مینار کے پاس پہنچی تو ابھی ہوئی سیکیاں اس کے سینے میں طوفان مچا رہی تھیں۔ — زنجیر کی پردہ کیے بغیر وہ بھلا لگی — اور قریباً ٹھکی ہوئی چہرے تک جا پہنچی۔ — واللہ ظہر پر اس نے اپنا چہرہ دینکے نام پر رکھ دیا۔ اور بندھ بیٹھا کہ اونٹ سے مزلیٹ لگے۔

پہلے وہی گھٹی سیکیاں ابھریں — پھر پچکیوں کا تار بندھ گیا۔ — جس سے اس کا سلاجم جھٹکے کھانے لگا۔

پھر چوتھے پر دونوں ہاتھ بے تابی سے پھرتے ہوئے بولی۔

”دینو.... تم کیوں مرے.... اگر اب بھی.... زمیندار....“

سیکیوں کے سیٹے نے اسے مزید نہ بولنے دیا — تب اس نے لپٹی ہوئی چادر ڈھیل کی — اور اپنی سو سالہ کنڈی لٹکی کی خوں آلود خلواریز کے نام پر رکھ دی....

پھر وہ بلب بلب کر چھین مارنے لگی۔

ایک خون کی یادگار کو، دوسرا — بالکل مختلف قسم کا — خون آفسوں میں گھل گھل کر بھگور ہاتھا۔

(”آپ لطیف“ لاہور)

سامانِ شبنون

آہنی فرش پر نو عمر کنواری کے گیلے پیروں کے نشان ہیں۔
 جب جہنم کے مہینے کی گرم ہوا انہیں بوسہ دینے کے لیے جھکے گی تو یہ نشان
 خود بخود اس بوسے میں جذب ہو جائیں گے۔ اور سیاہ فرش پر سے ان کا نشان
 یوں مٹ جائے گا جیسے مائع گیس ہی کا پنا دھند کھو دیتا ہے۔ پھر گیلے پیروں کا نشان
 جون کا مسموم بوسہ ہی کر سیاہ فرش پر آگ برساتا احساس کے درختوں میں نکل جائے گا
 اور کسی کو پتہ نہ چلے گا کہ ہر سیاہ فرش پر کسی نہ کسی نو عمر کنواری کے پیروں کے نشان
 ہوا کرتے ہیں۔

میری ساری عمر ایسے ہی نشانوں کے تعاقب میں گندی ہے۔ میں نے ماہ
 کو اپنے سامنے حالتیں بدلتے دیکھا ہے۔ ٹھوس سے مائع اور مائع سے گیس۔ میری
 زندگی کا سیاہ فرش بہت چکنا ہے اور اس پر یادوں کے نشان بہت جلد مسموم ہوسوں
 کا شکار ہو جاتے ہیں۔

میرے کمرے کے سامنے ایک اونچا پیل کا پیڑ تھا۔ گرمیوں میں اس کی آخری
 پھلنگ پر ایک پیل کا گھونسلہ نظر آیا کرتا تھا۔ اس گھونسلے میں انڈہ بیٹنے والی پیل
 جون کی دھوپ میں میری طرح تنہا چپ چاپ بیٹھی رہتی تھی مجھے اس پیل پر بہت

ترس آیا کرتا تھا۔ بھری دوپہر میں جب مجھے امتحان کے زرد خانوس روٹنگوں سے کوئل کی آواز آتی۔ سروٹس کو ارٹریک جانب سے کوئی شوق بچہ پیسیے کی آواز بلند کرتا تو مجھے ایڑ کڈیشز کی مسلسل گھر گھر سے خوف آنے لگتا۔ ٹھنڈے کمرے میں بسی ہوئی ایڑ خن شری فرشتہ یوہی کی طرح ناک میں گھسنے لگتی۔ پھر یکدم میری ناک بند ہو جاتی۔ میں سوں سوں کرتا کھڑکی میں چڑھ جیٹتا اور پردے کی جھری سے باہر دیکھنے لگتا۔ باہر دودھ دھڑکتا تانبے کی طرح چمکتی روشنی ہوتی اور دیواروں سے پڑیلوں سے روشنیوں پر ایسا ہلتا ہوا پانی نظر آتا جیسا گرم سڑک پر دور سے ایک آبی سا سراب ہی جایا کرتا ہے۔

اتنی ابوکایہ کمرہ جس میں تین ٹی کا کوڑ تھا، فرانسیسی وضع کا بیڈروم تھا۔ دیواروں کی جلد صاحب درگوں کے نورائیدہ بچے کی طرح صاف، اطلال اور بے داغ تھی۔ سارا فرانسیسی فرنیچر سپورٹڈ تھا۔ امی کی الماریاں (ڈورینگ ٹیبل) شلف، چٹ آف ڈرائیو سب سفید تھے، جن کی جلد فارمائی کا تھی۔ چابی لگتے ہی الماریوں میں ہونے ہوئے گھنٹیاں بجنے لگتیں جیسے گھڑکی گھڑیوں میں عموماً بجا کرتی ہیں مگر سے میں ہر طرف سفید پردے تھے۔ ابریشمی، آب دواں سے بے غریبہ سے — اسی سفید کمرے میں میری سفید ماں آئرش لٹن کی چادر پر سفید پلاسٹرائٹ پیر کے بے جوئے ٹخنے ایک دوسرے پر دھرے گھنٹوں میں رہتی تھی۔

میری ماں بڑی نازک عورت تھی — ہاٹ ہاؤس کے سفید گلاب کی طرح گرم و سرد سے بے نیاز، وہ آرائش، زیبائش اور نمائش کے لیے بنی تھی۔ کسی قسم کی زینائش سے اس کا تعلق کوئی تعلق نہ تھا۔ میری پیدائش کے بعد اس کا نازک جسم بھر کبھی بار آور

ہونے کا حوصلہ کر سکا۔ وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتی تھی لیکن اس محبت کا اظہار ہمیشہ تحفے لانے تک محدود رہا۔ وہ نہ کسی کو بھیج کر سینے سے لگا سکتی تھی اور نہ ہی کسی کی دالانہ گرفت کی تحمل ہو سکتی تھی۔ میری ماں کو انسانی جسم کی خوشبو سے نفرت تھی۔ اُسے مجھ سے بُرائی تھی، ملازموں سے بُرائی تھی۔ اُسے میرے گننے باپ سے بُرائی تھی۔ وہ سادھی اپنے جسم پر اپنے کمروں میں، اپنے بستروں پر بدیسی خوشبو چھڑک رہی تھی۔ میری ماں نے جب کبھی کسی سے ہاتھ ملایا، بعد میں اپنے ننھے دھال سے (جس پر اس کے نام کا پہلا حرف انگریزی میں کشیدہ کیا ہوتا تھا) اپنا ہاتھ ضرور پرچھیا۔ میری ماں جس کمرے میں داخل ہوتی اُس کا پہلا سانس لیا اور انسانی ہاتھ کی طرح محسوس کرتا تھا۔ وہ اُس ایک سانس میں کمرے کے بعض، اس کی گھٹن اُرد اس کے رہنے والوں کی خوش ذوقی کا اندازہ لگایا کرتی تھی۔ اس لیڈی آف شیلڈ، اس ہاٹ، ہاؤس کے سفید گلاب، اس پلاسٹک پیرس کی میڈونانے اپنی محبت کی شدت میں مجھے اس طرح پالا جیسے کسی سہاگ کے خوف سے کوئی راج کنیا اپنا بچہ کسی مٹھ میں پال رہی ہو۔ مجھے اسکول جانے کی اجازت نہ تھی۔ میرے اتالیق گھر پر اگر مجھے پڑھاتے تھے۔

سڑنٹس کو اسٹریٹ کی طرف قدم دھرتا تو درکنار ادھر دیکھنے کی بھی ممانعت تھی۔ اس طرح نیلے لمبو پر مقامی سیاہ لمبو کی پرچھائیں پڑ جانے کا خطرہ تھا۔ ہمارے رشتہ داروں سے ماں کبھی کی کٹ چکی تھی۔ اب ایک ایسے سوشل سرکل میں رہتی تھی جہاں سب روزہ روزہ ملتے ہیں لیکن کوئی کسی کو نہیں جانتا۔ میری ماں کے ارد گرد غیر ضروری مصروفیات کا کچھ ایسا جال پھیلا تھا جیسے گھنٹی المیر کی باڑ کر

امریل نے ڈھانپ رکھا ہو۔۔۔ فرصت کے لمحوں میں بیمار رہتی تھی اور غیر ضروری مشاغل کے وقت چاق و چوبند۔ میری ماں اُن عہد قوں میں سے تھی جنہیں عرب بدوی اتانہ کہتے ہیں۔ کمزوری اور بیماری کے بدلنے انہیں ایک ایسی خود فریبی میں مبتلا رکھتے ہیں کہ پھر وہ نہ اپنے نہ کسی دوسرے کے کام کی رہتی ہیں۔

ابو گنج تھے، خاموش طبع تھے اور دو تہند تھے۔ ہر دن کے ساتھ ساتھ اُن کے گھنے بچے، خاموشی اور دولت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سردیوں کی لمبی شاموں میں وہ کبھی کبھی میرے کمرے میں آکر بیٹھ جاتے۔ اُن کے کپڑوں میں ہمیشہ اُن کا بریف کیس ہوتا اس بریف کیس کے کئی خانے تھے اور ہر خانے میں ضروری کاغذات اور اہم چٹیاں ہوا کرتی تھیں، پھر وہ بپ کھول کر کچھ ایسے خط نکال لیتے جن میں مختلف مشینوں کی بٹھیں موجود ہوتیں۔ اُن کا سر بیرونی ممالک سے آئے ہوئے خطوں پر جھک جاتا اور وہ خاموشی سے خط پڑھتے بہتے اور جب خط ختم ہو جاتا تو وہ خاموشی سے اٹھ کر چلے جاتے۔ میں اپنے اُن کھلونوں کے انبار میں سے انہیں دیکھتا رہتا جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ خدا جلے کیوں میرا جی چاہتا کہ میں اٹھ کر ان کے چکنے چکنے سر پر ہونٹ رکھ دوں لیکن اُن کے خاموش چہرے کو دیکھ کر مجھے عجیب سا خوف آتا۔

سردیوں کی طویل راتوں میں جب میرے کمرے میں سرخ بیڑا جلتے اور گرم پانی کی بوتلی میرے پیروں کو چھوتی، بستر میں سے لیوینڈر کے پھولوں کی خوشبو آتی اور پیروں کی رضائی پر میری کالک کی کتابیں بکھری ہوتیں۔ ایسی راتوں میں جب اچانک کھرک کی پیرات کے وقت بجلی کی چپک سے چائی ہو جاتا۔ میں جاگ اُٹھتا۔ سردیوں

کی بادش کھڑکیوں پر پہنچی۔ گرم پانی کی بوتل ٹھنڈی ہو کر قالین پر لڑھک جاتی اور میں جاگن رہتا اور سوچتا رہتا۔

بہادر خزاں کے دل تھکیوں اور پھولوں کی وجہ سے تکلیف دہ تھے۔ یہ دونوں چیزیں مجھے بہت پسند تھیں اور ان دونوں سے میں بہت خوفزدہ تھا ایک دفعہ میں نے ایک زرد رنگ کی تھلی پر ایک گلاس کے نیچے بند کر دی تھی اس کا دل بھلانے کے لیے میں نے دو چار رنگیں پھیل بھی ساتھ مقید کر دیئے۔ یوں زرد تھلی کو جھوس کر کے مجھے عجیب فرحت سی محسوس ہوئی، لیکن جب میں دھیر کا کھانا کھا کر لوٹا تو وہ تھلی پھولوں کی تبریں پہلو کے بل پڑی تھی۔ میں نے اسے پانی پلا کر زندہ کرنا چاہا تو اس کے پھول کا زندہ بادہ میری انگلیوں پر اتر آیا۔ اس کے خوش رنگ پر زندہ رہے لیکن وہ خود مر گئی۔ تنہائی کی موت!

میرے تجربے چھوٹے چھوٹے تھے جن کا تعلق مدح اور ذمہ سے بہت گہرا تھا۔ میں گن اور شراب کے چکر میں دوڑ تک اتنا دھنسن گیا تھا کہ تھلی کے یوں اچانک مرجانے کو میں نے دوسرخ میں گھر جانے کے مترادف سمجھا اور مدد تک پرائیویٹ کے طور پر بھوکا رہا۔ یہ بیکاروں — یہ بیکار راتیں یہ آسائش کے پالنے میں چاندی کا کچھ منہ میں لیے ساتھی کی جلد والی چھت کو تکتے والا عجیب کرب کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ تو گرمیوں کی لمبی دوپہریں تھیں۔ ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں ایک امیر بچے کی گرمیوں کی سرودھ پیرا اسی پلاسٹک پیرس کے بنے ہوئے ٹخنے آپس میں جوڑ سکیں جاسوی نادل کر پڑتی سو جاتیں، اور میں کو روٹا کرو چھوڑ کر نجی چھت والے گرم کمرے میں

گھومتا رہتا۔ سارے کمرے کیساں طو پر آماستہ اور گرم ہوتے تھے۔ سانچی چھت والے کمروں میں قالینوں کی گرم جھک پردوں کے اندر جمبوس ہوا کرتی تھی۔ پھر ان کمروں کو چھوڑ کر میں اپنے کمرے کے سامنے چھوٹے سے لائنج میں آجاتا جہاں بیرون دیوار ساری خیشے کی تھی۔ اس جگہ سے چیل کا گھونسلہ بڑی اچھی طرح نظر آتا تھا۔

ایک بار اس گھونسلے کو خوبصورت بنانے کے لیے چیل کہیں سے میری اتنی کی جالہاد محرم اٹا لائی تھی۔ چیل کی آخری پھنگ پر کرخت تنگوں کے گھونسلے کے ساتھ فرانسیسی لیس کی محرم اگر کسی اشتہار دینے والی ایجنسی کو پتہ چل جاتا تو وہ اس گھونسلے کا کلوز اپ ضرور لیتے۔ گھونسلے میں میٹل ہوائی فرانسیسی میڈرن جیسی چیل عقاب ناک اور پُرخوہ پرسنٹی اور نیچے دم ہوتا۔ گئی ہو یا سردی ہر بافوق خاتون کے لیے۔ — بر موسم میں —

میں اس گھونسلے کو دیکھتا رہا اور امتاس کے درد فافوسوں میں میاہ سپیں بار بار کوکھ رہتی۔

ثوب ویل کے چلنے کی آواز آتی رہتی۔

کواشوں میں بچے پیسے بجاتے رہتے۔

گھونسلہ دیکھتے رہنے کے بعد میں جب کبھی کمرے کے اندر دیکھتا تو میری نگاہوں کے آگے ایسے شعلے ٹوٹتے جیسے کمرے میں دیویدنگ ہو رہی ہو۔ پھر میری کمزور اند بیماریاں کی آنکھ کھل جاتی۔ وہ آنکھ کر نخنے سے رومال سے منہ صاف کرتی ہایا ہاؤس کٹ پینتیں جس میں سے سارے کپڑے اور بھی واضح طو پر نظر آتے۔ اپنے

کٹے ہوئے بالوں کو زرد مادہ بیمار انگلیوں سے سفادتی ہوئی وہ مجھے تھکانے لگیں۔
گرم گرموں میں محسوس گرم نعنائیں سانس لیتے ہر کمرے کی فرشوں کا اثر المیائے
لیتے ہرے وہ خجہ تک پہنچتی۔

اتنی دن مجھے کبھی نہیں تھرا۔

اتر مجھ پر کبھی تاراض نہیں ہوئے۔

ہم تینوں کو ایک دوسرے کی محبت پر اس قدر اعتماد نہیں تھا کہ ہم اپنے
دل کی بات کر الفاظ میں ڈھال سکتے۔

اتنی کو دلچسپی چپ چاپ اُن کے ساتھ رخصت ہو جاتا اور خوشی کے ساتھ
کو کر مائے کمرے میں پلنگ پر لیٹ جاتا۔ پھر تھوڑی دیر بعد میری ناک بند ہو جاتی۔
اتنی اب کی ہر اہم بات انگریزی میں طے ہو جاتی تھی۔ جس طرح تھے سرخے ٹھونکا
مارک لگنی میں سے گری نکال لیتے ہیں اور پھیلکا رہتے دیتے ہیں اسی طرح اُن کی انگلی
کا سارا مفہوم میں پلنگ لیتا اور پھونگ رہنے دیتا۔

میں اس سفید کو خوشی میں اس طرح ہی رہتا تھا جیسے کسی اسپتال کے INCUBATOR
— میں ستانہ بچے دن کو بٹھایا ہو۔ ایسی زندگی نے مجھے بہت نازک مزاج
بنادیا تھا۔ ہر موسم کی تبدیلی میری صحت پر اثر انداز ہوتی۔ میری غذا انہی تمام
سے تیار ہوتی تھی۔ اس میں سے نہ سارا دو بدل صحت کی خرابی کا باعث ہو جاتا۔
بیماریوں کے خلاف قوتِ ممانعت پیدا کرنے کے لیے مجھے اتنے ہیگے ٹکوانے
پڑتے کہ جلی بلب ریلنگ کو اتنے ٹیکوں کی شاذ ہی ضرورت پڑتی ہوگی۔ ہمارے
گھر کا سارا نظام گھڑی اور خوف کے تحت چلتا تھا۔ چوروں کا خوف —

بیماری کا خوف — بڑھاپے کا خوف — ملازموں کا خوف — اخبار پڑھ کر انجانے حادثوں کا خوف — بالآخر آسائیش چھوڑ کر مرنے کا خوف اہتمام غیر ملکی مشاغل گھر کی کے تابع تھے۔ ہر غیر اہم کام گھر کی دیکھ کر کیا جاتا تھا۔ یہاں ڈزپر جانے کی جلدی تھی۔ یہاں ڈزپر سے لٹ آنے کی جلدی تھی۔ صبح اللہ م لگا کر آٹھا جاتا تھا اور پھر اللہ م بند کر کے غینہ کی جاتی تھی۔ ملازموں کو مقررہ وقت پر ناشتہ لگانے کا حکم تھا اور پھر ناشتہ کی بجگہ صرف گریپ فرٹ کھایا جاتا تھا، ہر اس اہتمام سے پھٹا جاتا تھا اس اہتمام سے پہننے کے بعد اسے اتار پھینکنے کی جلدی رہتی تھی۔ ہمارے گھر میں وقت کی سوسے کی طرح قدر کی جاتی تھی اور سوسے کی قدر اس لیے ختم ہو چکی تھی کیونکہ یہ مایا داس کا گھر تھا۔ اس میں جس چیز کو ہاتھ لگاؤ کھٹ سے سونے کی بی جاتی تھی۔

اکیلی چیل سے متاثر ہو کر ایک بار میں نے جی پالنا چاہی تھی۔ ننھی سی سفید جی۔ وہ چھوٹی سی گلابی ناک والی بٹی خدا جانے کیوں کر ہمارے گھر آگئی تھی۔ شاید اُسے چیل نے بھیجا تھا جو بھری دو پہر میں عتباتی انگھوں سے مجھے دیکھتی رہی تھی۔ گچھے دار دم والی ننھی سی سفید بٹی بڑی چٹوری اور بڑی کھنڈری تھی۔ پیروں اپنی دم کے ساتھ کھینکتی رہتی۔ گلابی زبان سے اپنے پیچھے چاٹتی۔ رتی بھر ٹی لگ جاتی تو پیروں اپنا جسم زبان سے دھوتی۔ اس بٹی کو میں نے اپنی زندگی میں داخل کر لینا چاہا لیکن میری اتنی نے اس بات کی اجازت نہ دی کیوں کہ انھیں جانوروں کے بالوں سے پرندہ والی کے پیروں سے اور چڑھیوں کے گھونسلوں سے الرجی تھی۔ ایسی کوئی چیز کوٹھی کے اماٹے میں ہوتی تو انھیں چھینکیں گے لگتیں اور وہ بیمار پڑ جاتیں۔ جس

دو زخمی سفید بنی کو درختی میں بند کر کے چوکیدار روانہ ہوا میں سوراہا تھا۔

اگر میں جاگ بھی جاتا تو میرا رتہ عمل وہی ہوتا۔

اپنے گنجنے باپ کی طرح میں بہت غلطیوں -

سر پر انوکھے مرکبات ملتے رہنے کے باوجود ان کے گنجنے پر میں دلچسپی

اختار ہوا ہے۔

زمانہ کی کمی کے باوجود ان کی دولت گوشت کی کمی کی طرح لسی علی جا رہی تھی۔

میرا باپ بہت خفیہ تھا۔ وہ جس کسی ملک میں جاتا میرے اور امی کے لیے

وہاں کی جنگل ترین سوغاتیں لاتا۔ میرے باپ کے صحت کیس پر ان گنت ایئر ٹریل

کی پرچیاں چکی ہوتی تھیں۔ وہ رومانیہ، بلغاریہ، جمہوریہ پولینڈ، روسی ترکستان کی

باتیں اس طرح کرتا جیسے کوئی بوری بازار، بولشمارکیٹ یا انارکلی کی بات کر رہا ہو۔

اس ماحول سے نکل کر جب میں بلاآخر سکول میں پہنچا تو میں نے اپنے ارد گرد

ایک ایسا حصار یا وقار تعمیر کر لیا تھا کہ ہم جماعت تو دکان راستہ دکان۔ مجھ سے

اگلے تھلک رہنے میں عافیت سمجھتے تھے سکول میں مجھے کوئی ہم سطح لڑکانہ نہ

کچھ مجھ سے اوپر تھے کچھ نیچے ٹانگ لڑکیاں مار رہے تھے۔ وہ چار لڑکوں نے

محبت کے برے لگا کر میرے دل کی تفصیل میں سوراخ کرنا چاہے۔ سوراخ پر

بھی گئے، تفصیل ٹوٹ بھی گئی لیکن ان لڑکوں کو علم نہ ہو سکا کیونکہ میں اپنے باپ

کی طرح خاموش تھا۔

خدا جانے اصل وجہ کیا تھی۔ لیکن جب سیریا اتنی ٹاکٹر کے مشورے کے

مطابق مٹی کے وسط میں مری ملی گئیں تو پہلی بار میں نے کھل منہ میں سانس دیا

دلوں میں تو یہی جماعت میں پڑھتا تھا اور پہلی بار اسی سے بچ پڑا تھا۔
 ہمارے گھر میں جوں پر طرف ماؤ تھو داشت ڈیوڈورنٹ اور ایئر فرسٹری کی خوشبو
 تھی ایک تانہ ہوا کا بھونکا آیا۔

اچانک، بلا تکلف اور آنا دانا نہ

پیدائشوں کی ہوا گھومتی۔

ہزارے کی یہ لڑکی چٹکی کی طرح تکلف اور مزیدار تھی۔ اُس کا ہیرو گلابی کسی
 آئرن ٹانگ کا محتاج نہ تھا۔ ہر وقت تھالی سا چہرہ گڑا صل کے بھل کی طرح سوخا
 رہتا۔ چہرے ہرے سے کسی سپرے کی لڑکی لگتی تھی۔ جسم دیکھ کر کاشتہ دکھیں
 یا قاتیں جن کی جوائی تھی کماں جیسی اوراد میر ڈھیلے جھولے بیسی ہوا کرتی ہے۔
 چال ڈھال میں کنجاہ کی چاشنی تھی۔ باتیں کرتی تو سوتی ہوئی لگتی۔ چپ ہو جاتی تو یوں
 گتا برے جا رہی ہے۔

میراد جوداں دونوں تھرموس سے مشابہ تھا۔ ایک بار جو لمبی جنبہ اندھا لال
 کر لاک لگا لیتا، دینک اُس جذبہ کی جدت و حرارت دیکھ ہی برق اندہ تھی اس
 تھرموس میں سب سے پہلے میں نے ٹھوکر قریب سے دیکھنے کی خواہش کا گرم گرم
 لاوا بند کر لیا۔

گلابی سے جانا دواں کی بہن تھی اور ایک ماہ کے لیے جب جانا دار کی
 ٹانگ کو پستر لگا تھا، بیرا گیری پر پامور ہوئی تھی۔

غالباً اس سے زیادہ اُجڑا گنوار اندھے تیز بیرا پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔

پہلے ہی دن جب وہ میز پر غلط سلط برتن لگا کر ٹوپ لائی تو رکھنے رکھانے

میں اُس نے آدھا سوپ کھو پرا دھا سوپ اپنے اوپر اُٹھ لیا۔

میرے لیے یہ بالکل انوکھا تجربہ تھا۔ سوپ کبھی گرمی سکتا ہے میں اس کے لیے تیار نہ تھا میں نے اسی سرورٹ تک ہاتھ پہنچایا یہی تھا کہ وہ اپنے دوپٹے کی گدی سے بنا کر بڑی بے تکلفی سے میری قمیص اور پتلون پر نچنے میں مشغول ہو گئی۔

”تم رہنے دو۔۔۔“ میرے گھٹے اُتار دے۔

”کوئی بات نہیں جی میرا دوپٹہ گندا ہے۔۔۔“

یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔۔۔ گندا ہے رہنے دو۔“ میرے امیر اُتار دے۔

”لو بھر نکل۔“ کھنے کو خوشی اس نے باقی جانب دیکھا اور پھر از سر نو

پھر کی طرح چاروں طرف غورم پھر کر سوپ سکھانے میں مصروف ہو گئی۔

گھڑکی آنکھیں ہمارا تاج کی آنکھیں تھیں۔ میں لمبی کپٹیوں تک چری ہوئی۔ کچھ خوابیدہ سی، کچھ محتاج جیسی۔۔۔ اُٹاس ہوتے ہوئے زمانہ اسکا چٹنے والی آنکھیں مجھے ان آنکھوں کو قریب سے دیکھنے کی ایسی شدید تمنا کا سامنا کرنا پڑا کہ میں پوش پوشی میں چلتا اپنے کمرے میں بھاگ گئی۔

اس طرح کی محبت میں انسان بہت زیادہ پُر اعتماد ہوتا ہے۔ اس اعتماد کی کیفیت اس گیس بھری بوتلی سے مشابہ ہے جس کا کالک ابھی کھولا نہ گیا ہو۔ ساری تھرمس نقطہ احساس لذت سے بھری ہوتی ہے۔ زندہ رہنے کا احساس، کسی کو خفیت سے چاہنے کا احساس، سارا ماحول موسم باتیں ایک ہر ذم سے دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اپنا کھانا کھانے کے آگے ایک دوم فرنگ باتا ہے اور ہر چیز ہر لمحہ محبوب کی شکل اختیار کر کے کھٹ سے آنکھوں کے آگے آجاتا ہے۔

پہلے ہی دن جب میں کھانا کھائے بغیر مزے اٹھ آیا تو غور میرے کمرے میں آئی۔ خدا جانے وہ عمر میں مجھ سے بڑی تھی کہ چھوٹی، ہر کیفیت قدیم دونوں کا برابر تھا۔

”آپ کا کھانا یہاں لا دوں گی — صاحب جی؟“

جس طرح کچھ لوگ ٹھیک کھانے کے بعد دودھ پینے سے ڈرتے ہیں۔ میں اسی طرح اُس کی محنت سے آشنا ہو کر اُس کے وجود سے خوف کھانے لگا تھا۔ میں نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔

”خاناں مجھے ناراض ہو رہا ہے جی — لا دوں گی کھانا؟“

میں نے احمقانہ طور سے لاکڑ کی کتابیں چھپاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بھوک

نہیں ہے۔“

”وہ جی — مجھے ناراض ہو رہا ہے جی خاناں —“

”اچھا ہے آؤ۔“

گھر کمرے میں آئی تو میں چمکیل جانفرد کی طرح اپنا سارا بوجھ پنجوں پر محسوس کرتا دھمکتا ہوا تھا۔ اُس خردہ نش کو دباتا دیتا جو مجھے اس کے پیچھے جلتے پراگستانی برقی تھی۔ مری میں میری اتنی اپنی صحت کو درغللانے کے لیے بہت محنت کر رہی تھیں۔ ڈاکٹروں کے بل اور کرنے کیسٹوں کی دکانوں کے چکر کاٹنے اور اپنے نظام زندگی پر تاسف کھانے میں اُن کے دل بسر ہوتے تھے۔ میں سارا دن اُس قلمی کام کی طرح جو بھوس پشاپک جاننے کی راہ دیکھ رہا ہوا تھی اندر ہی اندر میٹھے دس سے بھرا جا رہا تھا۔ میرا رنگ زرد واد میرے ہاتھ پیر

جلنے لگے تھے۔ اُس کی آہٹ پاکر ہمیشہ میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ میں اُس ایل پٹھے کی طرح تھا جو ابھی اکیل مرے کی عمر کو نہ پہنچا ہو اور خواہ مخواہ لڑنے کی آرزو میں مرا جاتا ہو۔

یہ وہی یہ راتیں عجیب طرح بسر ہوئیں۔

فرس جماعت کا پہلا عشق — مونی سون بادش کا پہلا ریلہ۔ دُکس کے ڈنشل میں ادلیں پھول میمنے کے منہ میں دودھ کی پہل دھار۔

گلو بڑے کی بہن تھی۔ اُس کے میرے دو میان لا محدودا صلے تھے اور سب سے بڑا نامہ اُس حجاب کا تھا جو قدوق طہر پر مردوں ہمیشہ ہوتا ہے۔ میں چپ چاپ دم سادھے ہاتھ اُڑھ کی آنکھیں دیکھتا رہتا اور میرے منہ سے کبھی کوئی بات نہ نکلتی جیسے میں بندوق کی بلی پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا اور بندوق داغنے کی ہمت نہ تھی۔

پھر اچانک ایک دن اس بلی پر بوجھ پڑ گیا۔ آپنی۔

میں امی کے کمرے میں کبھی نہ جاتا تھا۔ لیکن اس روز میں ہاتھ ساٹ لینے امی کے کمرے میں گیا تو میں دروازے میں کھڑا رہ گیا۔ گلو ڈیسنگ ٹبل کے سامنے کھڑی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر گرے سرخ رنگ کی لپ ٹلک تھی اور وہ اس وقت امی کی ایک لمبی سی مالا پہننے کے عمل میں تھی۔ یہ لمبی سفید مالا امی کبھی کبھار سلک کی فرزدی ساڈھی کے ساتھ پہنتی تھیں۔ اس مالا کے نیچے بڑا سا فرزدی لاکٹ لٹکا کرتا تھا اُس کا چہرہ سفید پڑ گیا اور وہ یوں گہرائی جیسے جھاڑ بندر کھینے بڑی گئی ہو۔ وہ وہ پٹھے سے لپ ٹلک پر نکلتی میری طرف بڑھ آئی۔ ”صاحب جی خدا کی

قسم جی میں جی صرف دیکھ سہی تھی یہ ہار خدا قسم جی میں نے
بلگیم صاحب کی کوئی چیز نہیں پرائی۔ آپ کو اثر میں کر دیکھ لیں جی۔ آئیں جی
میرے ساتھ.....“

میرے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلتا تھا۔ میں صرف اُس کے چہرے کو تنک
رہا تھا۔ سونٹوں سے آتری موٹی کپ ٹیک۔ کوٹھڑی رہا تھا اور وہ ہاتھ جوڑے سکڑی
تھی۔ ”میں چور نہیں ہوں جی۔ بھائی مجھے جان سے مار دے گا..... میں چور
نہیں ہوں صاحب جی۔“

میں بھلی کے کنبے سے کڑا رہا تو وہ یکدم میرے پیروں میں سیس جھکا کر بیٹھ
گئی۔ کھٹ سے فیروزے کا لاکٹ میرے ہوش سے جا بٹکرایا اور اس کے دونوں
ہاتھ میرے تسموں سے چپک گئے ”خدا کے لیے جی مجھے معاف کر دیں.....“
میں جی..... چور نہیں ہوں آپ کو اثر میں جا کر دیکھ لیں۔“
پتہ نہیں گھونٹو مجھ سے عمر میں بڑی تھی کہ چھوٹی ”برکیت قدیم دونوں کا
برابر تھا۔“

جب میں نصا سے کندھوں سے پڑ کر اٹھایا تو میری آنکھوں کا برجھ اُس پر
اٹا ہکا تھا جیسے وہ گلاس تلے اور دھلی میٹھی موٹی تھکی تھی اور مجھے خوف تھا کہ
اُسے چھو ستھری اُس کے پروں کا رنگ میری آنکھوں پر آتے آئے گا۔
اُس کے سانس میں ہونک کی خوشبو تھی۔

”مجھے معاف کر دیں میں چور نہیں ہوں جی۔“

”یہ ملا تم اپنے گاؤں سے جانا۔“

”میں جی ————— یہ کالا ————— اُس نے سٹی میں لاکٹ بیچ دیا۔
 اُس کا چہرہ حیرانی خوشی ”جا بھڑا“ قسم کے جذبات سے گلناری ہو گیا۔
 ”جی ————— سے لڑ میں —————“
 ”ہاں ————— جی ہمیشہ کے لیے —————“

نقل سفید موتیوں کو اپنی انگلیوں سے بوسے دیتی وہ بھاگ گئی امد میں دیکھ
 کھڑا رہا۔

یہ میرا اور گلو کا مدعا تھا۔ اسے میں نے اس لیے تفصیل سے بیان کر دیا
 ہے تاکہ وہ الزام آپ کی سمجھ میں آ سکے جو سدا نے مجھ پر لگایا۔
 گلو مجھے پیر نظر نہ آئی۔ شام کو اُس کا بھائی جانا ڈاڑی پری موجود تھا اور وہ
 واپس ہزار سے جا چکی تھی۔

میرے دل کے، اجڑی فرش پر فرم کنواری کے پیروں کے نشان پڑ گئے
 امد پھر روز مرہ کی زندگی اسے گرم ہو اسی کر چاٹ گئی۔

میں اس واقعے سے کچھ ایسا محتاط، کچھ ایسا خود مسرگچھ ایسا اذیت پسند بن گیا
 کہ پھر کبھی کسی لڑکی کے قریب ہونے یا کسی لڑکی کو اپنے قریب کرنے کا حوصلہ نہ
 پڑا۔ یوں ساری زندگیوں سے بھاگتا میں۔ بزنس کی پار دیو لری میں مجھوس
 ہو گیا۔ دولت کو میرے والد نے جس دُعا کی انجمن کی سپیڈ سے جمع کرنا شروع کیا
 تھا میں نے اس کی رفتار میں راکٹ کی قدرت سمجھ دی میں راجہ پایا وہ اس بن گیا جس
 چیز کو ہاتھ لگانا، سونے کی بن باقی۔ میرے بیوی پر نٹ، میرے پان، میری سیکر
 کو دولت کی بددعا لگ چکی تھی۔ میں گھاسٹے کے سودے کرتا اور وہ وہ چند سوچند

منافع کی صورت میں مجھ تک لوٹ آئے۔ خدا جانے میرے پاس کتنا لیا کاکی =
 مشین کہاں سے آگئی تھی جو ہر لمحہ سونا اگلتی تھی۔ سارے گریو کی طرح میری ہر سکیم کامیاب
 اور سونے میں ملتی تھی۔ میں کامیابی کا سمبل، خوشہ نختی کا آئیڈیل اور شہر کی معراج تھا۔
 یہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب ممی ڈیڈی کی وفات کے بعد میں پہلے بار دیپ لنگر
 یہاں میری ملاقات سوشل ریلینڈ کی پڑھ میں ہوئی سارا سے ہوئی۔ سارا کا والد
 میرے مرحوم باپ کی طرح بہت امیر آدمی تھا۔ اور اُس نے سارا، اپنی اکلوتی
 بیوی ماں کی بیٹی کو بہت لائے پالا تھا۔ وہ اپنے نام کو ہمیشہ انگریزی میں لکھتی تھی اور
 اس کے ساتھ ختم کرتی تھی جس طرح باپس میں حضرت اسحق کی بیوی کا نام لکھا ہوتا ہے۔
 ہماری شادی کراچی کے ایک ایسے ہوٹل میں ہوئی تھی جس کی لفٹیں کشاکش
 سات منزلیں چڑھتی اُترتی تھیں۔ ہماری شادی کراچی شہر کے لیے عرصہ تک ایک
 ٹاپک بنی رہی۔ ہماری شادی کی تصویریں مختلف نیشنل ایبل رسالوں میں چھپیں اور ہم
 اپنی ساری منائے مری چلے گئے۔

آمائش کے ہاٹ ہاؤس میں پلے ہوئے دو گنی پگ —

شادی کی پہلی رات جب میں ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوا تو میری دلیس
 فرل وارنائیٹ پینے پگ پر اندھی لیٹ تھی۔ کمرے سے ماؤتہ واش، سپرٹ
 اسائیڈ فریشنگ کی علی علی خوشبو آ رہی تھی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے امی یاد آ گئیں۔ آٹھ کی
 چھری سے اُس نے میری جانب دیکھ کر کہا — ”ایکس کبھی — میری
 عقل وارڈ نکل رہی ہے ابھی ڈاکٹر دیکھ کر گیا ہے۔“

نہایت غیر معمولی طریقے سے میں نے اُس کا منہ کھلایا اور قتل وارڈ

کی پھولی ہوئی تھیلی شامیہ کی روشنی میں دکھیں۔

یہ ساری رات سارا ہائے ہائے کرتی رہی اور میں اس کی تیار داری میں مصروف رہا۔

بہن مرن شادی شدہ جوڑے پر معاشرے کا سب سے بڑا ظلم ہے۔ وہ انسانی جبراکٹ کی سی تیزی سے ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہے ہیں انہیں بار بار ٹھکرانے کی ترغیب دینا شکست و ریخت کی داستان مرتب کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ شروع شادی میں آڑ چنیں شادی کو حقیقت کرتی ہیں، مکمل آزادی سے اس مشک خانے کی خوشبو غائب ہو جاتی ہے۔ ایک طرح سے جانا ہی مرن بھی ہر بہن مرن کی طرح پہلے ہفتے میں ہی قیل ہو گیا اور ہم اس سے بائیں آئیں ہیٹ نہ بنا سکے جس کی توقع لے کر ہم دونوں مری گئے تھے۔

مجھے سارا کی ہر بات سے اتفاق تھا اور خدا جانے وہ کیوں سمجھتی تھی کہ اعتراض نہ کر کے میں اس کے ساتھ محبت کے فقدان کا ثبوت ہم پہنچا رہا ہوں اسی لیے ہم نے محبت کرنے کا ایک ایسا اسلوب ایجاد کیا جس میں اذیت دینے اور اذیت سے خطا اٹھانے کی قوت تھی۔ جو نہی بنی ماں کی اکلوتی سارا، باپ کی لاڈلی، دولت کی پروردہ یہ محسوس کرتی کہ میں اس کی طرف متوجہ نہیں اور ہماری باتوں کا اسٹاک ختم ہو رہا ہے۔ وہ میرے پاس گرہ پائی سکتی۔ اس کے جسم سے خاص کر اس کی آستینوں کے قریب سے نیم کے کیسے پتوں کی خوشبو آیا کرتی تھی۔ اسی لیے سے ہر قسم کے (DEODORANTS) سے مشغول تھا۔ وہ مجھ پر جھک کر انگریزی میں پوچھتی۔ ”آپ کے خیالوں کے لیے ایک بہن۔“

”میں چپ رہتا۔“

ساری زندگی یسپ میں گزار آنے والی کنواری پرچھتی — ”بتائیے ناں
کون یاد آ رہا ہے —؟“ بولیے —
”کچھ بھی نہیں سارا۔“

میں نے گھڑکے بعد زندگی میں پہلی بار کسی وحدت کو قریب سے دیکھا تھا۔
جب میں نے سارا سے شادی کی تو یہ ایک بزنس میں کی شادی تھی لیکن رفتہ رفتہ
آہستہ آہستہ سب کچھ میں نے سارا کی تحویل میں دے دید لیکن سارا اُن لوگوں
میں سے تھی جو **СТО ПУС** کی طرح اپنے محبوب کو اپنی گرفت میں لے لینا
چاہتی ہیں جو آدم خود درخت کی طرح جھوٹے سیر نہیں ہو پاتیں۔ وہ میرے
وہ خیالات پر بھی پرے بٹھانا چاہتی تھی جو نہاتے میں، مات برش کرتے وقت،
جوابیں پھینٹے ہوئے میرے دماغ پر بدلی ہی کر چھا جاتے تھے۔

میں وہ سب کچھ حاصل تھا جس کی کوئی انسان آرزو کر سکتا ہے۔ ہیں وہ
محبت بھی حاصل تھی جس کی کتاب میں لوگ گھل گھل کر مچاتے ہیں۔ لیکن اس محبت میں
بھی خلی کی اک صورت موجود تھی۔ اس محبت کو بھڑکانے کے لیے ہمیشہ اذیت
کی دیا سلائی روشن کرنا پڑتی۔ سارا کے ٹھنڈے سنگ مرمر جیسے جسم کو انگڑے
کی طرح ہٹانے کے لیے مجھے ہمیشہ اُسے ذہنی طور پر اپنے آپ سے کتر ثابت
کرنا پڑتا۔ اُسے ایسے دکھ عطا کرنے پڑتے جن پر وہ علیحدگی میں رو سکے جس کی
بدولت وہ اپنے آپ پر ترس کھا سکے، اپنے آپ کو بد نصیب کچھ سکے۔

یہی ہمارا اسلوب محبت تھا جسے میں نے مجبوری کے تحت اختیار کر لیا

تھا کہ چونکہ سارا ملک پہنچنے کی اور کوئی صورت نہ تھی۔

میراجی چاہتا کہ میں کلامہ بھڑکڑ سے اپنی گود میں بٹالوں اداس کی ہنس کی ہڈی پاپا کال رکھ کر ہمیشہ کے لیے منہ پر جاؤں۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے ہم دونوں پتھر کے زمانے میں پہنچ جائیں اور ”ڈالنی تار“ جیسے تار پید جانوں کی طرح ہمارا شمار بھی ایسی قلع انسانیت میں ہو جائے جس کا اب سراغ بھی نہیں ملتا۔ ہم دونوں دو ساٹھی کی طرح جڑے ہوئے لا پید جانور۔

لیکن سارا سب روکس کی طرح بے قرار رہتی تھی وہ کرکسٹیل کی طرح ہمیشہ آبدیدہ اور خوفزدہ رہ کر خوش رہ سکتی تھی۔

اُسے اپنے قریب لانے اور قریب تر رکھنے کے لیے میں نے اذیت کا ایک ایسا باب کھول دیا جس کے انجام سے میں خود بھی بے خبر تھا۔

”بتائیے کیا سوچ رہے ہیں آپ۔ آپ کے خیالات کے لیے

ایک مہنی“

اُسے اپنے کدے پر لانے کے لیے میں اپنے سابقہ عشق کی کئی کئی گھڑت داستان شروع کر دیتا۔ اس داستان کی جبین کے لیے مجھے ایسے ایسے الفاظ تلاش کرنے پڑتے، ایسی ایسی تفسیہیں، ایسے ایسے استعارے وضع کرنے پڑتے جن کو کسی کر سدا کے کان میں اُٹھتے۔ میں اُس کے کان کی دوسے اپنے ہرنٹ لگا کر کہتا۔ ”وہ دینس کے مجھے کی طرح سڈول تھی۔ اگر اُس کے کندھوں پر چاند ڈال دی جاتی تو عرب عورتوں کی طرح یہ چاند صرف اُس کے سینے اور سر پر چھپتی اور باقی جسم کے کسی حصے کو نہ لگتی کیونکہ اُس کا سینہ اور

کہلے اس کے جسم سے بہت درد لگے ہوئے تھے :-

سارا بٹے عے جسم کی لڑکی تھی مجھے اُس کا دُلا پتلا جسم پسند بھی تھا ایسی
یہ بات سُن کر اس پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی اور وہ دُکھ کے ساتھ اپنے
بازوؤں پر ہاتھ مل کر کہتی — ”اُس کے بعد... تو.... اس کے بعد...“

.... آپ کو میں بہت بُری لگتی ہوں گی — ہے نا —“

میری جانب سے اب شدت کا اقرار ہوتا اور اُس کی جانب سے شدت کا
انکسار۔ اسی شدت سے محبت کی شمع جل اٹھتی اور ہم مالدانہ طود پر ایک دوسرے
کی جانب بڑھتے۔ وہ میری پچھلی محبتوں کی تلافی کرنے کے لیے جس کی ذیوری ہی
جاتی اور میں اُس سے اُٹل محبت قائم کرنے کے لیے دُکھ دے دے کر اُسے
اپنے پاس لاتا۔

سارا کے آنسوؤں نے، اُس کی اذیت پسندی نے ایک دم سبھا سا چنے
والی لڑکی کو بستر کی زینت بنا دیا۔ وہ پیروں میں بیٹھ رہتی۔ خدا جانے ان ٹھنڈی
اُس کی نظروں کے سامنے وہ بیلے ڈانسر قسم کی قد آور عورتیں گھومتی رہتی تھیں
جو مجھ سے عشق کر چکی تھیں یا... اپنی بدنصیبی اور محرومیوں پر آنسو بہایا کرتی تھیں۔
بہر کیفیت یہ بھجانی دوسرے دونوں کے لیے عجیب دُور تھا۔

اپنے آپ پر ترس کھاتی سارا کا چہرہ مدقوق سا ہو چلا تھا۔ وہ یورپ میں
رہنے کے باوجود کنڑا سے جسم اور کنڑا سے دل کی مالک تھی۔ اُسے کھربھینے کے
خوف نے مجھ پر عجیب کیفیت طاری کر رکھی تھی۔ ایک طرف میں اُس کی محبت
کو انکسار مار مار کر اٹھا اٹھاتا اور دوسری جانب اُسے لیٹا دیکھ کر مجھے اتنی کوفت

ہوتی تھی کہ سارا سے مجھے بچے کی خواہش بھی باقی نہ رہی تھی۔ اسی تناؤ میں اسی کھینچا کھینچی میں فیملی پلاننگ کے ہفتے مناتے ہوئے ہماری شادی کو چار ماہ گزر گئے۔ ایک رمضان میں کالافشاہ لاکڑ سے واپس لوٹا تو سارا قالین پر اندھ سی بیٹھی تھی۔ قریب ہی امر کی رمل نے بکھرے تھے۔

میں نے ٹائیلوں کو اس کے پاس رکھا اور اس کا چہرہ اپنی جانب موڑا اس نے جدید ترین فیشن کے تازہ تازہ بال سیٹ کروائے تھے اور اس سے نیم کے پتوں کی کیس کیسلی خوشبو آ رہی تھی۔

”تم پھر رو رہی ہو سارا۔“
 ”کچھ نہیں“ اس نے چہرہ پونچھ کر کہا۔
 ”قتبیں کیا تکلیف ہے سارا۔؟“

”کوئی تکلیف نہیں۔۔۔ کوئی تکلیف نہیں۔۔۔“ وہ انگریزی میں بولی۔
 روتے چہرے پر سکراہٹ نے دھوپ بھاؤں کا سا منظر پیدا کر دیا۔
 ”خوش تو ہوں۔۔۔ خوش تو ہوں لیکن۔۔۔ میرے ساتھ۔۔۔ کوئی اور بھی تو ہو اس گھر میں۔۔۔ میں سارا سارا دن۔۔۔ کمرہ کی میں کھڑی چیلوں کے گھونسلے نہیں دیکھ سکتی۔۔۔ مجھ سے تو وہی خوش نصیب ہے۔۔۔۔۔ انٹے تو سیتی ہے چاہے دھوپ ہی میں میٹھی رہے۔۔۔“

اس رات میں نے عجیب سا دکھ محسوس کیا۔ چیل کے گھونسلے کو بھگتے رہنے کا دکھ۔ اسی احساس تک پہلے میں نے سارا کو الیکٹرک کبل میں لپیٹا۔ پھر اس کے ٹھنڈے پیر اپنے سینے سے لگا کر اُسے گلو کے متعلق بتایا۔ اس رات سارا کی

آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہ جھلایا۔ وہ بت بنی گلو کا ذکر سنتی رہی اور پھر کیے پر اوندھی لیٹ کر سو رہی۔ پہلی بار میری داستان کا رتہ عمل آنا پڑا۔ اُس پر وہ محبت کا شدید دورہ نہ پڑا، جو ایسی باتیں سننے کے بعد اُس پر پڑا کرتا تھا۔ وہ ساری رات جب بھی جاگتی بند بندھی آہ بھرتی اور پھر کیے میں منہ دے دیتی۔ دو چار ماہ جب سارا گرجہ دتی تھی، ہماری زندگی کے بہترین دن تھے۔ ہم دونوں آسائش کے پالنے میں پھٹل کتوں کی طرح سیر چٹھی کے ساتھ ایک دوسرے پر تقویٰ جمائے پڑے رہتے۔ وہ سارا دن چھوٹے چھوٹے پالنے، نخی نخی فراہم، ٹونڈ ڈنگ قسم کی کڑھائی کے کپس چادریں، نیل ارگنڈی سے مڑھے ہوئے کرب پلاسٹک کے ٹب، فلائیں کے پونڈے اور سنگ برنگے کھلونے خریدنے اور اُس بچے کا کمرہ سجانے میں مشغول رہتی جس کی آمد میں ابھی بہت دیر تھی۔ کٹے ہوئے بالوں والی سارا زندگی میں پہلی بار اس قدر بارونق زندگی بسر کر رہی تھی۔ بچے کے کمرے سے نکل کر وہ دن میں کئی بار منڈی توڑنے والی مشین پر چڑھ جاتی اور بار بار کہتی — ”کچھلے، مہنتے میرا منڈی ایک سو سولہ پونڈ تھا۔ اب ایک سو ساڑھے سولہ پونڈ ہے۔ پورا آدمی پونڈ منڈی بڑھا ہے بے بی کا۔“

بچے کی کائنات میں کھو کر — میرے عشق کی داستانیں بھی بھول چکی تھی لیکن کبھی کبھی مجھے شک گزرتا کہ جب میں اُس کی طرف نہیں دیکھ رہا ہوتا تو وہ آنکھوں کی چھری سے مجھے دیکھا کرتی ہے۔ ایسے جیسے جہاز میں سوار دور ہوتے ہوئے جزیروں کو دیکھا کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک لمحے میں نے اُسے پکڑ لیا — ”تمہارے خیالات کے لیے ایک مینی —“

شاید صورتِ حال مختلف ہوتی۔ اگر ایک مات اچانک سارا کی طبیعت خراب نہ ہو جاتی۔

باہر بادش کے آثار رکھتے۔ سارا آتشخان کے پاس بیٹھی بے بنی دماغ کے ساتھ ایک لمبوتری سی ٹوپی بٹن رہی تھی۔ پہلے وہ کر دیش بدلتی رہی پھر نیم دراز ہو گئی اور جب اُس سے برداشت کرنا مشکل ہو گیا تو وہ لب کاٹنے اور ٹشیاں بھینچنے لگی۔

”کیسی طبیعت ہے سارا۔“

وہ خاموش رہی۔

”تم ٹھیک تو ہو سارا۔“

وہ آنسوؤں سے بہت قریب تھی۔

”میں ڈاکٹر کو بلوؤں۔“

میری باتوں کا جواب دیئے بغیر وہ چپ چاپ کمرے سے چلی گئی۔

جب میں اُس کے تعاقب میں تھوڑی دیر بعد اُس کے کمرے میں پہنچا تو

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی ایک اپ درست کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر

اُس نے پرس اٹھایا اور آہستہ سے بولی۔ ”کار نکالیے۔“ مجھے ہسپتال

چانا ہے۔“

اتنی سرخ لب شک اور ایسی بے تکلیلی سرخی کے باوجود اُس کا چہرہ سفید

ہو رہا تھا۔

”سارا۔“

”جلدی چلیے۔ میں اند میرا بچہ..... ہم ایک دوسرے سے رخصت ہونے والے ہیں۔“

میں اُسے پاندوئوں میں لے کر بولا۔ اچھا ہی ہے سارا۔ تمہارے ہاں کبھی بچہ نہیں ہونا چاہیے۔۔۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔۔۔ میں تمہیں کسی کے ساتھ SHARE نہیں کر سکتا۔“

استغاثہ محل کے دوسرے دن جب ابھی اس کا چہرہ ANESTHESIA کے اثرات تلخ تھا، ہم دونوں ملاقاتوں کے مواقعات میں ملے۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ بڑی دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر وہ آہستہ سے بولی۔ ”آپ کنڈاکٹر نے بتا دیا۔؟“

”ہاں۔۔۔۔۔“

”پھر؟۔۔۔۔۔“

”پھر کیا۔۔۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔۔۔“

وہ آہستہ آہستہ رونے لگی۔ ”ٹاکٹر کم از کم دو چار دن صبر کرنا چاہتا سکتا تھا۔ میں۔۔۔۔۔ پتہ نہیں تعلیم یافتہ امیر لڑکی کو لوگ اس قدر پتہ دل کیوں سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ شاید۔۔۔۔۔ وہ بھی ایسا بوجھل عورت کی طرح ADJUST ہونے کے لیے وقت چاہتی ہے۔“

”سارا۔۔۔۔۔ مجھے بچہ نہیں چاہیے۔ امیر گھرانے میں بچہ ہمیشہ تنہائی کا شکار ہر جاتا ہے۔ اُسے عجیب عجیب COMPLEXES چمٹ جاتے ہیں۔“

وہ خاموش ہو گئی۔

سپرٹ کی خوشبو سے برہنہ ٹبری لمبی خاموشی ملا دی تھی۔ پھر وہ مسکرا کر بولی۔
 — ”آپ کو گلو یاد آ رہی ہے ناں؟ — وہ مستند لڑکی تھی ناں۔“

ہسپتال سے واپس آ کر سانا کا چچی چلی گئی۔ اُس کی صحبت اتنی گر چکی تھی کہ
 ڈاکٹروں کے مشوروں کے پیش نظر میں مداخلت نہ کر سکا۔ سانا کے جانے کے
 قریباً دو ہفتے بعد مجھے سانا کا خط ملا۔ اُس میں اُس کے وکیل کا خط بھی ملوث
 تھا۔ جس میں قلع کے جہد کوائف اور شرائط لکھی ہوئی تھیں۔ سانا کے خط میں
 مرقوم تھا :

”میں آزادی چاہتی ہوں کسی باخجہ عورت کو کوئی حق نہیں پہنچا کہ وہ ایک
 بار آدرا مرد کے ساتھ اپنی زندگی گزارے۔“

اس کے بعد میں نے مصالحت کی بہت کوشش کی لیکن سب بے سود۔
 مجھ سے ملنا نہ چاہتی تھی۔ وہ میرے خطوں کا جواب نہ دیتی تھی۔ صرف اُس کا
 وکیل نہایت پابندی کے ساتھ میرے پاس پہنچ جاتا تھا۔

طلاق وصول کرنے کے بعد مجھے جو خط سانا سے ملا اُس میں لکھا تھا :

”آپ کے پاس لکھو ہے۔ میرے پاس کیا ہے؟ یہ جی کے وہ کپڑے جنہیں
 وہ پہن نہ سکا۔ خدا جانتا ہے میں نے آپ کے سب Affairs سنے
 اور کبھی ایک دن بھی مجھے اُن عورتوں پر رنج نہ آیا۔ اٹل میں نے اُن پر ترس کھایا
 — لیکن لکھو کے وجود کے ساتھ میں صلح نہیں کر سکتی۔ اور میں ایک ہی گھر میں
 نہیں رہ سکتی۔ اُس کے بولتے ہوئے میں محروم رہوں گی۔ سانا“

میری زندگی میں صرف ایک محبت آئی اور بانجھ ہو کر چلی گئی۔

یہ جنگ کے دنوں کا ذکر ہے۔ میں ان دنوں کراچی میں ایک بہت بڑے ہوٹل میں مقیم تھا۔ بزنس جنگ کی وجہ سے کچھ متعلق رہا ہو چکا تھا۔ سارے شہر ایک جذبہ ایک دلوں طاری تھا اخبار اور ریڈیو کے علاوہ اور کسی چیز سے قسّ نہ ہوتی تھی۔ میں سارا دن کمرے میں مقید رہتا اور سوچتا رہتا کہ کاش کوئی بم اس ہوٹل پر گرے اور میں اس تباہی سے چھٹکارا پاؤں جو ہر لمحے مجھے غلبے میں کستی رہتی ہے گیارہ ستمبر کی رات کو پچھلے پر میرے فون کی گھنٹی بجی کسی نے مدد ہم ہی آواز میں کہا۔ ”کیا آپ کمرہ نمبر گیارہ ہی آسکتے ہیں۔“

”گیارہ۔۔۔؟“

”جی ایک ایک اور دو گیارہ۔۔۔ دو گیارہ۔۔۔“

مجھے جرائم سے پرہیز امریکن فلمیں یاد آگئیں جو میں ہمیشہ خرقہ صحت کا تھا۔ وہ جاسوسی تاول ٹا ہوں کے سامنے پھرنے لگے جن میں قتل و غارت کا باب کھلا رہتا ہے۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ جی میں سوچا زندگی کا تو ویسے ہی کچھ بھروسا نہیں کم از کم مرنے سے پہلے ایک ADVENTURE سے مجھے بھی دوچار ہونا چاہیے۔

تین بار کمرے پر دستک دینے کے بعد جب مجھے یقین ہو گیا کہ اندر ضرور کوئی قتل کا واقعہ ہو چکا ہے تو میں نے لوٹ جانے کے لیے قدم موڑے سلفٹ تک پہنچنے کے بعد خدا جانے کیوں میں لوٹ گیا اور بغیر دستک دیئے ہی نے ایک طاقا کھول دیا۔

اندرا سا راٹول بیڈ پر آٹھ سے رُخ لیٹی ہوئی تھی اُسے دیکھ کر نہ جانے کیوں
میری بعض تیز تیز چلنے لگی۔

”سارا۔۔۔“

”ہوں۔۔۔“

”تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں یہاں ہوں۔۔۔“
”میں نے تمہیں لفٹ سے اُترتے دیکھا تھا۔ کل شام۔۔۔“ وہ اُسی
طرح لیٹی رہی۔

کمرے میں اتنی ساری خوشبوؤں کے باوجود کڑے نیم کے پتے تیز رہتے۔
”تمہاری نئی شادی کیسی رہی۔۔۔؟“

”۔۔۔ سو۔۔۔ سو۔۔۔“ ”آہستہ سے بولی۔

”تمہارے میاں کہاں ہیں؟“

”سویٹزر لینڈ گئے ہیں کسی بینک سے گفت و شنید کرنے۔۔۔“

”اچھا۔۔۔ پھر؟“

”اگر جنگ نے کوئی مثبت صورت اختیار نہ کی اور۔۔۔ ہمارا اثاثہ پاکستان

میں ہلاک ہو گیا تو اُن کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔“

”تم نے مجھے کیوں بلایا ہے؟ میرا تو سب کچھ پاکستان میں ہے اور میں تو

اپنا بینک سیلفس کہیں تبدیل نہیں کراتا چاہتا۔۔۔“

”اُس کی نگاہوں میں بڑی طعنہ سی دھنک تھی۔

”مجھے ڈر لگتا ہے دیکھیے۔۔۔“

اُس کے چہرے کو دیکھ کر خدا جانے کیوں ایک دہائی سی بسکلی میرے سینے میں اٹھی۔ میں اُس پر جھک گیا اور اُسے چھوٹے بغیر بولا: "تمہیں معلوم ہے سانا کہ..... نہ تم سے پہلے اور نہ تمہارے بعد..... میری زندگی میں..... میں نے کبھی کسی عورت کو چھو کر نہیں دیکھا۔ اور تم جانتی ہو اس کی وجہ کیا تھی؟"

"نہیں۔"

"جب دنیا کی ہر نعمت مجھے بلا قیمت مل گئی تو میں نے خود اپنے آپ کو محروم کر لیا، کوئی انسان احساس محرومی کے بغیر خوش نہیں رہ سکتا یہ احساس خوشی سے زیادہ مزیداری ہے۔"

اُس کی آنکھیں کھلتی چلی گئیں۔

"مجھے تمہارے بڑا اور کسی عورت سے محبت نہیں ہوئی بد قسمتی ہے۔"

"اور گلو.....؟"

"وہ تو تازہ ہوا کا جھونکا تھی۔ زندگی کا آریلیں احساس تھی۔"

"وہ امریکہ ایکٹریسوں کی طرح ٹانگوں کو بل دے کر بیٹھ گئی۔"

"اگر ایک چینی عورتیں تھیں بتاؤں کہ اس وقت میں کیا سوچ رہا ہوں؟"

اُس نے ہلکا سا سر ہلایا۔

"میرا ایمان اتنا مضبوط نہیں کہ دوسروں کے گھروں میں آگ لگانے سے اجتناب کر سکے۔ جس پر وہت کے بنائے ہوئے قانون کا بھی ایسا احترام نہیں کرتا کہ ایک معمولی ملاق نامے کو اہمیت دے سکوں۔"

ساتر اکانینہ احساس گناہ کی لذت سے تڑپ گیا۔

”کبھی کبھی تھنائی میں نہیں سوچتا تھا کہ اگر سارا مجھے ملی، اگر وہ کسی دوسرے کی بیوی بن کر مجھے ملی تو کیا اُس کا جسم میرے لیے اجنبی ہو سکے گا۔ کیا میری نگاہیں کپڑوں کے آریار نہ دیکھ سکیں گی۔ کیا ہماری نگاہیں اُس خلوت کی غمازی نہ کریں گی جو ہم دونوں کے درمیان ایک بوسے کی طرح شیریں رہی ہے۔“

سارا کا پنہنے لگی۔

”کیا ہم ایک دوسرے کے لیے کبھی بھی اجنبی ہو سکتے ہیں؟ کیا ہم ایک دوسرے کو نہیں جانتے، نہیں پہچانتے۔“ ”خاصی نرمی۔“ میں نے صدیوں کی تھنائی کاٹ ہے اور تم نے سارا مجھے باعصمت ہونے کا کیا بدلہ دیا۔ میں جانتا ہوں تم نے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے۔ تم احساسِ گناہ پیدا کرنا چاہتی ہو۔ جب تک تمہیں کوئی غم اندہی اندر نہ خفی نہ کرتا رہے تم خوش نہ رہ سکو گی۔“

اُس نے نظریں جھکا لیں۔

”تم اور میں..... اور ہمارے جیسے سب امیر آدمی..... ہم میں دوسری کھاتے کھاتے تلک آچکے ہیں۔ ہمیں خوش رہنے کے لیے غم چاہیئے۔ لیکن یہ غم بھی ہمارا خود ساختہ ہونا چاہیئے۔ اس پر ہمارے ذاتی کارخانے، ہمارے اپنے مل کی ضرورت چاہیئے۔“ امیر آدمی SELF - PITY کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا..... اتنی ساری آسائشیں، اتنی ساری راحتوں کا آپ بھی جواز ہے.....

SELF - PITY

سارا گہرا کہری ہو گئی۔

”تم پاکباز اور با حیا عورت ہو..... لیکن خوش رہنے کے لیے ایک دکھ

پالنا چاہتی ہو۔ احساس گناہ کا دکھ۔۔۔

یکدم میں نے اپنے جلتے ہوئے جونٹ اس کے کنارے پر رکھتے ہوئے کہا۔۔۔ "اور میں تمہیں خوش نہیں دیکھتا چاہتا کیونکہ میں نے تم سے محبت کی ہے۔ جو دکھ میں نے اپنے لیے وضع کیا ہے اُس کا تقاضا یہی ہے کہ تم اپنا صحیح دکھ کبھی نکالشی نہ کر سکو۔ تم بھٹکتی رہو غموں کی تلاش میں اور غم سے گریزاں رہیں۔۔۔"

دروازے کے سامنے بازو پھیلا کر کھڑی ہو گئی۔ "مت جائو۔۔۔"

مجھے ڈر لگتا ہے۔۔۔

"مجھے جانے دو سارا۔۔۔ مجھے بھی جینے کا حق پہنچتا ہے۔۔۔ میں بھی تمہاری طرح امیر آدمی ہوں، مجھے بھی اپنا خود ساختہ دکھ چاہیے۔"

اُس کے بازو ڈھیلے پڑ گئے۔

"میں بھی دکھ کا پیرا اس تو تا پالنا چاہتا ہوں۔ میں بھی احساس شکست اور احساس محرومی کی تلاش میں ہوں میں بھی اپنے فرصت کے لمحوں میں اپنی خوشیوں کے بازو گرد گرد کر اُن میں پھینتا دوے کا سر رہنا چاہتا ہوں۔ میں بھی ہوائی جہازوں میں سفر کرتے ہوئے سوچا کروں۔ سب کچھ مجھ سے بالشت بھر دوں تو میں ہاتھ بڑھاتا تو سب کچھ میری گرفت میں ہوتا۔ میں امیر آدمی ہونے کے باوجود با حیا اور با عصمت آدمی تھا۔۔۔۔۔ کبھی دکھ کی بات۔۔۔۔۔ تم مجھ سے میرا دکھ کیوں چھیننا چاہتی ہو۔؟ بھلا دکھ کے بغیر خوشی کا احساس کیوں کر رہے، بھلا دکھ کے بغیر زندگی کا احساس کیوں کر ہو؟"

اپنی مڑتے ہوئی کے عشق کو رومال دلی جیب میں عین سینے کے اوپر رکھ کر

میں باہر نکل آیا۔ اب مجھے سوت کی خواہش نہ رہی تھی۔

وہ دیر تک مجھے کانیڈر میں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

پہلی بار اس کے چہرے پر آنسوؤں کے بار جو خوشی چھائی تھی۔

وہ جیسے کاقرینہ سیکھ چکی تھی۔

(”فنون“ لاہور)

کوری کوری - گوری گوری

(۱)

جبر بوندی کے دل کی ہی ختم ہوئے تھے کیونکہ مواد میں مکمل کر برس چکی تھیں۔ سب اوپر آسمان کی طرف، جدھر بھی دیکھو، نیل ہی نیل پھیلا ہوا تھا۔ ایکہ کی ذہین جان ڈالنے پر مزید تیار کی جانے والی تھی۔ تار مکمل کی لمبی سڑک کے آخر میں کوئی نصف میل کے فاصلے پر صدمہ والی گاؤں تھا جہاں پکتے گڑ کی خوشبو پھیل رہی تھی اور میل کے دھولے سے دھڑاں ٹھک ٹھک نکل رہا تھا یہاں ڈنگر میں نصیبو چوہان کی باری آئی ہوئی تھی۔

نصیبو چوہان اتنا عاقل تھا کہ اس نے اپنا تھیرک مواد ٹوں میں آلا نہیں ہونے دیا تھا۔ قریب گڑ کی پکانی بھی جبر بوندی ختم ہوتے ہی شروع ہو گئی تھی۔ تار مکمل کی لمبی سڑک کے آخر آمد دکن میں جو سوانے کا سوانا لمبی بالوں والے گیہوں سے بھرا کھڑا تھا جہاں سے ہر ایک میں پکتر بڑے بڑے دانے تھے، اس کے مداح دینے کا ابتدا بھی نصیبو چوہان نے ہی کی تھی۔ آج مواد میں ٹھکنے کے بعد ٹھنڈی برا کے تھیرکوں میں ان لمبی لمبی بڑے بڑے شریقی دانوں والی بالوں کے ہٹھانے ملنے جلنے سے جو خوشگوار سرسراہٹ پیدا ہو رہی تھی وہ چھوٹی بالوں کے ہٹھانے سے کہیں نہ پیدا ہو سکتی۔

نصیبو چو ہادی سردوں والی میں وہ نشا کسان تھا جس کے اپنے نہ تھپتے تھے اور وہ گورہ کو بطور کھاد استعمال کرتا تھا۔ بڑگائوں میں جو موشیوں کی تلاش ہوتی تو اس میں اسی کے بکھرے اور بھینس نے انعام پائے تھے۔

لیکن باوجود اتنا جائزہ ہونے کے وہ اپنی ہنسوکڑ، ہمیشہ لٹک کر چلنے والی، کتاب رو، بھری جوانی والی لڑکی حدود کو تابو میں نہ رکھ سکا تھا۔ پھیلی جاتوں میں جب پانی چڑھ ہوئے تھے، یا غول میں ٹپکے کے آسوں کی گدگد ہو رہی تھی اور گائوں میں زیادہ برکھ سے جنگ پڑنا لوں کی دھاریں دور دور پر رہی تھیں، شاخ بید ایسی لچکلی اندیکری کی بجلی ایسے پھیلنے سے خند گھیا پٹ سے دالی حدود بڑول پپ کے سونے لٹریے بابو کے پاس ڈرائی اور بھونائی رات میں گول پینے کے لیے جرتیاں ہاتھوں میں لیے، کپڑے بھگوانے آکر گاہ لڑاتے ہوئے کہنے لگی تھی :

”ارے صمد، میں تو ٹھکانی ٹھکانی پانی ماں سے نکل کے آئی ہوں۔ گولی گئے! تیں آپ سرکھی سوکھی کو ٹھڑی اں کیسی زال کی جگہ گیس کی لالٹیں بالے سر رہا ہے۔ بتا کھٹے جانے میں کدں سوؤں؟“

”گول گئی! تیرے واسطے تو میرے دل کی چندن کھڑکیا کھل ہوئی ہے“ چاہے جہاں آئی بیٹھ۔ صمد نے اسے جواب دیا تھا۔

”ارے میں تو تیرے صدمہ سے جانیاں میں تو صدمہ آئی ہوں، بیٹھیں نہیں آئی۔“

”تو پھر سو بھی جانا، پہلے کپڑے تو دوسرے پہن لے۔ یکیا کدہ ہی تھی میں تیرے صدمہ سے جانیاں؟“

”راجہ پنجابی سدا سے گھر کے رے ٹکے ہوئے ہیں، جنھوں نے بہار باگ کا ٹیکہ لیا ہوا ہے، اس کی چھوکر یاں اور بدلا کے میری گیت گایا کریں ہیں۔“
”تو تجھے یہ بول اچھے لگے؟“

”بہت اچھے، جدی تو یاد بھی کر لیے۔“

جب سدا دیکھے ہوئے کپڑے آنکار سدا کا تہنہ اور سینہ ٹھنسی بنی
پہنے لگی تو سدا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا: ”تیک تو لیے سے بیڑا خشک لینے
وے، پھر بہنا۔ اور تو نے یہ کسیری کے رنگ ایسی کرتی تو آٹا پھینکی، ست خنسی
اگلی میں آٹا ڈالوں۔“

”اور سدا گدا دیو کھنسی کی آلی ہے۔“

”آلی نہ جو پر اس میں آلی تو ضرور ہے۔“

”ارے بدینت! تجھے اتنی اڑھیں نہ جان، میں تو سمجھوں تھی تیں ہنسی کر
رہا ہے۔ یہ کبے بچے ہاتھ آگے تو نہ پکا، نہیں تو تیری میری خنسی جائے گی۔“
”تیری میری تو روز ہی خنسی رہتی ہے۔“

”ارے میری منسا اس طرح ٹھنسنے کی نہیں۔ تیری میری لام باجی (بھائی)
جو جاگی۔ جھگڑا، راسا، جنگ، کھلیں، بڑھ، پھو جی داسی۔ اپنے یار کے منہ پہ
کاٹ کے چکتا ڈال دے گی۔“

”چاہے تیرے ساتھ پانی پت کی تیں لڑائیاں بھی لڑنی پڑیں ہیں جب بھی
نہیں مانوں گا۔“

اب سدا کی لمبی کی گھٹل کمر ہم جنگ تیلیوں والی آنکھیں لطف، مزے اور

اور صحت میں اگر نہر کے اس پانی کی طرح جھلک کرنے لگیں جسے چودھویں کے چاند نے
چاندی بنا کر دکھا ہو۔ پھر وہ صلاحات کیسے دکھائی۔

بے لباسی میں وہ گھڑ چڑھی اور تڑاک پڑاک سی، نقد، تر معلوم ہوتی تھی گھڑ
چڑھی۔ اس لیے معلوم ہوتی تھی کہ قدیم قزاقستان کے گھڑ چڑھوں کی طرح
سے اس کا کمر سے نیچلا جسم بہ نسبت بالائی حصے کے زیادہ تو مند تھا۔ رانیں
اور پنڈلیاں قد سے زائد بھاری بھاری، قصائی کے بٹے کی مانند چکارا سی تھیں۔
قدیم قزاقستان کے گھڑ چڑھوں کا یہ حصہ جسم اس لیے تو مند ہو جانا تھا کہ پھینے
سے اس پر سواری میں مشغول ہو جانے کے بسبب زیادہ مشق اور مشقت میں رانیں
اور پنڈلیاں ہی آتی تھیں۔ محمد کو جس پر زیریں قدرت نے بلا مشق و مشقت ہی حیات
کریا تھا اس کی رانیں ضرورت سے کچھ زیادہ لمبی، تھانا اور بھری بھری دکھائی دیتی
تھیں، مگر اید پیٹ سختی اور ملاغز سے۔ یہ جانکاری صرف صد کمری تھی، ورنہ اس
کی لہجہ دیکھ کر ہر ایک اسے ابلہ پری کہتا۔ وہ کم عمر تھی، لیکن لمبوتر۔ اس کے
منہ پر چڑھتی جوانی کے دو ہمارے بھی نکلے ہوئے تھے اور اس کی یہی چڑھتی
جوان اس کی گات سے ٹپس پڑتی تھی۔ اس کی باہوں میں کانچ کی پیار پیار، پانچ پانچ
سیاہ چوٹیاں تھیں۔ ناک میں سونے کی کرکری دار تختہ، جس کا قطر ایک سوا انچ ہو گا۔
محمد کا چہرہ رنگت میں اس کے کپڑوں سے ڈھکے ہوئے بدن کے مقابل
بیٹا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے ٹونوں سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ اس کے ڈھکے
ہوئے بدن میں انرنگی سفیدی تھی اور اس میں انرنگی خوں موجود تھا۔

جب محمد اس رڈ کی پتھر پر پھرنے لگا تو کبریٰ کی بھل ایسے پھسلنے سفید پنڈے

کی تاب نہ لا کر گیس کی خب جلتی ہوئی لائٹیں کچھ دم پر ٹکڑاٹھانے سے لگی تھی۔ سمجھنے
اس کی رائیوں اور پنڈلیوں کو تو ایسے سے خشک کرنے پر ہی بس نہ کی تھی۔ وہ تو
بلا ضرورت انہیں گویا چٹکے چٹکے سلاسا تھا اور حمد لطف سے ہی تھی۔ لیکن جب
دیر ہوئی گئی تو اس نے کہا: ”پانی تو سوکھ گیا اب کھوٹے جانے کھول سکھاتا
چلے ہے، اے بھوے“

پھر وہ دھلا ہوا صاف تہ بند اور سینہ دیشی خیابان پس کے چرخانہ کبل میں
اس طرح سے آدکی جیسے کوئی نئی نئی جوانی میں آئی ہوئی گنیا گھاٹ پر نہانے جائے
اور کسی شمس کے کوکھڑا دیکھ کر اچانک کپڑے اتارے بغیر ہی پانی میں کود پڑے۔
حمد نے کبل اس طرح سے پیشا ہوا تھا جیسے اسے تب لڑہ چڑھ رہا ہو
اور وہ ”ہوں ہوں“ کرتی ہوئی کانپ رہی تھی۔ یہ سب یاد کو لبھانے کے
لیے تھا۔

حمد نے واقعی یار کو اتنا لبھایا تھا کہ باہر پڑول پیپ پر ایک منجھی کار
بارن پر بارن سے رہی تھی کہ کوئی آکر ٹکی بھرے لیکن صد جھان کو اتنی دیر کے
لیے بھی جھوٹنے کو تیار نہ تھا۔ بھرکار کے مالک نے جو پڑول پیپ کا بھی مالک
تھا، کو ٹھڑی کے دروازے پر دم دم کی تو چا تر باپ کی چا تر، طبیعت دار اور
چرنیکل ٹکی نے ایک دم سے اٹھ کر گیس کی لائٹیں بجھا دی۔ حمد اسی کی فضا میں
رہوں ہوں، کرتا ہوا باہر نکلا تو مالک کی آواز آئی: ”صد تجھے کیا ہوا؟“

”میاں صاحب جاڑے سے بخار چڑھا ہوا ہے۔“

”تو پھریوں یا سر کیوں نکل آیا، کچھ اوڑھ لے؟“

وہ اندر گیا اور حمد کے اوپر سے اپنا چوخانہ کیسل اتارنے کی کوشش کی لیکن اس مخمری ہانے نے کیسل کو اپنے اوپر ایسا تان رکھا تھا کہ اسے چھوٹتی ہی نہ تھی۔ ہانک نے پکارا: ”کیسل کئی کپڑا نہیں ملتا؟“

”میاں صاحب اندھیرا جو ہے۔“

”گیس کی لائٹیں کیا ہوئی؟“

”بجھ گئی تھی، اور مجھے ہوش نہیں تھے کہ پھر چلاتا۔“

حمد نے کار کی کئی پیڑوں سے بھری ترشح ہوتا ہوا تھا۔ ویسے ہر طرف گھپ اندھیرا تھا لیکن آسمان کے باغوں میں لائٹیں اس طرح سے پھرتی ہوئی نظر آرہی تھیں جیسے شہابیے پھر رہے ہوں۔ پیڑوں پر پھل کے ذرا خٹل میں واقع آل جنجال جنگل تاروں بھری رات کو مات کر رہا تھا کیونکہ وہاں بے انت جگنو پتنگوں کی طرح فٹھا رہے تھے۔ آل جنجال کے مغرب میں مولسری کے درختوں کا گنچ تھا جس کے چرگروہ کانٹے دار باڑ پر کندری کی بلیں پھیل ہوئی تھیں۔ مولسری کے پھولوں کی سیاس دور دور تک پھیل رہی تھی۔ مغللوں کی بنائی ہوئی اچھی سے اچھی بارہ دری میں سادوں کی ایسی ٹھنڈی ہوا زلگتی ہوئی جیسی یہاں۔

اُدھر تو ہانک کی کار نے مغرب کی طرف شہر کا رخ کیا، جو یہاں سے پچیس میل ہو گا، اور اُدھر حمد نے جا کر کوٹھڑی کھولی۔ اب یہ دونوں ہی ایک دوسرے سے پشت پھیر رہے ہوئے چل میں رہے ہوں، کہ رہے تھے، گویا دونوں ہی کو تپ لڑہ چڑھا رہا تھا اور سخت سردی لگ رہی تھی۔ اس کے بعد پیڑوں کی آغ سے مجبور ہو کر حور و صف نے چمکتے ہوئے منہ حمد کی طرف پھیر لیا اور کہا: ”میری مکر تو

پیرٹائے رہی ہے۔“

”منہ اسی لیے دوسری طرف پھیرا ہوا تھا؟“

”تین داب دیتا تو ہاتھ ٹوٹ جاتے؟“

”پرلی کوٹ لے لے داب دوں گا۔“

”دا کوٹ تو ٹھک گئی۔ ارے میں تو تیرے سے ملنا چھوڑنے والی ہوں۔ پولیس

بلو اکی آس کیا، آج نہیں توکل گیا۔“

”تو اسی واسطے ملے کسے کہ دلوں پر رکھ ابد جتنی مرادیں ہاں سے انجمن ہوں

اپنے لے۔ برہا کا کرپ ڈاکو ڈھاکہ میں دکن لگائے بیٹھا ہے، کیا جبرک خوشیوں
کی ڈھونڈی پٹا دے۔“

”چپ رہ، چپ رہ۔ میری گردن روڑ دے پر ایسی باتاں نہ کر۔“

پھر نشانہ زخمی کا اند شرمع ہو گیا۔

وہ ایک دوسرے کے جسم سے گرنے لطف ابد آسائش حاصل کرنے کو

ایک دوسرے کی اس طرح سے اکوار بھر رہے تھے جیسے ایک دوسرے میں

سراپت ہی تو کر جائیں گے۔ رات بھر کسل تو ایک تھا پر اس میں جی دو تھے۔ ابد

تمام رات ہی بچلی کی چمک، بادلوں کی گرگڑاہٹ اور بوندا باندی کے ساتھ سادہ

کا گدی گدی اور ستم گر ہوا چلتی رہی تھی۔ صمد جو ساکھے پر ساکھا ابد خیر و برکتی کر

رہا تھا تو بعض دفعہ حیرت کہہ رہی تھی: ”ارے جتنے نے باجوں (نئے بانوں)

کی طرح کیا چمکیاں لگا رہا ہے؟“ پردے میں لڑکیاں دھو دیا ملا کا ہرا لگا رہی

تھیں اوسان کے تازہ تازہ گلوں سے نکلے ہوئے بوٹوں کو ٹھنڈی پون کا ہر ایک جھکواڑے چاؤ کے ساتھ اپنے میں رمائے لیے آ رہا تھا۔ ساتھ کسے ساتھ مرسری کے پھولوں کی سباس بھی آ رہی تھی۔

(۲)

صبح کے وقت جب باغوں کی دانی کوئل کوئی تو گم گھیری میں ایندی ایندی آنکھوں کو پوری طرح سے کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے حوری بول: ”اے اب تیں مجھے کہاں ٹکا دے گا۔ اس تیرے کشمگر ماں تو بڑا چاند نا ہوا جا رہا ہے۔“

”تو تیری مرضی یہ تھی کہ سو راج بھی نہ سکے۔“
”نکلے توتے تے دکھن ماں میلوں پھیرے ہوئے کائے آسوں کے باگن باغوں کی آٹ لیتا ہوا چلا جاوے۔“

آخری فقرے کے آخری بول ابھی حورو کے چھوٹے سے منہ میں ہی تھے کہ اس کا باپ نصیبو چوہان، جو جیل خانے کے داروغے ایسا تھا، ٹانگی لیے ہونے داخل ہوا۔ حورو نے اس کی جلا دانہ صومٹ دیکھتے ہی چیخ ماری: ”ہائی!“ نصیبو چوہان اس پر ٹانگی چلانے کو ہوا تو حورو قبل سمیت پھیل آتری کھرکی میں کود کر ہاتھی سوئڈے سے چھپا ہوا اکیست عبور کر کے آل جمال میں جا لکی، جو آٹکباڑ درختوں، جھاڑیوں اور بیلیوں کا چھوٹا سا ایک مربع میل گھٹنا جھل تھا۔ جب یہ سواہن ایسے پچھلے بدن والی اپنے مٹھی بند ہاتھ ست خمی لگیا کر اٹھائے کو لامارتی ہوئی کتر داں چال سے بھاگی تو بہت سے مرد بھی حورا حوسی میں بھاگنے لگے۔

جس اڑا ہے میں حدود داخل ہوئی تھی برسات کے دنوں اس میں گھنٹہ چوٹ
 سبھی ڈرتے تھے کیونکہ یہاں بھڑوں، تفتیوں ایسے مزدوروں کے چھتے تھے اور
 ہر وقت ان کی ہمیں بھیس ہوتی رہتی تھی۔ ایک مرتبہ ٹومٹی کا پھنچا کتے ہوئے
 وہ شکاری کہتے اس میں چلے گئے تھے تو وہ نکلاتے ہوئے نکلے اور تھوڑی دور
 جا کر ڈھیر ہو گئے۔ اسی طرح سے عرصہ ہوا فیر یا ڈاکو جتنا پاریا جیب مردوں
 والی پر حملہ آور ہوا تو کرنل فورٹ اور بیگم فورٹ مولسری گنج میں سادوں کے مزے
 لے رہے تھے۔ کرنل نے جبراً لگا سنا تو پیدل پیش کے درجن بھر ماضی بردار
 گدے پودے میں بھیجے اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر ٹڈا پھڑ پھنچا۔ گورے اس
 وقت آئے جب ان کے سامنے کوٹا کر بند کر کے مارے کسی ڈاکو نے کین گاہ سے
 گولی مار کر ختم کر دیا تھا۔ گورافوج کی ان دنوں بڑی دھمک تھی اس لیے ڈاکو بھاگ
 کر آل جنمال میں جا چھپتے۔ پھر ایک ہالیوں نے جنگل کا گیراٹل لیا اور جو بھڑوں
 تفتیوں کھایا ڈاکو باہر نکلا گورے اسے سنگینوں سے قید بنا ڈالتے۔ فیر یا اندر
 ہی ٹھیرا اور ڈاکو کی تاب نہ لا کر آل جنمال میں ہی مر گیا۔

کرنل کی وفات کے بعد بیگم فورٹ گنج میں ہی ٹھیری رہی، یہاں تک کہ اس نے
 نصیبو چوہاں کے کسی بزرگ سے پھول بڑھا لیا۔

توانا فی جانوں کے لیے اڑا ہے میں بہت ہی خطرے تھے۔ لیکن نصیبو
 چوہاں پھر بھی اندر داخل ہو گیا اور تھوڑی دیر میں باہر آ گیا کیونکہ اسے واقعی جڑیں
 اسی جیسے پٹے ہوئے تھے۔ جب حدود کا باپ عاجز آکر منہ ڈانگوں سے سجائے
 لیکن جھگیا یا ہوا پر دے کی طرف چلا تو وہ اسی گوتارہ میں ہی تھا کہ مغرب میں

جنتی ہوئی برساتی ندی کے کنارے ڈنگر چرانے کے لیے گھر میں سے آتے ہوئے
 لڑکے اسے دیکھ کر کھل بازی میں چکڑیا بچانے لگے : ”ہو دورا، ہو دورا،
 ہو دورا۔“

اس وقت گاؤں کے ہرے ہرے سوانے پر گھمبیر اور ٹپکاؤ گھٹائیں پر کمرش
 چھائی ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں سخی ایسے زرد پھولوں والی پنوار، کہیں لال یا زرد
 گل عباس، کہیں بانسے کے سفید پھول کھلے ہوئے تھے۔ امرہوں میں کوئلیں
 کوک رہی تھیں۔ بہت سے بے پنی سلکے خود اور کھلاڑ پرندے موسری کے
 کنچ میں جنگ بزرگی کا پورا مظاہرہ کر رہے تھے۔ انھوں نے اتنا غر چایا
 ہوا تھا جیسے اس سر پھٹوں میں بھی لہولہاں ہو گئے ہوں۔ اور اس پر دے
 کے وہ ہزاروں مورد، جن کی حفاظت یہاں حرم کے کبوتروں کی طرح کی جاتی تھی،
 کھیتوں میں فارغ البال شہزادوں کی طرح خانا خاناں پھرتے ہوئے بادل کی
 گرچ پر ایک ساتھ جھنگا رہے تھے۔

مردوں والی کے چوگر وہ چاندوں پر لکھا ہوا تھا کہ یہاں مردوں کا شکار یا
 گزند سامانی منع ہے۔ برطانوی، احمد میں کسی انگریز ضلع افسر نے برساتی ندی کے
 پل پر ایک مور مار لیا تھا تو پیدے والوں نے اس کے وہ لٹے مارے تھے کہ اسے
 شکر میں ڈال کر ہسپتال پہنچا یا گیا تھا۔ پھر جب مردوں والی پر پانچ ہزار اجتماعی
 جواز ہوا اعداء میں مال مویشی تک جانے لگے تو ایک ہزار کی بندھی رقم میرہ کرنل
 فورڈ نے دی تھی جس کا نصیب سو جان کے کسی بزرگ سے پہلے تھا۔ اور اس انگریز
 عورت کی نسل تھی۔

جب ریمیں کی فصل گھٹنوں گھٹنوں سے کم ہوتی تھی تو پر سکونی سونے میں بہاؤوں
مسعد کا پھرنا اچھا لگتا تھا۔ لیکن آج چار ماہ میں ان کا جھگڑنا اور بھی اچھا لگتا تھا۔
پر آنکھوں سو بے نصیبو کی تو اس طرح کی طرف توجہ ہی نہ تھی۔ جب وہ پردے
پہنچا تو بیشیش بنے کی دکان پر اسے دیکھ کر کہتے بھونکنے لگے تھے اور ساتھ کی ساتھ
کاٹا رول بھی پر گنتی تھی۔ حمد کو کبیل نے موزیل سے بچایا تھا۔

بعد عشر جب لاشینیں باغوں میں شاہوں کی طرح سے پھرتی ہوئی معلوم
ہونے لگیں تو پھر کبیل تو ایک تھا، پر اس میں جی دہتے۔ اور جب ساموں کی گدلی
گدلی جاندا اور ستم گر بھاپل رہی تھی، آسمان نیٹ گھور ہو رہا تھا، گھاؤں کی ہڈیاں
دھیا طار گار ہی تھیں تو نصیبو چہان کی دہلیز میں بچاٹا بڑا ہوا تھا۔ اس بچہایت
میں گئے ہوئے پانچ ہی آدمی تھے: نصیبو چہان، اس کا بھائی ببا چہان،
پٹواری رحیم بخش اور حمد کے دونوں ماموں۔ بحث یہ چھڑی ہوئی تھی کہ
پپ مالے سے کیسے بد لیا جائے۔

اوصرا یکہ ہی کبیل میں مدجیدوں کھسکھس کر رہے تھے: ”ارے محمد!
تیں بھی بڑا ماٹھو چند کاٹھ کا اٹھ ہے۔ نصیبو چہان تو کوئی جھوٹے نوں مارنے
کا نیچا نچتی بھالائیں تو تیرے اس چاکی برگے چھاتے ماں گھپونے آما ہو گا۔“
”تو تو پٹرول پپ پر آما جانی کیوں نہیں چھوڑتی؟“

”یو کی بحث چوڑا نہیں مانتا۔ اس کی ہر بحث یو ہی رٹ ہے۔“ وہیں
پہل، وہیں پہل، ”سورجے چلکا سا چھوڑ دے گا تو میں یہاں آنا چھوڑ دوں گی۔“
”جو اس نے نہ چھوڑا تو نہیں؟“

”نہیں، نہیں۔ میں کہہ بڑا دل پیپ پر جم جم آ، اندھیرے آ، اجالے آ۔“
 ”تو آ کے منت ہیں رے بے، کبھی گھر نہ جائے۔ اب تو خوش ہے۔“
 ”گھس ہوں۔ جو میں گھر بیٹھے ہوئے سوچا کہوں ہوں، پڑا دل پیپ پر
 جاؤں گی، تو میرے دل ماں گھسیوں کے سوزنا چن لاگیں ہیں۔ ہمد جدید ترے
 دھندلے آؤں ہوں تو یوں لگا کرے ہے جتنے سانسے سولنے ماں سوز ہی ہمد
 ناپا رہے ہوں۔“

اندھیرے تیرے دھندلے سے جاؤں ہوں تو یوں لگا کرے ہے جیسے
 ہرے ہرے دھانوں میں کھولی کھادی ہو۔ جیسا گھسیں کرے ہے بس ابھی اس کے
 ساتھ لیکھا چوکھا برابر کر لو۔ یہ پھتیس بھوجی اور پنج پکوانی کل کے واسطے کیا دھڑا۔
 کی پتا کل دن چمکے نہ چمکے۔ جو کچھ ہے آج سپڑاؤ پھر ملنا ہوتا ہو تیرے ساتھ میں
 ٹھنڈے سی ہوں تجھے دیکھا ہمد بھڑائی۔ جو کوئی کسی کی ڈھیر دیسے باٹ دیکھ
 رہا ہو پھیرا آجاوے ہے تو بڑی قدر ہو ہے۔“

”میرا تو ہر لمحہ ہی تیرے انتظار میں گزرتا ہے۔“

”جس بھجے بھڑوں کھا یا نصیبو چہاں پٹوں جیسے گال بنائے ڈھکھا سا
 گھرن آیا تھا اس رات تجھے کیوں بینا گئی تھی، آسک تو چاندنی رات ماں ٹیڑیوں
 کی طوں جاگا کر یں ہیں۔“

”میں تو تیرے پسنے دیکھنے کے لیے سر گیا تھا۔“

”دیکھے بھی؟“

”ہاں، جانے تیرا میرا بیاہ ہمد ہا ہے۔“

”بس تیرا میرا بیاہ ہو گیا۔ سینا اٹھ ہو ہے۔“

”تو تیرا میرا بیاہ نہیں ہو سکتا؟“

”یو تو میں کدھی نی کہوں گی پر سینا اٹھ ہو ہے۔ پروکھ نہ مجھے نصیب چرمان
اچھا لگے نہ کوئی دوسرا لگا سکا۔ سولہ کھانڈ، چھا چھ بیوں میں ہی ساغھ رہے
ہے۔ جو فواج پڑھی کھڑی ہوں تو میری فواج ہی نہیں ہوتی۔“
”و نہا کیوں نہیں ہوتی؟“

”تیں فواج پڑھیں مے تو ہو۔“

”کیوں؟ کیا میں تجھے ہنسنا ہوں؟ میں تو تیرے گد گدیاں بھی نہیں اٹھاتا۔“
”فواج پڑھتے ہوئے میرے ساغھ نا ما ہو ہے جو ٹھالی بیٹھے ہوئے
بھی نی ہوتی۔“

”کیا؟“

”بس پوچھانی کہتے۔ ارے اللہ ما سٹھ ہے، کایے، بہ محاس!
تیرے آپے ہونٹ پر غھٹھی غھٹھی سی مونچھاں پھوٹ لائیں پر تیرا منڈا پتہ
گیا۔ جو بات تیں کہہ سکے ہے پر باتیں نہیں کر سکتی۔ میں بڑی گناہگار ہوں مہی
نیت دلیا پھل باب کے رجھائی آیا، میرے رو بے (دوڑے) نہیں ہو سنے
کے جو میں دن ماں تیرے دھورے آئی تو روجا کہاں کھر پانچوں کھیت (ہفت)
کی نا جاں پڑھوں تیرے دھورے آ کے ایک بھی نی پڑھی جاتی۔“

”ہیں روکتا ہوں؟“

”تیں کیا روکتا۔ بس پڑھی ہی نی جاتی۔ جد میں تیرے کھے آیکروں تیں

روٹھ جایا کر۔ مناؤں تو مٹا نہ کر۔“

”کیوں؟ تو ہی دوس جایا کرنا۔“

”میں ہنسو کر ہوں، مجھے تو مٹانی آئے گا۔“

”تو تیرے خیال میں میں بڑا کٹر ہوں۔“

”کٹو تو قہقہے ہے۔ میں ہی تیرے پاس آئی ہوں، تیس تو میرے لیبروں (لیجے)

کہ جی پڑوسے کی ڈھب ڈھالی گدم (قدم) بھی نہیں بڑھایا۔“

”وہاں بلا کے میرا اس فرنگی جیسا حال کرنا چاہتی ہو گی جسے شکرم میں ڈال

کے ہسپتال لے گئے تھے۔“

”اسے میں تو تیرے ساتھ دیوں ہی گلیج ماری ہو رہی کھاں کدہ ہی تھی۔

میں اپنے کا لے لٹوڑیہ کے لیبروں بھوری بھیتس کے دودھ کی کھیر لاؤں گی جس

ماں پستہ پام پڑا ہوا ہوگا ہود ڈھیر سی ملائی، پر لالے اپچیاں ساتھ ہوں گی۔

ہاتھ نہ تیں سانچے نہ میں۔“

”میں تجھے سوروں پھرتے ہریلے کھیتوں میں دور سے آتی ہوئی دیکھوں گا۔

تو رشیم کے مست رنگی اینڈے پر کھیر رکھ کے لائے گی۔ راجہ اندر کے

اکھاڑے کی رقاصہ سبز پر ہی ایسا گوکھرو جڑا جھڑ دار کا کاہی لٹکا اور مست

قصی انگیا پہنے ہوئے۔“

”میں تو کھیر کٹورہاں میں لاؤں گی۔ جو ہنڈ بھر کے لانا ہوتا تو پھر گنڈو دی

کی چاہتا تھی، ہود میں تو رات فری آؤں گی، ایسے ماں پٹ بیجمنوں کا چاندنا ہو

تو ہر، تیں مجھے دور سے آتی ہوئی کیسے دیکھے گا؟“

”ڈیٹھنا دیکھ لیتے ہیں۔“

اس کھٹے میٹھے مذاکرے کے بعد ان میں دوسری قسم کی خلا ملا ہونے لگی۔
گیس کی لالٹیں چاہہری تھیں بجائے زنجنتا میں دیکھنے کے بس بچے جائے، لیکن
اس گیس کی لالٹیں کے چاہنے سے کیا ہوتا۔ وہ انھیں اپنی دل ایسی روشنی
میں سینہ بہ سینہ ہوئے نئے نئے کھیل نکالنے اور ہل چل بچانے سے کیسے
روک سکتی تھیں۔ آج بھی وہ ایک دوسرے میں گویا سرایت ہوئے جا رہے تھے۔
آسمان ریٹھے ایسا کالا چوک ہو رہا تھا۔ برساتی ندی کے طوفان سے
جوبل میں حبیب جھالیں پیدا ہو رہی تھیں پٹرول پمپ کے دونوں دہلی اس
کی گنجائش رہے تھے۔ ایک مریخ میل کے آل جھال جھل پر تاروں بھری رات
کا دھوکا ہو رہا تھا کیونکہ وہاں بے شمار جگنو ٹنگوں کی طرح اڑ رہے تھے۔
جینڈا کوں نے شور مچا رکھا تھا۔ جھینگ بول رہے تھے اور ٹنڈی پون کاہر
ایک جھکورا گاؤں میں دھویا طار کا لہرا لگاتی ہوئی رڈ کیوں کے بولوں کو بڑے
چاؤ کے ساتھ اپنے میں مائے لیے آ رہا تھا۔ ساتھ کے ساتھ کنج سے دوسری
کے پھولوں کی سب سے بھی آ رہی تھی۔ جرنیل سڑک پر جو مزدور ٹرک میں میٹھے ہوئے
گزر رہے تھے ان کے گیت کا یہ ٹکڑا آسمان پر روٹی کے پھل ایسے بادل کی
طرح نضا میں مٹا رہ گیا تھا :

سہی سہی پیسے کل سہی، آدھی رات تذکرک

میں داری کرتار کی، اٹھے یکھے ہوک

گیت کے اس ٹکڑے پر حوروں کی آنکھوں میں آنسو ڈھبائے جنھیں صہ

نے اس کے مرتیں ایسے رخصتوں سے پھیلنے ہوئے دیکھا۔ پھر اسے ملنے کے
سے رنجیدہ خیالات کی مداخلت بے جاناگوار گزرتے لگی۔ خوشی کے لمحوں کا
قصر اسے پسند نہ آیا۔ وہ ایک نخت اس طرح سے کھٹکھٹا اٹھی جیسے کوئی بچہ
خند میں رو رہا ہو، اسے خند کی چیز مل جائے تو وہ تہقے لگانے لگے۔ اس نے
ٹھٹھک ٹھٹھک کر گانا شروع کر دیا :

میری ٹوٹی نقیب کی گونج

پر یسا سے اب نہ بولوں۔ سلام

پھر بوندی اُڑائیں۔ جھکا ہوا بادل جو نور سے گر جاتا کئی ہزار موراہک
ساتھ بولنے لگے۔ سارنگی کے لہرے ایسے دھند یا ملاز کا کوئی بول اب بھی
سنائی دیتا تھا۔ اس کے بعد وہ جھم جھم، جھم جھم، دھو دھو برساک گاؤں
میں جنگی پرندے جیتوں کا پانی خالی کرنے سے قاصر ہو گئے، جو منڈیروں پر سے
پر نکلا جریلی سڑک پانی میں ڈوب گئی تھی اور چرخانے کیل کے دو جی ایک دوسرے
کو جیت رہے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنی جان لڑا رکھی تھی۔
اس اشغال میں تو چور سینہ دھلکا کر ان کی ہر چیز کا صفایا بھی کر جائے تو ان میں سے
کوئی بھی غل نہ ہوتا۔

(۳)

چھپائے کو تو کوئی کھونٹے سے باندھ کر یا پہاٹک نرا ڈگڑے میں بھی جک
کر رکھ سکتا ہے لیکن دوپائے کا روگنا بڑا کھٹن ہے۔ دھوپ لاساں ہریا بھونرالی
رات، یہ جہنم بگڑی آپو ک پڑل پپ پر جا کر مناسطت بازی کرتی تھی۔ اسے

’کوئی گارڈننگ کے ذریعے روکتا ناسکھتا۔ اب تو وہ چسپا چسپا نہیں کھلا کھیل رہی تھی۔‘

پٹواری نے ایک مرتبہ بڑی مناسب تجویز پیش کی کہ صمد اور محدود کا نکاح پڑھادیا جائے لیکن ایک ڈیپو ڈسٹر اور محدود سے گنبد، دوسرے سے لمبھڑ میناسن والی مسجد کے امام ملاشر نے ڈانٹ دی: ”یہ دونوں تو سنگسار ہونے کے قابل ہیں، ان کا نکاح نہیں پڑھایا جاسکتا۔ اس مستانی لڑکی نے بیگم خدیجہ کا نام خوب روشنی کیا ہے۔“ امد ملاشر کے فتوے کو کوئی مسترد کر سکتا تھا۔

دراصل اس پاکباز پر سے کاکوئی بھی مرد محدود ویسی لڑکی سے نکاح پڑھوانے کو تیار نہ تھا۔ اور تیار تھا تو صرف پٹواری دیدہ کا کڈھیلڈ جنگیرا۔ یہ اس لیے تیار تھا کہ اس کی شادی کہیں نہیں ہو رہی تھی کیونکہ وہ اپنی ماں ہی کی طرح کالا کالا منہ سے کم نہ تھا، لیکن بلا کا وقت دور۔ پر یہ سب جانتے تھے کہ وہ ماں باپ کی طرح سے بھٹکی ہے اور اس کا باپ اب بھی جتنا پار کے موضع منگل پورہ میں چربانوں کے گھر کاٹا پھرتا ہے۔ اس کے منہ میں ہر وقت حقہ رہتا تھا اور پیچھے کتا۔

ایک بھرساؤں کے سانچے میں، جب ریشاتی ندی ناگوں ناک بہہ رہی تھی اور ٹل کے پہاڑی جنگل سے بہے ہوئے بھر لپٹے گویا پل کے کھولتے ہوئے پانی میں دیواروں سے ٹکرا کر صیب آوازیں پیدا کر رہے تھے، پٹواری دیدہ مع نصیبو چربان، اس کے بھائی جیسے چربان اور محدود کے دونوں ماموں پٹرول پمپ سے دو فرلانگ فاصلے پر، جانب غرب، شہرے جانے والی بس کا انتظار کر رہے تھے۔ جب یہ پانچوں شہر جانے والی بس میں بیٹھے تو خوب اندھیرا ہو چکا

تھا اور دھواں دھار قسم کے گاڑے بادلوں سے ٹم ٹم بوندیں پڑ رہی تھیں۔
 مردوں والی کے مسافر شہر بعد عشاء پہنچے۔ گو بادل اس وقت تھا ہوا تھا
 لیکن زمین پر جھکی ہوئی گھٹا سے اندھیری چھائی ہوئی تھی۔ انھیں بس نے کہیں باغ
 کے پاس آتا تھا۔ یہاں سے کئے گنبدوں والی کوٹھی، میاں جمعیت کی رہائش
 گاہ، آدھ میل جنوب میں تھی۔

جب یہ دیہاتی کوٹھی کے پاس پھالک پر پہنچے تو اس کے دربار جی آرہی
 کراڑوں کے پاس جا کر چوکیدار کو آواز دینے کی قدرت کسی میں نہ تھی۔ چوکیدار نے
 کچھ سرسراہٹ سی محسوس کر کے آپ ہی ان کی طرف رہبر سے گارڈ کی لائیں ایسی
 روشنی پھینکی۔ جب انھوں نے اپنا دماغ چوکیدار سے بتایا تو وہ ان کامیاب جمعیت
 سے ملنے کے لیے معاون ہوا۔ میاں جمعیت نے اپنے ملازم صدر کی کہانی بگوش
 ہوش سنی اور جب ہی مردوں والی کے لیے اس طرح روانہ ہو گیا جیسے کوئی
 منحل اعظم اپنے باغی صوبے دار کو سزا دینے کے لیے نکلا ہو۔ بڑی لمبی کار
 میں ڈرائیور کے پاس تو میاں جمعیت بیٹھا تھا اور پیچھے شکایت کنندگان۔

جب یہ کار میٹروں میں پہنچی تو اندر تلاطم مچ چکا تھا لیکن ساحل صمد اور
 حدود دہرے پر اسٹے کی حالت میں ہی تھے اور ان میں یہ محبوبانہ گفتگو ہو رہی تھی:
 ”اسے ٹوڑے کا لیے آجی مونچھ نکالے! جو پر اسٹے کے دونوں پہلو ہیں
 میں ہی جٹے ہوئے ایک جگر ہیں تو اچھی بات ہے۔“

صمد: اچھی ساخت زیادہ دیر نہیں عشا کرتی۔ جس طرح سپی کا منہ تھوڑی
 دیر کو موتی بنانے والی بوند کو لینے کے واسطے کھلے اور پھر بند ہو جاتے ہیں اس کا

قیام اتنا ہوتا ہوگا۔ اور سچ، تو میں مجھے کالیا نہ کہا کر۔

حدود : سبحان اللہ! کلمے نے کالا کہا اور دیا، گور سے نے کالا کہا، منس دیا۔ سنا سے گور لیے۔

محمد : تو مجھے گور یا بھی نہ کہا کر۔

حدود : اتیں چارے ہے میں تجھے سا نولا سا نورا سا نودیا کہا کر۔ تیں فی بابتنا مجھے سیام ہرن بڑا ہی اچھا لگے ہے۔

معلوم نہیں بول چال کے چنگو نے کب تک کھلتے رہتے کہ میاں جمعیت نے کھاڑ دھڑ دھڑائے : ”محمد، کھاڑ کھولو“ چاتر باپ کی چاتر اور چوٹیل بیٹی نے گیس کی لائٹیں بجھا کر شمال کھڑکی کھول دی بدھ رکھت میں ہاتھی سونٹا آگاہا تھا۔ ایسا اس نے اس خیال سے کیا تھا کہ مالک پر چھ گچھ کرنے لگے تو وہ کھڑکی سے باہر کو دیکھ دیا کہ پاس چھپی بیٹھی رہے۔ ابھی محمد نے چٹنی نہیں کھولی تھی کہ کھڑکی کی طرف سے انچوں دیہاتی اندر داخل ہو گئے۔ پڑاوی نے آگے بڑھ کر چٹنی کھول دی اور میاں جمعیت نے مارچ کی روشنی میں کیری کی بجلی ایسے پنڈے والی کو اپنے ملازم کے ساتھ اور پری حالت میں دیکھ لیا تھا۔

پھر میاں جمعیت محمد کو کار میں بٹائے ہوئے شہر کی طرف لیے جا رہا تھا۔ کار برساتی ندی کے پل سے گزر گئی تو پار سڑک کے دو جانب ڈیڑھ میل تک مسجد کے میناروں ایسے سفیدے کھڑے تھے۔ ان سے مسجد کا جی زیادہ ہی خراب ہو گیا کیونکہ اسے مہی مریں مینار سی لڑکی یاد آئے تگی۔

وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اب پڑول پھپ پر جانے کے خیال سے کسی کے

دل میں خوشیوں کے سور نہ ناچیں گے بلکہ وہ تو پیر ہیٹ کر مر جائیں گے۔ اس کی آنکھیں رونے کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھیں۔ پھر جمبی شہر کی طرف سے ٹرک آیا جس میں مزدور گارہے تھے :

کوٹھے اُپر میں کھڑی، سبز کبوتر جائے

سیٹی مار بلائے لوں، جوشا بچھڑا جائے

پسں کر اس کے لہر چھوٹ گئی اور ٹپکی کے سبب اتنے گرم گرم آنسو چپکے کہ جلد ہی اس کا دامن بھیگ گیا۔ دھڑکنے کی آس جوتی ہے، اسے اتنی آس بھی نہ تھی۔

اُدھر حمد کو مری پانچوں دیہاتہ ملکی ملکی بوندوں میں گاؤں لے جانا چاہتے تھے جیسے کوئی پہاڑ سے تازہ آئی ہوئی قربانی کی دہی کو مویشی منڈی سے خرید کر گھر لانا چاہ رہا ہو اور وہ آگے کو نہ چلتی ہو، تو یہی حال اس شاخ پیدا ایسی ٹپکی گیری کی بجلی ایسے پنڈے والی کا تھی۔ بجائے حسبِ عادت ٹھک کر چلنے کے وہ تو کھڑی ٹنگ نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے تو گودے گویا بالکل ہی ٹوٹ گئے تھے۔ وہ مجبور ہو کر حمد کو پروے میں اٹھا کر لے گئے اور سات بھر اس پر گویا بکٹ کا پرہ میٹھا رہا۔ اس نے صبح کو گائے کے کھس سے بسنی کھا کر ٹھنڈی لسی نہیں پی جیسا کہ ان کے گھر دستور تھا، کیونکہ صبح ہی سے جلیگر اڈہ صیڑ جھاڑ جھٹلاسا دیکھنے سے کپڑے پہنے ہوئے ان کی ریلیز میں میٹھا سنتی رہا تھا تاکہ اس کا نکاح حمد سے بڑھا دیا جائے۔ اس کا کتا ہر آتے جانے والے کو بھونکتا اور کٹھنے کو لپکتا تھا۔ حمد کے گھر والے اسے دھاڑ کے دے رہے تھے۔

جب ملا شہر نے اس نجس لڑکی کا نکاح پڑھنے سے انکار کر دیا تو خود کی گلاؤں
بجور سے والد سے ایک لالچی کٹ ملا بلوایا گیا اور دو بول کے بعد حوروں پر
میں میٹھی ہوئی پل سے گز رہی تھی۔ اس دہن کے نہ ہا تھ پیلے تختے نہ اس کے
پاس زبرد تھا، نہ یہ بھی وجہی تھی۔ جسے ہر ایک دیکھنے والا ڈال کی ٹوٹی کتا آج پال
کی کپ نظر آ رہی تھی۔ نکاح کے وقت جب اس سے پوچھنے گئے : ”تجھے جنگیرا
قبول ہے ؟“ تو وہ اسی طرح لا تعداد بار ”نہیں نہیں“ کہتی رہی تھی جیسے کہیں
صمد کے ساتھ۔ لیکن اس پہل نہیں اور اس بعد کی نہیں میں یہ فرق تھا کہ وہ نہیں
لگے پی، چپکس بازی اور چوچلوں بھری ہوئی ترتم خیز تھی اور یہ نہیں کہتے
ہوئے وہ بول نہیں رہی تھی بلکہ بلک رہی تھی۔

شرعاً و قانوناً یہ نکاح جائز نہیں تھا اس لیے پڑاری اور کڈھیلو جنگیرے
نے نئی دہن کو قابو میں رکھنے کے لیے سن کے درتے رکھے ہوئے تھے۔ ان
دستوں کی ضرورت انہیں کبھی نہ پڑی۔ اس اُفتادگی میں اس سے بھاگا کہاں جاتا
تھا۔ وہ تو سسکیاں لے رہی تھی۔ پل کے نیچے کھولتے ہوئے سے طوفانی پانی
میں دیواروں سے لگ لگ کر بھر ٹپٹے مہیب آوازیں پیدا کر رہے تھے۔
خاندانوں کی جگہ حمدی کی شادی میں یہ باجہ تھا۔ جنگیرے کی دہن کی آنکھیں تو
رودرک ٹیسوی ہو رہی تھیں اور کھلواں چہرہ جھلایا جھلایا سا، جس کی تمام
جکاجوت اڑ چکی تھی۔

اس پانی پیتے ہوئے میں یہ میل جمنک کے لائن سے پل کو عبور کر کے ریڑھوں کیسر
کی جھلسی ہوئی سیاہ منہ پہاڑوں میں پہنچانے والے تھے جہاں کبھی سلطانہ اور

فقیر جیسے ڈاکوؤں نے اپنی آماجگاہیں بنائی ہوئی تھیں، جہاں انہماج میں اناج اس بھوڑ میں صوف باجرہ ہو سکتا تھا، پھیروں میں پھول انکے پھل کاغذ و پھل اور دانوں میں آواز گیدڑوں اور کرکٹ بھگوں کی۔

کچھ دن بعد محدوں والی میں کسی نے آکر کہا کہ نصیبو چوہان کی وہ گجرا سی بیک ہنس ہلاسی پری مرگئی ہے جس کے منہ میں پٹرول پیپ سے لٹ کر نہ ایک بھیل گئی تھی نہ ایک قطرہ پانی۔ دہلاسی اپنی دلہن کے لیے لالہ مدال میں عروسی پیڑے لے کر گیا تھا لیکن دلہن نے نہ کھائے۔ اس کے پرانی جنگیرے نے کلیسر کی منہ جھسی پھڑپھڑ میں کال دیے تھے۔ یشیر مرداسی کے سناٹا پہلی ہی رات شام سے طاقت آتا تھا۔ ویسے جنگیرے نے محبت اور لڈ پیار کی باتیں کرنے کی بھی کوشش کی تھی لیکن عروہ کے منہ سے ہر گھڑی بس "نہیں نہیں" ہی نکلتا رہا تھا۔ پھر گویا اس کی کانپ اس طرح سے توڑ دی گئی تھی جیسے چری کے ٹخنہ کے کوپدی پر سے توڑیں تو رشتہ سے دو ٹکڑے ہو کر الگ الگ جاگے۔ تپلی کمر میں یہی بڑا نقص ہوتا ہے۔

اچھا ہی سما جو نصیبو چوہان کی کرم پھوٹ جانی زبردستی کے شوہر کے زور ظلم سے ایک ہی رات میں مر گئی۔ عورتیں کو سنا دیا کرتی ہیں: "الٹی، تو لہماتی جائے" "صمد سے بچ کر اس کا زندہ رہنا تو بہر صورت محال تھا لیکن جبر جبر مرنے سے لہماتے گزر جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔

تیاری

اللہ داد جب تیا صاف سر پر لپیٹے۔ اجلی قمیض اور دھوٹی پہنے پاؤں میں
سرخ پوٹو ہاری جو تاڑا لے صحن میں آیا تو خدیجہ کو فوراً بات کھٹک گئی مگر بندوٹی
حیث سے بولی ”چاچا کہیں جا رہے ہو؟“

اللہ داد نظریں ملائے بغیر بولا ”ہاں بیٹی یہ اپنے ملک جی ہیں نا۔ ماشا اللہ اُن
کی بیٹی کی کل رات ہے بس وہیں جا رہا ہوں۔“

”بلا ما آیا تھا؟“ خدیجہ نے انجمن ہی کر پوچھا۔

”ہاں بیٹی۔“ اللہ داد نے ذرا ڈھیلے پن سے سر ہلایا تو خدیجہ سر ہو گئی
”سچ بتاؤ چاچا کیسا بلا ما تھا؟“ اللہ داد قد سے سٹ پٹا گیا، پہلے اثبات اور
پھر نفی میں سر ہلا کر بولا ”دراصل وہ قنا توں کے باسے میں پوچھنے آئے تھے
میں نے کہہ دیا کہ بھائی اپنے سامنے گلوں گا تمہارا کیا ہے اگر کہیں کسی بوٹے
میں چوب گاڑ دو تو۔“

”تمہیں کیا کہیں گاڑیں چاچا۔ پر تمہیں تو شادی والے گھروں کے گرد
منڈلاتے رہنے کی بری عادت ہے۔ بھلا بن بلائے بھی کوئی یوں کرتا ہے؟“
خدیجہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

اور کاٹے میں جیب اللہ داد اپنی دکانداری اُجاڑ بیٹھا اور اس کی جیب خالی ہو گئی تو وہ لوگ جہاں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کے کان میں میٹھی میٹھی سرگوشیاں کرتے تھے وہ بھی غائب ہو گئے۔ اب وہ خالی دکان پر بیٹھا کھجیاں مارا کرتا اور ان لوگوں کے لیے ترسا کرتا۔ کبھی میٹھے میٹھے سے محسوس ہوتا جیسے کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔

اللہ داد تیرے لیے بہت اچھی لڑکی ڈھونڈی ہے پر تمہیں سو روپیے لگیں گے۔

”تمہیں سو روپیے کی کیا بات ہے میاں تم بات چلاؤ۔ وہ مڑ کر دیکھتا اور اپنی اکیلے آواز کی گونج سنتا۔ شادی کے بہانے لوگوں نے اس سے خوب روپیہ بٹور لیا تھا اس سے دودھ کے کٹورے پر پڑھا دیا تھا۔ مگر وہ تراب بھی دھو کا کھانے کو تیار تھا۔ مگر اب اس کی خالی جیب سے کسی کو دلچسپی نہ رہی تھی۔ پھر ایک دن اس نے دکان بند کی اس کا پٹا گل اٹا تاہم درمی میں لپیٹ کلاہورا پہنچا۔ خوش قسمتی سے وہ ٹھیک اس دن لاہور پہنچا جس دن چودھری منظر دہائی ممبر منتخب ہوا تھا۔ اور گلی کے جوان اسے کندھوں پر بٹھائے ہڑے ہڑے کے نعروں لگاتے گھر کی طرف لا رہے تھے۔ اور گلی کی ساری فضا چودھری زندہ باد اور محافل ممبر کی مراد باد سے گونج رہی تھی۔ درمی میں لیٹے اپنے گل اٹانے کو سر پر رکھے اللہ داد نے یہ سارا تماشا گلی میں کھڑے ہو کر دیکھا۔ پھر جب شیخ جی کے گھر کے سامنے چودھری کو دستار بندی کے لیے کندھے سے اتارا گیا تو وہ دل میں اپنی برادری کے اس ہونہار سپوت پر صد آفریں کہتا گھر کے اندر داخل ہو گیا۔

بے حد مضطرب مگر خوش خدیج نے اس کی آمد کو نیک غل سمجھا۔ یوں بھی دل کی وہ اچھی تھی اس لیے فوراً ہی بارہوی کے اس اجڑے پچڑے بے یار و مددگار آدمی کو چاہا کہ خطاب سے نوازا دیا۔

یوں وہ یہاں آباد ہوا۔ ڈیوڑھی سے متصل ایک کمرہ اسے دے دیا گیا جس کا ایک دروازہ باہر کو کھلتا تھا۔ اسی کمرے میں چودھری سے سو روپے ادھار لے کر اس نے پرچوں کی دکان کھول لی۔ اگلا حصہ دکان کا تھا اور پچھلے حصہ میں اس کی کھاٹ، بستر، چند المونیم کے برتن، ایک چھوٹا سا ٹین کا بکس رکھا تھا۔ اس کے آنے سے چودھری اور خدیج کو بڑا آرام ملا تھا۔ ایک طرف سودا سلف لانے، بچوں کو کھلانے، بھلانے کا انتظام ہو گیا تھا دوسری طرف چودھری کی مبری کی تشہیر کا ذریعہ بن گیا تھا۔ چودھری سے بالا بالا وہ اس کی مبری کا رعب بھلتے دلوں پر آتما تارہتا تھا۔ ہر بات شروع کرنے سے پہلے وہ یہ ضرور کہتا :

”بھئی ہم تو حکومت کے آدمی ہوئے۔“ اسی رعب میں اس نے ٹکلی اور ٹکلی سے متصل کوئی چندرہ سولہ گز چوڑی اور بیس گز لمبی گراؤنڈ پیفہ جھانٹا جبار رکھا تھا۔ گراؤنڈ کو موجودہ شکل بھی اسی نے دی تھی۔ پہلے یہاں وصول اڑتی تھی۔ اور گوجرؤں کی غلامت بھری رہتی تھی۔ ٹھنڈی دھڑلے دن لڑکے گیند بے پیڈ اور دشتانے پیچھا ہاں آجاتے۔ ان کی گیندوں سے نہ راہ چلتے دلوں کے سر محفوظ تھے نہ مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازے کے شیشے۔ کئی بار تو گیند اس کے پاس سے یوں دبا ٹٹنے سے گزرتی کہ وہ اپنی ناک ٹوٹتا رہ جاتا۔ پھر یہاں تاش

کھینے والوں کی منڈیاں بھی جیتی تھیں جو اونچی آواز میں گالم گلوچ کرتے، بڑی بیہوشی سے ہنستے تھے۔ گلاب یہ سارے سلسلے بند ہو گئے تھے۔ اب گراؤنڈ میں سبز خلیں گھاس کا فرش بچھ گیا تھا۔ پھولدار پودے لہلہانے لگے تھے۔ اور موٹی باڑھ کے گرد نوکدار تار لگا دیئے گئے تھے۔ اب لوگ گرمی کی شاموں میں احمد سڑی کی مدھروں میں وہاں بیٹھے سولیاں اور سنگڑے نمک لگا کر کھاتے اور گنڈیریاں چوستے تھے۔ البتہ کرکٹ امداد تاش کھیلنے والے اللہ داد کے دشمن ہو گئے تھے وہ ان سے کئی بار نبرد آزما ہو چکا تھا۔ وہ کھاٹ پر بیٹھا امینان سے حق پی رہا ہوتا کہ کوئی لڑکا چپکے سے کان میں آکر کہہ دیتا۔

وہ چاچا گراؤنڈ میں تاش ہو رہی ہے پر تم آج ادھر نہ ہی جاؤ تو اچھا ہے صبر رخان بہت غصے میں ہے۔“

آخری فقرہ محض اسے چیلنج کرنے کے لیے کہا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلتا۔ اللہ داد فوراً ٹھکڑا ہوتا۔ اپنا کھیس کوڑ اور ٹوپی اتار کر کھاٹ پر رکھ دیتا۔ پھر وہ بے قدم گراؤنڈ کی طرف بڑھتا۔ اس کا قد چھوٹا تھا اور قد کی نسبت بازو بہت لمبے تھے چلنے میں وہ بوں آگے پیچھے کی طرف جھرتے کہ کبھی تو اس سے بہت آگے نکلتے نظر آتے اور کبھی بہت پیچھے رہتے دکھائی دیتے۔

کر کے قدم سے خمیدہ ہو جانے سے اس کا قد باڑھ کی اونچائی کے برابر رہ گیا تھا۔ یوں اندر بیٹھے والوں کو وہ اس وقت تک دکھائی نہ دیتا جب تک وہ

بقی کے سے قدموں سے چلتا ان کے سروں پر نہ جا پہنچتا۔
 ”کیوں بے حکومت کے آدمیوں کے سامنے یہ کام کرتے ہو دوسری
 سال کے لیے اندھ کر مادیوں گا۔“

لڑکے بوسے کو یوں آٹا آٹا سروں پر چھایا دیکھ کر گھبرا کر کھڑے ہو جاتے
 امدام طور پر مزاحمت کی بجائے مصالحتہ رویہ اختیار کرتے۔

”چاچا چا صاف کر کھیل جا ہر اسے آدمہ گھنٹے بعد آٹھ جاٹیں گے۔“
 ”اب بے حکومت کے آدمی کو جھانسنہ دیتے ہو۔“ اللہ داد جھپٹ کر پتے
 ہاتھ میں دلیر لیتا۔

”جادو گھروں میں ماؤں کے پاس بیٹھ کر کھیلو وہاں کیا ڈر ہے۔“
 اب کسی نہ کسی لڑکے کو طیش آ جاتا اور وہ لپک کر اللہ داد کے گریبان میں
 ہاتھ ڈال دیتا۔

”آج تو حکومت کے آدمی کی ایسی کی تھی ہی کسوں گا۔“
 ”ابے جا۔“ اللہ داد آگے کو گھٹٹا مہا ہاتھ چلاتا۔ دو چار دھولیں بکھلتا
 کچھ ہاتھ مارتا بھی۔ پھر اس دھواں وہ بندر کی طرح اس طرح چھٹتا چلاتا اور شور
 مچاتا کہ لڑکے بدحواس ہو کر اسے چھوڑ دیتے اور باٹھ پھیلا لگ کر باہر نکل جاتے۔
 پھر اپنی اس کم مٹی پر شتمل ہو کر خوب گایاں دیتے۔

”خزیر کے بچے کیسے کسی دن اپنے ہاتھ سے تیرا جنازہ اس گراؤنڈ میں
 گاٹوں گا۔“

”دوسرا کتنا۔“ چودھری کا لحاظ ہے نہیں تو آخر وہیں ڈھیر کر دیتا۔“

تیسرا پہنکارتا - "بڑھا نصیحت مرتا بھی نہیں مجھے بھر کو آگے لگا رکھا ہے۔
چوتھا مذاق اڑاتا "ابھی کیسے مرے ابھی تو یہ سُنک کی اولاد دِلنس ڈھونڈ
رہا ہے۔"

پہلا پھر پلٹ کر جواب دیتا "اس مردہ کی دلہن اب موت بنے گی اور دونوں
کانکراج میں چڑھاؤں گائیں۔"

اللہ داوگر پر ہاتھ رکھے خاموشی سے یہ باتیں سنتا اور فالتاحہ متفسر سے مسکراتا۔
یہ مسکراہٹ لڑکوں کے لیے چیلنج کا اثر رکھتی وہ دانت میں پس کر گائیاں دیتے۔
"کل نئے تاش لے کر آئیں گے دیکھیں گے کون ہوکتا ہے ہمیں۔"

"تو تاش کیا لائے گا تیرے تو بیاہ کے تبنو بھی بیدل کاٹنے نہ دوں گا۔"
اللہ داوگر مسکرا کر کہتا۔

"ابے جان خوش نہیں تو ابھی تیرا بڑا بھڑق کر دوں گا۔ لڑکا دُور سے مٹا رہا۔
یہ تو سکھ لڑکوں کے ٹل جانے سے ختم ہو جاتی۔ اللہ داوگر کا انداز سے گراؤنڈ
کے دو چار چکر کاٹتا پھر اپنی کھاٹ پر اک بیٹھ جاتا اور حقہ پیتے ہوئے خود بخود
ہنستا رہتا۔ "ابھی تو دُوبیسی عمر ہوئی ہے ابھی کہاں مردوں گا۔" وہ ہنستے ہوئے
اونچی آواز میں بڑبڑاتا۔ قریب لڑکوں کی ٹولی کھڑی سُن لیتی تو کوئی لڑکا چھیرنے
کو کہہ دیتا۔

"چاہا قبول کرتا ہے تیری عمر دُوبیسی نہیں ہو سکتی۔"
"پھر کیا ہو سکتی ہے۔" وہ حقے پر ہاتھ رکھے آنکھیں سکیڑ کر لڑکے کی
طرف دیکھتا۔

”یہی کوئی چار بیسی ہوگی“

”کر لو بات“ وہ حق پر جھک کر بے یقینی سے سر ہلاتا۔

”میرا بھی خیال ہے چاہتا ہمدی عمر زیادہ نہ ہوگی ابھی تو تم بالکل جوان نظر

آتے ہو بس تم جلدی سے شادی کر لو تو سب کی زبانیں بند ہو جائیں۔“

اشدداد بڑے اخاذ سے مسکراتا۔

”اسی وجہ سے تو وہاں سے بھاگتا تھا۔ بیسیوں لوگ پیچھے پڑے تھے۔ کوئی گنتا

دوسر۔ کوئی گنتا تیس سو۔ کوئی گنتا پانچ سو وہ شادی کر عادیں۔ میں نے بھی خوب

پیسہ لایا۔ پر اتنی لڑکیوں سے کون بیاہ کرتا یہاں بھاگ آیا ہوں۔ پیچھے ڈھونڈتے

پھر رہے ہوں گے مجھے۔“

”پھر اب کیا ارادہ ہے چاہا کوئی لڑکی وڈکی ڈھونڈی یا نہیں۔“

اشدداد بے پردہی سے حق پر جھکا حق گڑا گڑا تا رہا۔ پھر بغیر سر اٹھائے

کہنا۔ ”پیلو کی ماں سے کہہ رکھا ہے۔ وہ کوشش کر رہی ہے۔ دیکھو کیا بنتا ہے۔“

”ہاں چاہا کچھ نہ کچھ بن ہی جائے گا ابھی ایسی جلدی بھی کی ہے۔“ لڑکے

ہنسی سے بے تاب ہو کر ادھر ادھر بکھر جاتے اور وہ حق پر ہاتھ رکھے اپنے

ڈھلکے چوٹے اٹھا کر انہیں پیچھے سے دیکھتا اور سوچتا۔ ان لڑکوں کے بیاہ

کب ہوں گے۔

مجھے کے تقریباً سارے لڑکوں کا حساب لگا رکھا تھا اور جب کسی لڑکے کے

سانے سبز، سرخ جھنڈیاں لگنی شروع ہوتیں۔ تو اس کے پاؤں خود بخود زمین سے

اوپر اٹھ جاتے۔ اور اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے کندھوں پر بڑا بھاری

آئے ہیں اور وہ چڑیوں کی مانند ہکا بھیکا ہو گیا ہے۔ اس کہانوں میں دوڑتا ہوا سرد خون بھی گرم ہو جاتا تھا اس کے چہرے کی تجڑیاں دیکھنے لگتیں۔ جب سے گراؤنڈ میں تقاتیں لگنے سے پہلے لوگوں نے رسمی طہ پر اسے اطلاع دینی شروع کی تھی، تب سے اس کی اہمیت خدا اپنے آپ میں بڑھ گئی تھی۔

اس دن ڈراما ٹراپچر تھا۔ موسم بھی ابراؤ تھا۔ اور سہ پہر میں ہی شام کا سماں پیدا ہو گیا تھا۔

اللہ داد پرانے کوٹ پر موٹا کیس بیٹھا اور سر پر اپنی ٹوپی پہنے مکان کے اندر چمکی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ جیسی تین تانگے آگے پیچھے کھڑکھڑاتے ہوئے اس کے پاس سے گزرے اور گھوم کر گراؤنڈ کی پرلی طرف چلے گئے۔ اللہ داد نے چونک کر سر اٹھایا پھر ٹوہ لینے کے لیے وہ گردن اونچی کر کے سامنے دیکھنے لگا تینوں تانگے گراؤنڈ کی پرلی طرف کونے کے ایک مکان کے سامنے جا کھڑے ہوئے تھے۔ اداان میں سے مردوں، عورتوں اور بچوں کی سواریاں اتر رہی تھیں۔ اللہ داد آج دن بھر مکان سے باہر نہ نکلا تھا اور بغلوں میں ہاتھ دبائے بیٹھا اونگھتا رہا تھا۔ اب اسے حیرت سی ہوئی۔ اس مکان کے سامنے کافی چیل پیل سی نظر آ رہی تھی۔ مگر کچھ پھکی پھکی اور بے جان سی۔ مردوں کی دو تین ٹولیاں مکان کے آس پاس کھڑی تھیں۔ چند بچوں نے ایک چھابڑی والے کو گھیر رکھا تھا اور وہ اس سے ہونگ پھلی ریوڑیاں اور شکر قند کی خرید رہے تھے۔ چند عورتیں بچوں کو کولہوں پر دبائے مدد مانگ رہی ہیں اور چند یاہر نکل کھڑی تھیں۔ اور مسکرا مسکرا کر ایک دوسری سے باتیں کرنے کے علاوہ خریداری میں بچوں کی مہمنائیں بھی کر رہی تھیں۔ اللہ داد

آنکھیں جھپکاتے ہوئے سامنے دیکھتا رہا۔ کچھ دنوں پہلے اس مکان میں نئے کرایے دار کر رہے تھے۔ اور اس نے اس گھر سے صرف ایک سفید تریاق سی مارٹھی اور پٹن والے آدمی کو نکلتے دیکھا تھا۔ وہ آدمی خالچ زدہ تھا۔ اور چند بار چیونٹی کی چال چلتا اس کی دکان کے سامنے سے بھی گزرا تھا۔

’لوٹ کی کا بیاہ ہوگا‘ — اللہ داد سوچتا ہوا کچھ بے چین سا دکان سے باہر نکلا اور بارگ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس نے ایک سمت میں چکر لگایا پھر وہ گراؤنڈ کے اندر چلا گیا۔ گھاس مرسم سرسایا جب سے بھوسلی ہو چکی تھی۔ نو عمر اونگے بونگے سے پردے بھی بے برگ کھڑے تھے۔ اللہ داد نے پاؤں سے ردھ حصوں کو اور دھڑا دھڑا چکایا پھر کچھ ٹوٹی ہوئی کانٹے مارٹھیوں کو اٹھا کر باڑ کے پاس پھینکا دیا۔ پھر وہ گراؤنڈ سے باہر نکل آیا۔ اچانک عورتوں اور بچوں کی ہیش کی ہیش آئی اور پرٹی طرف نکل گئی۔

پھر ایک آدمی بڑا سا دیکھا اٹھائے گھر کے اندر چلا گیا۔ اللہ داد ٹھٹھک کر سامنے دیکھتا رہ گیا۔

اس دیکھے میں لایچھویں اور موٹی تہہ دار ملائی والی میٹھی چائے کے گے۔ اور خستہ باقر خانیوں کے ساتھ پی جٹے گی۔ اس نے گھر کے اندر عورتوں بچوں کے ہجوم انسان کے خوش کن شور کو اپنے تصور میں دیکھا اور سنا۔ پھر اس نے اس گرنی کو محسوس کیا جو انگلیٹھیوں میں دھکتے کوٹھے پیدا کر رہے ہوں گے۔ پھر اس نے ہنسنی اور گرٹنے کی خوشبو کو سونگھا۔ پھر اس نے ان عورتوں کے متعلق سوچا جو چھوڑے گدگد سے بچوں کو گرم کپڑوں میں پیٹے ایک دوسرے میں گھسی میٹھی گپتیں اڑا رہی

ہوں گی۔ اچانک ڈھونک کی آواز نے اسے جھٹکا دیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے اس
 ہو گیا۔ اس نے سردی سے کپکپاتے ہوئے محسوس کیا کہ وہ اس بھری پری کائنات
 میں بے حد اکیلا اور تنہا ہے۔ مگر دوسرے لمحے اس نے اپنی اداسی کو جھٹک دیا۔
 اور سردی رونق اور گرما گرمی کو اپنے اندر محسوس کیا۔ ساری بات ترویح کے اندر
 کی تھی۔ اتنے میں پیلو باہر نکل آیا اور بولا: ”چاچا سردی میں کیا کر رہے ہو؟“
 اللہ داد نے چپک کر اسے کندھوں پر بٹھایا۔ پیلو نے بھی چپیل پیل کر
 محسوس کیا اور بولا۔

”چاچا وہ کیا؟“

”بیابان۔“ اللہ داد نے سرگوشی کی۔

”اور تمہاری چلم کے لیے بڑے بڑے سرخ انگارے۔“ دونوں ہنس
 پڑے باڑھ کے ساتھ اس نے پیلو کو دو تہی پکڑ دیئے پھر جب اس کی سانس
 پھول گئی تو پیلو کو نیچے اتار دیا اور بولا۔

”تم یہیں کھڑے رہنا ابھی کوئی قاتل کو پوچھنے آئے گا میں کپڑے بدل
 کر آیا۔“

وہ دکان کے اندر گیا اور دروازہ بھیر لیا۔ جب وہ دوبارہ باہر آیا تو پیلو
 نے بغور اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اچلے پڑوں پر وہی پرانا کٹا اور کھین تھا۔
 ”چاچا تیرا بیابان کب ہو گا؟“ پیلو نے معصومیت سے پوچھا۔

اللہ داد ہنس پڑا ”اپنی ماں سے کہو نا ذرا جلدی کام بنادے۔“

”اچھا چاچا۔“ پیلو نے اثبات میں زور سے سر ہلایا۔

رات کا اندھیرا تیزی سے اترتا آ رہا تھا۔ اور گھر کے سامنے ابھی تک روشنی کا انتظام نہیں کیا گیا تھا نہ ہی کوئی دوسرا سامان دکھائی دے رہا تھا۔ البتہ مکان سے باہر مردوں کی تعداد میں کچھ اضافہ ضرور ہو گیا تھا۔

معاذ اللہ داد کو جنگلی کیکر کے گھنے اندھیلے ہونے درخت کی اوٹ میں ٹرک کی باڈی دکھائی دے گئی۔ ”اچھا تو سامان ٹرک میں آیا ہے۔ پھر تو ابھی ساری تیار ہی ہو جائے گی۔ قتائیں، کرسیاں، میزیں سب کچھ لگ جائیں گی اور روشنی بھی ہو جائے گی۔“ اس نے پُرسترت اضطراب سے پیلو کے ایک دھول لگائی۔ ”سُن دینا جب تیرا بیاہ ہو گا تو اس گراؤنڈ میں تیرے بیاہ کی قتائیں میں لگائیں گا۔“ اسی طرح سر بھی میں بازو صوں گا۔ اور گھوڑی پر بھی میں ہی تجھے بٹھاؤں گا، سنا تم نے؟“ پیلو اللہ داد کی اس قیاسی پر جھینپ گیا پھر احسان چکانے کی خاطر ہلا۔

”چاچا جب میں دولہا بنوں گا تو اپنا شہ بالا تجھے بناؤں گا کیوں چاچا؟“

”ہاں... اللہ داد نے قہقہہ لگایا ایک ادبچانے نکسا اور جوان قہقہہ جس کی آواز بلاشبہ گراؤنڈ کی دوسری طرف سنی جاسکتی تھی۔ مگر ادھر بکا بکا شہرا بھر رہا تھا۔ اور جب اللہ داد نے قہقہہ لگا کر سامنے دیکھا تو اس کا منہ کھلا دیا گیا اس نے ایک ایسی چیز دیکھی جسے وہ سنائے میں دیکھتا رہ گیا ٹرک اب گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ اور وہ خالی تھا بالکل خالی۔ اور گھر کے دروازے میں سے کوئی چیز بہت سے سروں کے درمیان نہایت خاموشی سے باہر لائی جا رہی تھی۔ شام کا دھندلکا ادھات کی تاریکی لگے مل رہے تھے۔ اور فاصلے کی وجہ سے واضح طور پر کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔

”چاچا کیا ہوا۔“ پہلو اس کے اچانک خاموشی ہونے پر حیرت سے بولا،
پھر وہ بھی اسی سمت دیکھنے لگا۔

”شک“ وہ اس کی توجہ کا سراغ لگا کر خوشی سے بولا اور اپنی انگلی اسی
سمت میں اشاری۔ مگر اللہ داد خاموش رہا۔ ادب بچک جھپکے آنکھیں پھاڑے
اُدھر دیکھتا رہا۔ بہت سے سروں کے درمیان وہ چیز شکر کی جانب رینگ
رہی تھی تب اسی لمحے اس نے اس تاریک خاموشی میں سے ایک وحشت ناک
چیخ کو ابھرتے سنایک آدمی گیس لیپ کو لیے مجمع میں شامل ہو گیا تھا۔ اور
اس کا درد روشنی میں آگے کو متحرک چہرے پر ہمارا اور ہیبت ناک دکھائی دے
رہے تھے۔ اور ان کے ساتھ وہ آواز تھی، ٹھنک سے چور لہنتی آواز جس میں
ساری کائنات کا دکھ مشا ہوا تھا جو شاید جیتے دفنوں کی خوشیوں پر فوج خواں تھی۔
جو ماضی کی آواز تھی اور جس کا کوئی مستقبل نہیں تھا۔ جو برسا برس کے ساتھ کی
جدائی کے غم سے کانپ رہی تھی۔ جو ناناچی تھی نہ نیچی تھی جو ایک ہی کمر و زور
لڑناں سر میں گلے سے نکل تھی، اور ٹوٹ گئی تھی۔ اکیلی اور تنہا آواز جیسے کوئی
سوت خود اپنی موت پر روئی ہو۔

اللہ داد نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھے لیے اس کا سر جھجک گیا۔
اس وقت اس نے محسوس کیا جیسے اس کا وہ بے فکر اور اونچا قصہ خلا میں
معلق ہو گیا ہے اور وہ اس کی روج کو پامال کر دینے والی بے سُرخی آواز کو اب
اور اس کے بہت بعد بھی سن سکتا ہے۔

(”ماہ نو“ کراچی)

ڈیپٹی کمشنر

انہوں نے یہ تمام سفر ایک نفرتی رنگ والے فرسٹ کلاس کپارٹمنٹ میں طے کیا تھا۔ اس طرح وہ سفر کی تمام دقتوں سے بچ گئے تھے۔ بھاری سامان تو خیر ٹھیک کر دیا گیا تھا۔ البتہ ایک ہولڈال، ایک سرٹ کیس جس میں کچے کپڑے اور زیورات وغیرہ تھے۔ ایک ٹفن باسکٹ اور ایک ٹوکری جس میں مختلف قسم کے پھل وغیرہ بھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے پاس ہی رکھ لیے تھے۔ ہولڈال نے مسعود جمال کے لیے بڑی آسانی پیدا کر دی تھی۔ وہ جب بھی سفر کی طوالت سے گھبرا جاتا اور زہمت کی باتیں بھی ختم ہو جاتیں تو وہ دھیرے سے اٹھتا اور ہولڈال میں ٹھس جاتا۔ گھستے ہی بخانے اس کے ذہن پر کیسا جادو سا چھا جاتا کہ اس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگتیں۔ پوٹے خیند کے بوجھ سے بھاری ہو جاتے۔ اور تھوڑی دیر بعد ہی وہ خوابوں کی طمسائی وادی میں نکل جاتا۔ زہمت کو تو کبھی سفر کے دوران یاد نہ آتی رہتی۔ چنانچہ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد سرٹ کیس کھول کر دیکھ لیتی۔ پھر پھلوں کو ٹوکری میں سے کوئی گدما سا امرود نکال کر اسے گہری کی مانند کترنے لگتی۔ اور ٹفن باسکٹ کے استعمال کی جگہ سے سفر میں نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ چونکہ ان دونوں کو سفر میں جھوک کم ہی لگتی تھی۔ بھاری سامان جو ٹھیک کر دیا گیا تھا:

بٹے بٹے بھاری ٹنگوں اور ایک کڑی کی بڑی کھوپڑی پر مشتمل تھا۔ ان ٹنگوں میں سے آدھے ٹنگ کتابوں اور تصویروں سے پر تھے۔ بقیہ ٹنگوں میں گرم کپڑے، لحاف اور اسی قسم کی دوسری چیزیں تھیں۔ کڑی کی میٹھی میں پانچ نو بند نفل اس قدر تھیں اور تصویریں مسعود جمال نے بڑی محنت سے جمع کی تھیں۔ اس کی آدھی تنخواہ اسی مد پر خرچ ہوتی تھی۔ اسے کتہ میں اور تصویریں جمع کرنے کا جزیہ تھا۔ وہ ہر قسم کی کتابیں پڑھتا تھا۔ اور ہر قسم کی تصویریں جمع کرتا تھا۔ چنانچہ اس کی کتابوں کے ذخیرے میں سینچو کے مجموعوں اور ارسطو کے مقالات سے لے کر ہر قسم کے کوک شاستر تک شامل تھے اور اگر تصویروں کے اعتبار میں مائیکل اینجلو کے شاہکاروں سے لے کر گھٹیا قسم کے امریکی رسالوں کی اشتہاری تصویریں تک بل سکتی تھیں، تو یوں بھی ہوا تھا۔ مائیکل اینجلو کی بنائی ہوئی ایک شائع شدہ تصویر حاصل کرنے کے لیے اسے اپنی پوری تنخواہ خرچ کرنا پڑی تھی۔

وہ بہادر لڑکے کو ہمیشہ کے لیے اپنے پیچھے بہت دور چھوڑ آئے تھے۔ سالانہ ہوتے وقت مسعود جمال نے حسبِ عادت اپنے سرکاری چپڑاسی کو بہت سا انعام دیا تھا۔ الوداع کہنے کے لیے آئے ہوئے معزز میزبان اور سرکاری افسران سے بڑی گرم جوشی کے ساتھ معاہدہ کیا تھا۔ یک اسٹال سے ڈھیر سارے حلے اور انبرد خریدے تھے۔ اور پھر گاڑی چلنے پر وہ ریٹنگ کمپارٹمنٹ کے دروازے میں کھڑا اپنا سفید رومال ہلاتا رہا تھا۔ حتیٰ کہ جب بہادر لڑکے کا زرد دھبوں والا ٹی شرت بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اور پلیٹ فارم پر ہلتے ہوئے الوداعی ہاتھ دھکراتے ہوئے رنگ برنگے رومال بھی دکھائی دینے بند ہو گئے۔ تب بھی وہ

کیڈٹنٹ کے دروازے میں کھڑا اپنا اعمال ٹھہراتا رہا۔ ٹھہراتا رہا۔ اور آخر تک ہار کر واپس اپنی بوتھ پر آکر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے ہزٹن پر پھیلتی ہوئی مسکریٹ گہری ہو گئی۔ اس کے چہرے کی تشنگی اور چمک دمک میں اضافہ ہو گیا۔ اور پھر ہزٹن ہوئی آنکھوں سے اپنی بیوی نہرت کے شعلہ و شبنم آسا چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ جو کھلائے ہوئے بھول کی مانند اس اور اس دکھائی پڑ رہا تھا۔ ”یہ میرے خوابوں کا چہرہ غمزہ سا کیوں ہے؟“ یہ پوچھنے کے لیے وہ لبوں کو جنبش دینے ہی والا تھا کہ نہرت بول پڑی۔

”یہ تم اتنے رملے اور اخبار بھلا کیوں خرید لائے؟“

”چونکہ میں ان کو خریدنا چاہتا تھا۔“

”سفر بہت لمبا ہے؟“

”ہوں۔“

”کیسے کئے گا؟“

”میں تو اتنا طویل سفر میں اسی خوشی میں کاٹ لوں گا کہ کل آنے والی صبح تک میں اس ضلع سے بہت دور نکل چکا ہوں گا۔ اور کل کا سو بجے مجھے اس ضلع کے فضول اور ذیل قسم کے لوگوں میں الجھا ہوا نہیں پائے گا۔ نہرت نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور وہ اٹھ کر ہاتھ دھو میں چلا گیا۔ وہاں سے واپس آکر اس نے ایک مسکریٹ سلگایا۔ اور دوبارہ کیڈٹنٹ کے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ وہ کبھی کبھی سڑک نہرت کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ اور اس کے ہزٹن پرست آگین مسکریٹ پر کچھ جاتی تھی۔

اور جب ان کی ریل نے مدیا نئے سٹیلج کا سیب اپنی ٹلی عبور کیا اور دھڑ دھڑاتی ہوئی پنجاب کی سرحدوں میں داخل ہوئی۔ تو نہ ہت کے ذہن کو کیبلنگ جھٹکا سا لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا، جیسے دوزخ کے لپکتے شعلہ یکدم جنت کی فرحت بیز ہوائوں میں تبدیل ہو گئے ہوں۔ لیکن اسے یہ فرحت بیز ہوائیں اچھی نہ معلوم دیں۔ جب دل شعلوں میں جلتے جلتے ایک انجانی سی لذت محسوس کرنے لگے۔ اور پھر اس سے وہ لذت چھین لی جائے۔ تو بڑی ناخوشگواری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اور پھر یہ احساس نہ تو فرحت بیز ہوائوں سے ختم ہو سکتا ہے اور نہ شا و اب محبوبوں سے۔ یہ ہوائیں یہ محبوب کے احساس کو اور زیادہ بھر پور کرتے ہیں، ادا ہوائوں، ان محبوبوں کو ٹھکر کر دل اپنی انھیں دوزخوں میں جلتا چاہتا ہے۔ جن کے شعلوں نے اسے وہ انجانی سی، اپنی سی لذت بخش تھی!

مسعود جمال، ہولڈال میں گھسائیندے گھوڑے میں محبوس رہا تھا۔ نہ ہت نے اپنا سفر سے رنگوں والا چہرہ سیٹ کے ساتھ والی کھڑکی سے باہر نکال کر دیکھا تو اکثر بکے نیلے کانچے آسمان پر کہیں کہیں سفید بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ دودھ تک کھیتوں میں ہرے خندیں قالین بچھے ہوئے تھے۔ ٹلی عبور کرنے سے پہلے وہ جو کبھی کبھی ریت کے ٹیلوں کا درد تک چلا گیا سلسلہ دکھلائی پڑ جاتا تھا۔ وہ اب ختم ہو چکا تھا۔ گرد و غبار دب گیا تھا۔

قواب ریت کے ٹیلے کبھی دکھلائی نہ پڑیں گے۔ اب گرد و غبار حیر سے پر کبھی ریت کی تہیں نہ جھانے گا۔ اب وہ صحراؤں سے اٹھنے والی آندھیوں کے

ناچتے ہوئے بگولوں کو کبھی نہ دیکھ سکے گی۔ اس نے بے حد اس ہو کر سوچا اور پھر
 گھر کی بند کے مسعود جمال کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے بچوں کے ایسے معصوم
 چہرے پر غینہ کے پراسرار ساٹھے پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے خوبصورت گھونگولے
 بال ابھی تک گھنے تھے۔ اس کے چہرے پر ابھی تک جوانی کی چمک باقی تھی۔ اس کی
 سنو لائٹ میں ابھی تک سرخی کی لہریں گردشیں لے رہی تھیں۔ اس کی گردن دیکھ
 کر اب بھی خیر پور ٹامبولی کی نازک نازک صراحیاں یاد آ جاتی تھیں۔ اور یہ سب کچھ
 اس جیسے تھا کہ اس کے چہرے وجود کے خطوط اور نقوش بے حد باقاعدہ انداز میں
 تھے۔ جیسے ان خطوط اور نقوش کی تراش تراش میں اللہ نے خاص احتیاط برتی
 ہو۔ اس کی چمکیں اور خوبصورت سیاہ آنکھیں دیکھ کر خواہ مخواہ یہ احساس پیدا ہوتا
 تھا۔ جیسے وہ ایک غنائی شاعر ہے۔ جو شعر و نغمہ کے شاداب راستے سے بھٹک
 کر سی۔ ایس۔ پی کی بنجر دادیوں میں نکل آیا ہے۔ جب نزہت کی اُس سے سنگینی ہوئی
 تھی۔ تو وہ سی۔ ایس۔ پی کا امتحان پاس کرنے کے بعد کسی دُور افتادہ ضلع میں ٹریننگ
 کا عرصہ گزار رہا تھا۔ لیکن جب بھی نزہت کی سیدیاں اس کے بارے میں کچھ دریافت
 کرتیں۔ تو وہ فخر سے یہ بتانے کی بجائے کہ اس کا منگیتر ایک سی۔ ایس۔ پی افسر
 ہے۔ ہوئے سے سرگوشی کے انداز میں کہا کرتی۔ ”اس کی شکل تو بالکل شیکہ سی
 ہے۔“ اس کے اس جواب پر اس کی کوئی چیخ سیلی جب اوبہ اگر قبیلے کا کوئی شعر
 پڑھ دیتی تو اس کے چہرے پر گلاب کی کچی تھکیوں کی رنگت پھیل جاتی۔ اور اس کا پورا
 وجود شیلے کی کسی خواب آلود نظم میں ڈھل جاتا۔

اس کے دیکھتے دیکھتے مسعود جمال نے ہوئے سے اپنی پلوں کے پردے

اٹھائیے۔ ان پردوں کے عقب میں مدشن چراغ غریباں ہو گئے۔ اور اس کے ہونٹوں کو اسی گہری مسکراہٹ نے ڈھانپ لیا۔ اور اس نے خواب ناک آواز میں زہنت سے کہا۔

”منگلگری ابھی کافی دور ہے۔“

”ہوں۔“

”تم رات بھر جاگتی رہی ہو؟“

”ہوں۔“

”کیوں؟“ اس کی سٹو سٹو آنکھیں پھیل گئیں۔

”بہادر لنگر یاد آ رہا ہے۔“

”زہنت۔ اس وقت اس نخوس ضلع کا ذکر نہ کرو۔“

”کیوں۔“ کیا اس لیے کہ ”بہت بجا بروکر ترے کوچے سے ہم نکلے؟“

”اس میں بے ابدی کی کیا بات ہے۔ کشتی بھی پاگل ہے اور لوگ بھی پاگل

ہیں۔“

زہنت نے کوئی جواب نہیں دیا۔

مسعود جہاں ہولڈال سے باہر نکل آیا۔ گاڑی چھکاچھک اپنی منزل کی طرف

بڑھتی رہی۔ سورج کی چمک تیز ہوتی گئی۔ دھوپ کی کرنیں کٹیلی ہوتی گئیں۔

”ہم دس بج کر بیس منٹ پر منگلگری پہنچ جائیں گے۔ پہلے سید سے ڈی۔ سی

ہاؤس جائیں گے۔ وہاں نہائیں گے، دھوئیں گے۔ میں آفس جا کر چار بجے

لوں گا۔ اس کے بعد تمام اسی بات کے ہاں جائیں گے اور پھر نذر شاہ پنگ کے لیے چلیں گے۔ بہت عرصے کے بعد شہر میں شاہ پنگ کے مرنے کا مرقعہ نصیب ہوا ہے۔ وہ نذر رسالہ دیتا مجھے۔

اس نے رسالہ دے دیا۔ ”تم بھی لے لو کوئی رسالہ۔“

”نہیں۔“

”تھک گئی ہو؟“ وہ مسکرایا۔

”نہیں۔“

”یکے پہنچنے کی خوشی ہے؟“

جواب میں نزہت نے ایک ہلکا سا تھقہ لگایا۔ مسعود جمال نے رسالہ پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ کتابوں اور دوسرے قسم کے اشتہارات تک پڑھ رہا تھا۔ نزہت بیان رہی تھی کہ وہ بہت خوش ہے۔ اتنا کہ اپنی خوشی کا اظہار بھی نہیں کر سکتا۔ یہی رسلے وہ بہاول نگر میں بھی پڑھتا تھا۔ لیکن مسرت کی وہ روشنی جو خط مطالعہ کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ اس کے چہرے پر کبھی نہ بکھری تھی۔ بلکہ بہاول نگر کے قیام کے دوران تو وہ ایک حد تک مطالعے ہی سے گریز نہ ہو گیا تھا۔ لیکن اس سے وہ رسلے کا ایک ایک لفظ پڑھنا چاہ رہا تھا۔ اور اس کی حالت اس بچے کی مانند ہو رہی تھی جو اپنے نئے کھلونوں کی ایک ایک کل سے چند لمحوں میں ہی واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہو۔

گاڑی متان کے اسٹیشن کو دو گھنٹے ہوئے پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ اور اب وہ فنگرمری کے گرد و فوار میں داخل ہو رہے تھے۔ میٹالی اینٹوں والے چھوٹے چھوٹے

گھر ناپتے ہوئے نظروں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ ظنگری شہر کی فراخی آبادی شروع ہو چکی تھی۔ شہر کے کارخانوں کی اونچی اونچی چیمنیوں میں سے بل کھا کر نکلتا ہوا کثیف دھواں اب فضا میں اٹھتا ہوا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ مہا بھاری ہو گئی تھی ساس میں شہر کی مختلف اقسام کی بد بوئیں گھل مل گئی تھیں۔ نہ بہت نے گھبرا کر ناک کو دھال سے ڈھانپ دیا۔ مسعود جمال نے رسالہ ایک طرف رکھ دیا۔ اور کھڑکی میں سے سر نکال کر باہر جھانکنے لگا۔

”بس اب پانچ منٹ تک ہم پہنچ جائیں گے!“

اس نے اپنا فلیٹ سر پر نکالیا۔ سبک میں سے نفس یا سسٹ اور پھلوں کی ٹوکری نکال کر ہفتہ پر رکھ دی۔ ہولڈال کو تھک کے باندھ دیا۔ پھر چمکتی ہوئی آنکھوں سے نہ بہت کو دیکھنے لگا۔ امد اس کے متناسب ہونٹ مسکراہٹ کے انداز میں پھیل گئے۔ اب شہر کے ہنگامے کی بلی بلی آوازیں بھی سنائی دینا شروع ہو گئی تھیں۔ پھر سے دالوں کی آوازیں، تیلیوں کے رٹنے جھگڑنے اور چھینا جھپٹ کے مناظر، پیٹ فارم پر چھجے دار ٹوپیاں پہن کر ٹپٹنے والے ریوڑ سے افسر بائش کے جھگڑے پرل طرف تاگموں کی قطاریں، اب سب کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ ہر طرف ایک ہنگامہ تھا، شور تھا، جیسے قیامت ٹوٹ پڑی ہو، ایک جھٹکا سا لگا۔ انجن ایک طویل سسکاری سے گڑگڑا گیا۔

”ظنگری۔“ مسعود جمال نے کہا اور پھر دھواں سے میں اٹک کر پیٹ فارم پر کھڑے ہوئے اسی معزز میں شہر اور ضلعی افسروں کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلانے لگا، جو اس کے استقبال کے لیے آئے ہوئے تھے، اور پیٹ فارم پر ادب سے صف

کہیں زیادہ مطمئن معلوم ہو رہا تھا۔

”میں آفس جا رہا ہوں۔ تم یہ سامان کھول لو اور نہا دھو لو۔ تم شام کی چائے پر میرا انتظار نہ کرنا۔ مجھے شاید دیر ہو جائے۔ البتہ رات کے کھانے کے بعد شاپنگ کرنے ضرور جائیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟“

”ٹھیک ہے!“

”سو لائنگ، ڈولنگ!“

اور وہ چلا گیا!

اس کے جانے کے بعد وہ آہستہ سے اٹھی۔ گھنٹی بجا کر اردلی کو بلایا اور ایک ٹیمک، ایک سوٹ کہیں اور دو تین ٹوکریوں کی طرف اشارہ کر کے کہا:

”انہیں لے جاؤ اور باہر برآمدے میں رکھ دو۔ میں جاتے ہوئے جاؤں گی۔ اور سنو میرے کہے بغیر شام کی چائے لے آنا۔“

”بہت اچھا۔“

بوکھلائے ہوئے اردلی نے سامان اٹھالیا۔ اور دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ نزہت کی غزالہ آنکھوں سے چند آنسو ٹپکے اور بڑی خاموشی کے ساتھ سڑخ رُخساروں پر ڈھلک گئے۔ شاید یہ آنسو ایک دھار سے کی مانند پھوٹ بہتے، لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ رومال سے ہم آلود ہیکوں کو خشک کیا۔ اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر پھر آرام کر سی میں دھنس گئی۔ اسے اس وقت کھل سکون کی ضرورت تھی۔ یہ بڑا اچھا ہوا کہ وہ چلا گیا تھا۔ اب سوچنے کے لیے اس کے پاس کافی وقت تھا۔ اب وہ معاملات پر ذرا غصہ سے دل سے غور کر سکتی تھی۔

اب اپنے اس ارادہ کو عمل جامہ پہنانے کا وقت آ گیا تھا۔ جو کئی دنوں سے اس کے ذہن کی پہنائیوں میں پردہ شایا رہا تھا۔ اب وہ تمام تلخ باتیں مسعود جمال کے سامنے اگل دینا چاہتی تھی۔ جو بہت دنوں سے اس کے دل و دماغ میں پس گھول رہی تھیں۔ اب وہ اس نہر کی تلخی زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اب وہ اس کڑواہٹ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہتی تھی۔ اس کڑواہٹ میں اپنے وجود کو گھلاتے رہنے سے جہتر تھا کہ اس سے چھٹکارا پایا جائے۔ چھٹکارا جو عارضی نہیں بلکہ دائمی ہو۔ وہ ایک عرصے سے یہ سب کچھ مسعود جمال سے کہہ دینا چاہتی تھی۔ اس نے ان نہر بھرے الفاظ کو آپ ہی آپ کئی بار دہرایا تھا۔ لیکن ان کو کہنے کے خیال سے اس کا دل ڈوبنے سا لگتا تھا۔ نیچے، نیچے، اتھاہ گرائیوں میں۔ اگر یہ سب کچھ اس سے کہہ دیا گیا، تو وہ کیا کہے گا۔ وہ جو اس سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ اور جب وہ محبت کے میٹھے نس میں نہر کی بوندیں چلکتے دیکھے گا تو اس کے دل کی کیا حالت ہوگی۔

”نہیں، نہیں“ وہ کمری میں دھنسنے دھنسنے چلا اٹھی۔ وہ ایک انجانے سے خوف سے یوں کلاہنے لگی، جیسے کسی جھیل کی سیال، رقعش سطح پر چاند کا عکس لاپتہ ہو۔ اور اس خوف کی لہروں پر بہتی ہوئی وہ بے مائل ٹکراوے جنگلے میں چلی گئی۔ جنگلے جس کے عشق پیمپاں کی بیلوں میں پیٹے ہوئے صمد و روانے کے باہر ایک سپاہی رافل تھا۔ کھڑا رہتا تھا۔ جس کے محرابی دریچوں پر صحرائی پھولوں کی شرابی شرمائی، لمبائی لمبائی بیلوں نے گھونگٹ کاڑھ رکھے تھے۔ جس کے اونچے اونچے قد آدم و رازوں پر ٹھکتے ہوئے ہلکے گلابی پردے، صحرائی کوکھ سے اٹھ

کر آنے والی آہستہ خرام ہوا میں ہوئے ہوئے ہلکے سے کھایا کرتے تھے جس کے سامنے والے لانی میں گلاب کی کچی کلیاں دیہاتی موٹیر اڑوں کی طرح اٹھلایا کرتی تھیں۔ اور جس کے عقب سے گزرتے والی سڑک پر سے کوئی منہلا شہر سوار ترنگ میں آکر کوئی گیت الاپتا ہوا گزر جایا کرتا تھا۔ گیت جس میں معصوم دیدت کا لڑھکے ہوتا تھا۔ جس میں صحرائی گھمبیرتا اور تپش ہوتی تھی۔ جس میں میٹھے پانیوں والی نروں کا ہواؤ ہوتا تھا۔ اور جس کے اکیلے دل ایک تپش آلودہ ٹھنڈک بن کر بیٹھنے میں اتر آتے جلتے تھے۔

پہل دکنے آئے سے رانجنا سوار پیٹے جوڑی

پہل سانولے سے سے رانجنا ماں بہن تہل چری

پہل تینوں نے دیاں گائی گدیے۔۔۔۔۔ !

اور پھر وہ جنگل کے شفاٹ برآمدے میں آکر مسعود جمال کی راہ ٹکنے لگتی۔ یہ اس کے دفتر سے واپس آنے کا وقت ہوتا تھا اور وہ اس احساسِ طمانیت سے آنکھیں موند لیتی کہ مسعود جمال جب آئے گا، تو اپنے کو ایک پُر سکون دنیا میں پائے گا۔ اس کی نکاح اُتر جائے گی۔ اس کی زبان جو مقدمات کے فیصلے اور انتظامی احکامات صادر کرتے سڑکھ چکی ہوگی۔ اس بلویل ٹھنڈے ٹھنڈے برآمدے میں داخل ہوتے ہی اپنی ٹوک پر ایک خراباک پُر سکون اور میٹھی موسیقی کا ذائقہ محسوس کرے گی، اس کے کان جو فریقین کے بیانات اور شکایات سنتے سنتے پک چکے ہوں گے۔ یہاں آگاس کی ترنم ریز باتیں سنیں گے۔ پھر وہ مسکے اٹھے گا۔ اس کا روحانی شاعروں ایسا معصوم چہرہ پسوں کی طرح کھل اٹھے گا۔ اس کی باہیں خود بخود پھیل جائیں گی۔

اور وہ خود بخود اس کی گرم آغوش میں سمٹ جائے گی۔ برآمدے کے پرانی طرف پھولوں پر پانی چھڑکتا ہوا بڑھاوا مال و زویدہ نظروں سے ان کو دیکھے گا۔ اس کے سوکھے ہونے لڑے ہونٹوں پر ایک شفیق مسکراہٹ بکھر جائے گی اور پھر وہ باہروں میں باہیں ٹولے طویل برآمدے کے نرم آلود ستائے میں سے سایوں کی طرف گزرتے ہوئے گلابی پردوں والے ڈرائینگ روم میں چلے جائیں گے۔ مسعود جمال حسب معمول خند کرے گا کہ کھانا ڈرائینگ روم میں ہی کھایا جائے۔ لیکن وہ اسے باز دے کر ڈگر گھسیٹتی ہوئی ڈرائینگ روم میں لے جائے گی۔ وہاں کھانا کھاتے سے وہ ادب، آرٹ اور موسیقی پر گفتگو کرے گا۔ چھٹی لے کر جنوبی فرانس کے نیلے ساحلوں کی سیر کرنے کا پروگرام بنائے گا۔ کھانا ختم کہے اس کے گدے ہائے ہونے باز و پریا یک بھر پور چٹکی بھرے گا۔ ملازم یہ دیکھ کر صافے میں منہ چھپا کر ہنسنے لگے گا۔ پھر وہ راس ڈرائینگ روم میں آجائیں گے۔ وہ پیانو پر کسی ایسے گیت کی مضمون چھیڑ دے گا سا وہ اپنی متنازع جیس پر سروں کی ماہرستان کرین بھرائے موسیقی کے تاج محل میں کھو جائے گی۔

زہت کو اپنے گھر پر فخر تھا، غرور تھا۔ اگرچہ ایک ایک دو دو سال کے وقفے کے بعد مسعود جمال کی مختلف ضلعوں میں تبدیلی ہوتی رہتی تھی۔ انھیں ضلع وہ ضلع ایک اعتبار سے بٹکتا پڑتا تھا۔ لیکن ہر جگہ زہت اپنے گھر کو پُر سکون، خوبصورت اور آرام دہ بنالیتی تھی۔ گھر کی سجاوٹ کے لیے نئے نئے طریقے سوچتی۔ اس نے ایک آرٹسٹ کا ذہن پایا تھا۔ اس کے گھر میں کسی کیوبک تصویر کے خطوط کی ایسی ترتیب اور شفیق رنگوں کا جیس متناسب امتزاج، سمجھایا

اور سکون ہوتا تھا۔

مصدقہ جمال کی سانگھڑ سے ضلع بہاول نگر کی ٹرانسفر ہوئی تھی۔ تو کئی دوستوں اور ملنے والوں نے زور دیا تھا کہ ٹرانسفر نہ کرانے کی کوشش کرو۔ لیکن ذہانت نے ان سب لوگوں کی زبردست مخالفت کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ سرکاری ملازم اور جگہ میں بہت معمولی سا فرق ہوتا ہے۔ جو اگر اپنی سیلانِ منظر سے مجبور ہو کر کسی ایک جگہ ہمیشہ کے لیے ڈیرے نہیں ڈالتا۔ اور سرکاری ملازم اس لیے ہمیشہ کے لیے ایک مقام پر تعینات نہیں رہ سکتا کہ حکومت اسے چند شرائط کے تحت ملازم رکھتی ہے اور ملک کے کسی بھی گوشے میں ٹرانسفر کرنے کی شرط ان میں سے ایک بنیادی شرط ہے۔ آج یا کل سرکاری ملازم کو ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف ہجرت کرنی ہی ہوتی ہے۔ اس لیے ٹرانسفر نہ کرانے کی کوشش حماقت ہے۔ دوستوں اور ملنے والوں کی بیدائی، کچھ عرصے تک مشاق گزرنے لگی۔ پھر نیا ماحول اور نئے لوگ اپنے میں جذب کر لیں گے۔ اور یہ وہ بہاول نگر آگئے تھے۔

بہاول نگر ایک مفدا خاندانہ اور پراسرار ماضی کا ضلع تھا۔ اس کی سرحدیں ہندوستان کی ریاست بیکانیر سے ملتی تھیں اور یہ سیما کی ہیڈ وہ کس سے لے کر صحرائے مروت کے آخری گوشوں تک پھیلا ہوا تھا۔ ستلج دیہی پراجیکٹ کے تحت اگرچہ اس ضلع کا غالب حصہ زرعی کاشت کے قابل ہو گیا تھا، لیکن پھر بھی وہاں ریت کے اونچے اونچے ٹیلے، میلوں تک پھیلے ہوئے چٹیل اور پتھر میدان، سرکنڈوں کے گھنے جنگل، سرکیاں بنا کر اپنا پیٹ پالنے والے خانہ بدوش، لمبی لمبی ایالوں والے گھڑوں پر چڑھ کر

ڈاکے ڈالنے والے دُبلے پتلے لیکن دلیر ڈاکو تیز رفتار ڈاکچیوں پر میلوں کا صحرائی سفر طے کرنے والے ”لاٹری“ اب بھی اس مندر کی یاد تازہ کر دیتے تھے۔ جب یہ ضلع لوق ووق ریتیلے صحرا کا حصہ تھا۔ جنوب کی طرف اس ضلع کا آخری قصبہ فوٹل عباس تھا۔ یہ قصبہ ریت کے ہمیب ٹیلوں کے درمیان آباد تھا۔ اس کے چاروں طرف چار چار میل تک ریت کے علاوہ اور کچھ رکھائی نہ دیتا تھا۔ لیکن اس کے بعد شاداب کھیتوں اور ہفتے بستے گاؤں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ جو ہندوستان کی سرحد پر جا کر ختم ہوتا تھا۔ بہاول نگر شہر سے (ج) ضلع کا صدر مقام تھا اور جس کے نام پر ضلع کا نام رکھا گیا تھا) ریل کی ایک براچ لائن فوٹل عباس تک جاتی تھی۔ اس لائن پر پورے دن میں صرف دو گاڑیاں چلتی تھیں۔ جو نارنگ و لیٹرن ریلوے کے ناکارہ ترین انجنوں اور ڈبوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ اس لائن پر چلنے والی ان گاڑیوں کی اوسط رفتار دس میل فی گھنٹہ ہوتی تھی۔ اس لائن پر بہاول نگر شہر سے تیس میل کے فاصلے پر ہارون آباد کا قصبہ آباد تھا۔ یہ قصبہ پورے ضلع کا حسین ترین اور سب سے زیادہ بارونق قصبہ تھا۔ دراصل ہارون آباد کے گرد و نواح میں گندم، کپاس اور گنے کی کاشت وسیع پیمانے پر ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی تجارتی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ یہاں کی غلامنڈی مغربی پاکستان کی سب سے بڑی غلامنڈی تھی۔ اس کے ارد گرد پھیلے ہوئے گاؤں بے صدا آباد اور خوشحال تھے۔ یہاں کی خوبصورت مستعد اور فعال میونسپل کمیٹی جس کا آدھے سے زیادہ اسٹاف خوش گو شاعروں پر مشتمل تھا

۱۔ ایک قدیم صحرائی قوم جو اب تک بہاول نگر کے ضلع میں آباد ہے۔

یہاں کے چوڑے چکے، صاف سحرے باناد جہاں مدفین جاگتی اور ہمسے انگڑائیاں
 لیتے تھے۔ یہاں کی سیدھی سادی معصوم معصوم سی لگیاں جہاں مکاؤں کے
 دریچے گداز چہروں سے آباد رہتے تھے۔ یہاں کی وسیع وسیع چمکتی ہوئی سڑکیں
 جو دُور دراز دیہاتوں سے آئی ہوئی کسان لڑکیوں کی چوڑیوں کے چھناکوں کی امیں
 تھیں۔ یہاں کی چھوٹی سی "مارون کلب" جہاں خوش اخلاق شہری، افسر اور
 پڑھے لکھے زیندار گئی شام تک گیس کے ہنڈے جلا کر ٹینس کھیلتے اور تاش کی
 بازیاب بدتے تھے۔ غرضیکہ اس قصبے کی ایک ایک چیز سے نزہت کو گویا پیار
 ہو گیا تھا۔ وہ جب بھی دُور سے پر مسعود جبل کے ساتھ اس علاقے میں آتی تو
 اسے تین چار دن یہاں ٹھہرنے پر ضرور مجبور کرتی۔ فور آر (4-R) سڑک پرلی
 طرف "راؤ حنیف" کے گاؤں کے قریب کھیتوں کے درمیان شیشم اور شہری کے
 اونچے اونچے گھرے بیز اور گھنے درختوں سے گھرا ہوا ایک کینال ریسیٹ ہاؤس
 تھا۔ جو بائیس ہزار چنگے کے نام سے مشہور تھا۔ بائیس ہزار فور آر (4/R) سڑک کی
 ایک برجی کانبر تھا۔ جو سڑکی کے کنارے پر ریسیٹ ہاؤس کے قریب ہی
 نصب تھی۔ وہ جب بھی بارون آباد آتے تو عموماً اسی ریسیٹ ہاؤس میں
 ٹھہر کرتے تھے۔ یہاں قیام کے دوران میونسپل کمیٹی کے زیر اہتمام ہارون کلب
 کے لابی میں ایک ذایک مشاعرہ ان کے اعزاز میں ضرور منعقد ہوتا۔ جس کی
 صدارت مسعود جمال کرتا تھا۔ اور جس میں میونسپل کمیٹی کے تقریباً تمام ملازمین اپنا
 کلام سنایا کرتے تھے۔ میونسپل کمیٹی کے یہ شاعر ملازمین اپنی شکلوں اور اپنے
 اشعار کے اعتبار سے بڑی عجوبہ گرد گار قسم کی ہستیاں تھے۔ ان کا سرخدا ایک

ایسا شاعر تھا۔ جس کا عارفانہ کلام فن کی ناقدرہ شناسی کے سبب ابھی تک کسی اچھے رسالے میں بار و پاسکا تھا۔ اور نہ ہی اس کی آئندہ کوئی امید تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے ان ”میونسپلٹی“ شاگردوں میں بڑا اہم و عزیز تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ اس کے عارفانہ کلام کی اشاعت کی کوئی صورت نہیں نکلتی۔ تو اپنے شاگردوں سے چندہ اکٹھا کر کے اس نے ایک مجبورہ شائع کیا جس کے سرورق کا کاغذ غالباً کاغذ کی ان اقسام سے تعلق رکھتا تھا، جو دنیا میں پہلی بار بطور تجربہ ملک چین میں تیار کی گئی تھیں۔ اس دھان پان سے مجموعے میں اس کے شاگردوں کی نو شاہد ایک ایک دو درجہ چیزیں شامل تھیں اور وہ بھی چندے کے طفیل، لیکن اس کی اپنی کم و بیش چھ عدد عارفانہ تخلیقات اس مجموعے کی زینت تھیں۔ اس کے بعد اس نے مشاعروں کا اتنا طویل چکر چلایا تھا کہ ہار دی آباد والوں کا دم محض ناک میں ہی نہیں بلکہ ناک کے آخری سروں تک آگیا تھا۔ اور وہ اپنی ناکوں کو ڈھانپے رہتے تھے کہ مانس کہیں نہ یادہ تنگ آکر موقع پاتے ہی نکل نہ بھاگے۔ چنانچہ ہار دی آباد کے قیام کے دوران جب کسی شام وہ شاعر مشاعرے کی اطلاع دیئے اور مسعود جمال سے صدارت کی منظوری حاصل کرنے ویسٹ ہاؤس آ نکلتا تو نزہت جلدی سے اندر بھاگ جاتی اور بیڑی سیل والا ریڈیو پر آواز سے لگا دیتی۔ پھر حقوڑی دیر بعد مسعود جمال تو جھنجھلاتا ہوا مشاعرے کی صدارت کرنے چلا جاتا اور وہ کتنی دیر تک باہر لان میں بیٹھ کر شب کی پراسرار تنائیوں میں شاخوں اور پتیوں کا، کبھی دھیمیا اور کبھی تیز رقص دیکھا کرتی۔ گرم مہرائی ہمارے جھونکے اس کے اوپر سے تیرتے

ہوئے گزرتے بہتے سماں، سماں، سرد، سرد، تم کس کی اُمد جا رہے ہو اور صحرائی
آوارہ ہواؤں کے گرم جھونکو! تمہیں کس نے بلایا ہے؟ اس کے دگر گل کے
ایسے باریک ہونٹ استغفار انداز میں کھٹنے کو ہری سمجھتے کہ پان، پان، پان
اور موڑ کی پیڈ لائٹیں اس کی آنکھوں کو چندھیادیتیں۔

== پیڑا کر دیا ان لوگوں نے تو میرے ذہن کا۔ ایسے ایسے شعر سنائے ہیں
کہ دل و دماغ کی چولیس ہلا ڈالی ہیں۔ مسعود جمال سوڑ سے اتنے ہوئے گتا۔
نزدہت چڑ جاتی۔

== جب تمہیں یہ معلوم ہے کہ یہ لوگ شعروں کا جھٹکا کھتے ہیں۔ پھر کیوں
ان کے مشاعروں کی صدا کرتے ہو؟ وہ کجنت کھنسی مار کر مونچھوں والا
شاعر.....! مسعود جمال لکھا ٹی کی گرہ کھولتے ہوئے برسے سے اُدھوا
جواب دیتا۔ پھر کوئی قصہ چھیڑ دیتا۔ اود بات ٹل جاتی۔

اسی ہارون آباد کے مغرب میں تین چار میل کے فاصلے پر ایک اور نرغی۔
جر نرغی آر (B/R) نر کلاقی تھی۔ دراصل ہارون آباد کا قصبہ فور آر

(B/R) نر اور نرغی آر (B/R) نر کے درمیان واقع تھا۔ نرغی آر (B/R) نر
پر بھی ایک ریسٹ ہاؤس تھا۔ جو قاضی والا ریسٹ ہاؤس کے نام سے مشہور

تھا۔ قاضی والا ریسٹ ہاؤس کے شرقی جانب اگر چار میل تک نر کے کنارے
کنارے چلتے چلے جائیں تو ایک بڑا پراسرار سا گاؤں آتا تھا۔ جس کا نام ”پنکا“
تھا۔ تمام لوگ اسے ”پیروں کا پنکا“ کہا کرتے تھے۔ دراصل اس گاؤں کے
مالک گدی نشین پیر تھے۔ جو اپنے کمال رسول بتاتے تھے۔ اس گاؤں میں اب

پیروں کے تین خاندان آباد تھے۔ یہ خاندان مداحی ایک باپ کے مختلف بیٹوں کی اولاد تھے۔ ان میں سے دو خاندان ترقی یافتہ ہو گئے۔ ان کا کام اس کے علاوہ کچھ تھا کہ سرحدوں سے نذرانے جمع کرتے تھے۔ ان کی نوجوان لڑکیوں سے رات کی تنہائیوں میں اپنے بستر سجاتے تھے۔ قتالیاں اور منجھڑے کو داتے تھے۔ چھوٹا اور

ڈاکوؤں کو اپنے ہاں پناہ دیتے اور ان سے اس پاس کے گاؤں میں چوریاں کر دیتے تھے۔ اور پھر ان کے اجالوں میں لڑکیوں کے اونچے اونچے طرے لراتے ہوئے اپنے مریدوں کے حلقے میں بیٹھ کر انہیں اسلام کی مختلف تعلیمات سے آگاہی بخشا کرتے تھے۔ لیکن ان پیروں کا ایک خاندان شریفانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اس خاندان کے افراد اپنی تمام تر توجہ زمینداری کے انتظام و انصرام کی طرف مبذول رکھتے تھے۔ ظاہر بات تھی کہ اس صفت میں دوسرے دو خاندان ان لوگوں سے کیسے نباہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہمیشہ اس خاندان کو مذکورہ پہنچانے کی تاک میں رہتے اور جب بھی موقع ملتا، وار کرنے سے نہ چمکتے۔ چنانچہ "پکا" پر پولیس والے بڑی عنایت کی نظر رکھتے تھے۔ اور ان خاندانوں کے باہمی لڑائی جھگڑے کی وجہ سے ان کا اکثر ہمیشہ میدان جارہتا تھا۔ وہ خاندان جو بیچارہ بیگ سادی مد شریفانہ زندگی بسر کرتا تھا، ہر اعتبار سے مظلوم تھا۔ اس کی کھڑی فصلوں میں آگ لگا دی جاتی تھی۔ ان کے ڈھور ڈھگروں کو مار دیا جاتا تھا۔ ان کے مزارعوں کو مختلف تشدد و آگ و گھمکیاں دے کر ان کا عرصہ معیشت تنگ کر دیا جاتا تھا۔ افراد خاندان پر قاتلانہ حملے کئے جاتے تھے۔ غرضیکہ ان کا جینا و بھر کر دیا گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ بیچارے خوش رہتے تھے۔ اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ امدان کی طرف سے اب تک کوئی انتقامی کاروائی نہیں ہوئی تھی۔

اس مظلوم خاندان کا سربراہ ایک تیس پینتیس سال کا نوجوان تھا۔ اس کا نام صاحبزادہ احمد شاہ تھا۔ یہ مسعود جمال کا بڑا گرا دوست تھا۔ لیکن اس کی دوستی غرض مندی اور مطلب پرستی سے کہیں بالاتھی۔ اس نے مسعود جمال سے بحیثیت ٹپنی کشنر کے اپنا یاد دہرے کا کہی کوئی کام نہ نکلوایا تھا۔ وہ کہی اس کے پاس کوئی سفارش نہیں لایا تھا۔ اس نے اپنے رشتے دار و خاندانوں کے مقابلے کے لیے یا ان کو رک پیچانے کے لیے کہی مسعود جمال سے مدد نہ چاہی تھی۔ غرضیکہ وہ بس دوست ہی تھا۔ اور ضلع کے ٹپنی کشنر سے اپنے ان دوستانہ تعلقات سے اس نے کہی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ وہ جب بھی بہاول نگر آتا تھا مسعود جمال کے ہاں ہی ٹھہرتا تھا۔ وہ صرف مسعود جمال کا دوست ہی نہیں، بلکہ نہایت ہی اسے پسند کرتی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ سُرخ مائل تھا۔ اور ہمیشہ ہمیشہ بھیگا سا رہتا تھا، جیسے ابھی ابھی ناک آگیا ہو۔ سر کے بال چھپدے چھپدے اور گہرے سیاہ تھے۔ وہ قلعے اُن پڑھتا تھا۔ لیکن بے مدد خوش مزاج اور زندہ دل۔ اس کے موٹے موٹے ہونٹ ہر کے مسکراتے دیکھتے تھے۔ اور چھوٹی پھوٹی، بٹن نما آنکھوں کے عقب میں ہر وقت جیسے موم تیاں سی فروزاں رہتی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے ہونٹ سسکیوں سے نا آشنا ہیں۔ اور آنکھیں، ان آنکھوں نے تو عابار و ناسیکہ ہی نہ تھا۔ وہ مسعود جمال کا بچانے کیلئے دوست بن گیا تھا۔ حالانکہ مسعود جمال اپنے ضلع میں قلعے ہر دلعزیز اور مقبول نہ تھا۔ ضلع کے لوگ نہ صرف اس سے خوف کھاتے تھے، بلکہ ایک حد تک اس سے نفرت بھی کرتے تھے۔ اس کی بددعا غلام بد معنائوں کے بارے میں پورے ضلع میں عجیب و غریب قسم کی افواہیں گشت

کیا کرتی تھیں۔ اس بار سے میں ایک دو بار ڈویژنل کمشنر نے بھی اپنی گفتگو میں سرسری اشارے کیے تھے۔ لیکن مسعود جمال کا خیال تھا کہ کمشنر بہت تنگ نظر شخص ہے۔ اور ذہنی اعتبار سے بھی اس سے کہیں کمتر ہے۔ اس نے ایک بار تو کمشنر سے ملنے صاف کہہ دیا تھا کہ جناب میں نے آپ سے کہیں زیادہ کتابیں پڑھی ہیں۔ میں قسط کر بھی آپ سے بہتر سمجھتا ہوں۔ اگر ضلع کے اُن پڑھ تنگ خیال اور جاہل عوام مجھے اچھا نہیں سمجھتے تو آپ کو بھی کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ میری قابلیت پر شبہ کریں۔ ” اور کمشنر اپنا سامنہ لے کر رہ گیا تھا۔ یہ بات نزہت کے سامنے ہوئی تھی۔ اس لیے اس نے بھی اس کو محسوس کیا تھا۔ اور کھانے پر مسعود جمال کے سامنے اس کا اظہار بھی کیا تھا۔ لیکن اس نے جواب دیا۔ ” ذہنی طور پر میں ان منب لوگوں سے اونچا ہوں۔ اس لیے یہ مجھے پسند نہیں کرتے۔ لیکن مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ میں محض ان لوگوں کے لیے اپنے ذہن کو ان کی سطح پر نہیں لا سکتا۔ ”

ان تمام باتوں کے پیش نظر نزہت حیران تھی، کہ صاحبزادہ احمد شاہ جو قطعی جاہل تھا۔ مسعود جمال کا دوست کیسے بن گیا۔ پورے ضلع میں صرف ایک وہی شخص تھا جو دل سے مسعود جمال کی تعریف کرتا تھا اور اسے پسند کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا۔

” اگر بد دماغی ایسی ہی ہوتی ہے۔ جیسی مسعود صاحب میں ہے۔ تو ائمہ شخص کو بد دماغ بنادے۔ ” یہ خوشام آہر گز نہیں تھی۔ چونکہ نزہت جانتی تھی کہ احمد شاہ کہ اگر خوشام گز ناہی مقصود ہوتی۔ تو وہ اس سے بہتر طریقہ استعمال کر سکتا تھا جو کہ اس نے کہیں استعمال نہیں کئے تھے۔ اس کی یہی بے لوث دوستی تھی۔ کہ اُس وقت تک

نزدہت کے ذہن میں اپنے شوہر کی طرف سے کوئی بدگمانی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اور اگر ہوئی بھی تھی تو یقین کے وجہ سے تک نہ پہنچنے پائی تھی۔ لیکن اب وہ مر گیا تھا۔ صاحبزادہ احمد شاہ مر گیا تھا۔

اور تب غلگھری کے اس ڈی۔ سی۔ ہاؤس کے نیم خشک کمرے کی بدھم تاریکی میں نزدہت نے خوف کے مارے چرتنگ کر اور ادھر ادھر دیکھا۔ باہر شریر شام کے فرشتوں کا نزول ہو رہا تھا۔ لیکن کمرے میں ابھی سے رات کا سماں تھا اور صاحبزادہ احمد شاہ کی موت کے خیال نے اس کے جسم کو کپکپا دیا تھا۔ اس نے گہر اور وحشت انگیز سانسوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ کر آنکھیں میچ لیں — بند آنکھوں کے سلسلے بھی خوف کے بھوتوں کا رقص جاری رہا۔ اور اسے ہارون آباد کے باسٹھ ہزار ریسٹ ہاؤس میں پناہ لینا پڑی۔

وہ دودھ کے دوسے ہارون آباد آئے ہوئے تھے۔ ہارون آباد کے گرد و فواح میں جرائم بہت بڑھ گئے تھے۔ قتل کی وارداتیں عام ہو گئی تھیں۔ چنانچہ باسٹھ ہزار ہنگلے کے لائی میں مسعود جمال ہارون آباد کے ایس۔ ایچ۔ او سے تند و تلخ لہجے میں گفتگو کرتا رہتا تھا۔ چونکہ جرائم کی زیادتی کی وجہ سے اخبارات اس پر بڑی نئے دے کر رہے تھے۔ اور اس کا ضلع بدنام ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ کہتی تھیں کہ مرنچیلوں والا شاعر بھی دانت نکوستا ہوا آجاتا تھا۔ اور موت دھنچے اپنا کوئی نہ کوئی شعر سناتے سے نہ چڑھتا تھا۔ مسعود جمال کے دھنچے کا پورگرام تو دودھ کا تھا۔ لیکن علاقے کی غیر معمولی صورت حال کی وجہ سے اس نے ہارون آباد میں اپنے قیام کی مدت بڑھا دی۔ وہ ایک بار ۱۱۱ تھا نیڈر اور پولیس کے کچے

سپاہیوں کے ہمراہ چند بے نام گاؤں کے محلّے کے لیے بھی گیا۔ تاکہ صورتِ حال کا اندازہ لگا سکے۔ ایک شام وہ محلّے سے لوٹ کر آیا تو بے حد متحکما ہوا تھا۔ لگے وہ اس نے مکمل آرام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور سلیپنگ گاڑی پہن کر پٹنگ پر دروازہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد چپڑا اسی آیا۔

”مذنب! پچھتے سے صاحبزادہ صاحب آئے ہیں۔“
”جلاؤ۔“

تھوڑی دیر بعد صاحبزادہ احمد شاہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا رنگ ہلکی کا ایسا پیلا ہو رہا تھا۔ اور آنکھوں میں جو ہمیشہ مسکایا کرتی تھیں، خوف کی سیاہ لہریں کر وٹھیں لے رہی تھیں۔

”آئیے صاحبزادہ صاحب۔ کیسے طبیعت کیسی ہے؟“ مسعود جمل نے پوچھا۔

”بس جی دعا ہے، آپ کی؟“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔ اور کمر کھینٹ کر اس پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں نزہت بھی آگئی۔ احمد شاہ کو دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ ایک لمحّے کے لیے دروازے میں رُکی۔ اور پھر آگے بڑھ آئی۔ احمد شاہ اس کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

”کیسے بھائی صاحب طبیعت کچھ ناساز ہے کیا۔ بیٹھے نا آپ کھڑے کیوں ہو گئے؟“ نزہت نے جلدی سے کہا۔

”بس جی دعا ہے آپ کی؟“

”پھر کھن بات کیا ہے۔ آج آپ بہت اداس دکھائی دے رہے ہیں؟“

”کچھ نہیں جی بات کیا ہوتی تھی۔ آپ جانتی ہیں خاندانی جھگڑے جب سے بڑھ جائیں تو طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔“

”کیوں خیر قہر ہے؟“

”آہو جی۔ یوں تو خیر ہی ہے۔ لیکن آج کل میرے دونوں بھائی ذرا زیادہ جھگڑے ہوئے ہیں۔ میں بھی جی آخر بندہ بشر ہوں نا۔ بھائیوں سے لڑائی وغیرہ سے طبیعت ذرا ڈھیل ہو گئی ہے۔“

مسعود جمال اور نزہت کو معاملات کا تو پہلے سے ہی علم تھا۔ لیکن آج سے قبل احمد شاہ نے کبھی ظاہر ہی نہیں کرنے دیا تھا کہ اس کے تایا اور چچا زاد بھائی اس سے برسرِ پیکار ہیں۔ اس سے پہلے انہوں نے اس کے ملنے پر کبھی ایک شکنہ نہ دیکھی تھی۔ اس کا مسکراتا ہوا چہرہ کبھی اس نہ دکھلائی دیا تھا۔ لیکن آج احمد شاہ جیسے ٹوٹ سا گیا تھا۔ مسعود جمال اور نزہت دونوں نے اپنی اپنی جگہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اس بار صاحبزادہ احمد شاہ غیر معمولی حالات سے دوچار ہے۔

”آپ کی بیوی کہاں ہیں صاحبزادہ صاحب؟“ ایک انجانے اندیشے کے تحت نزہت نے دریافت کی۔

”میںیں گاؤں میں ہی رہے۔“ احمد شاہ نے جواب دیا۔

”اللہ نہ کرے۔“ نزہت ہولے سے بڑبڑائی۔

”جی مجھ سے کچھ کہا آپ نے؟“ احمد شاہ نے پوچھا۔

”نہیں تو۔ میں تو یوں ہی نہانے کیا کہہ رہی تھی۔“ نزہت بولا گئی۔

اس کے بعد احمد شاہ کچھ کے بغیر اٹھ کر چلا گیا۔ اس کے اٹھنے اور جانے کے انداز سے کچھ ایسے اضطراب کا اظہار ہوا تھا کہ مسعود جمال اور نزہت میں سے کوئی بھی اسے ٹھہرنے یا رکنے کے لیے نہ کہہ سکا۔

کچھ دیر وہ دونوں بے جان پتھروں کی مانند خاموش بیٹھ رہے۔ چند اذیت رساں لمحے ایک انجانی سی تکلیف وہ سرسراہٹ کے ساتھ ان کے اوپر سے تیرتے ہوئے گزر گئے۔

”میرے جمال میں احمد شاہ کے معاملات بے حد خطرناک صورت اختیار کر گئے ہیں۔ اب اس کے اپنے بس میں کچھ نہیں رہا۔ وہ بہت پریشان تھا۔ آج اس کے چہرے پر میں نے موت کی زردی کھنڈی دیکھی تھی۔ اللہ اپنا رحم کرے۔ نزہت نے معاً چوتھتے ہوئے گڑبڑا کر مسعود جمال سے کہا۔

”ارے نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ احمد شاہ بہت عقلمند اور ولیر آدمی ہے۔ وہ ان تمام خطرناک حالات سے بخوبی خود بیٹھ لے گا۔ باقی رہا یہ اندیشہ کہ وہ اسے قتل کر دیں گے۔ تو یہ اندیشہ بھی بے بنیاد ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ احمد شاہ میرا دوست ہے۔ وہ اکیلا نہیں۔ اسے حکومت کی پشت پناہی حاصل ہے۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے وہ اس کی جان لینے کی جرأت نہیں کر سکتے۔“ مسعود جمال مسکرایا۔ ”احمد شاہ وہ ہے کہ ہاتھوں کی حفاظت میں ہے۔“

باہر شام کے مٹیالے سائے سات کی گہری جوتی ہوئی سیاہیوں میں مدغم ہو رہے تھے۔ مسعود جمال کچھ دیر ریسٹ ہاؤس کے باہر لان میں ٹھہرا رہا۔ اور پھر رات کا کھانا کھا کر سونے کے لیے چلا گیا۔ اگلے دن اسے بہت کام کرنا تھا۔

علی الصبح اٹھ کر ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر اس نے سول ہسپتال اور تھانے کا معاوضہ کرنا تھا۔ کئی درخواستوں پر فیصلے دینا تھے۔ پھر کچھ گاؤں اور سرحدی علاقے کا ہنگامی دوسہ کرنا تھا۔ غرضیکہ کام کا اتنا جھوم تھا کہ کل گئی رات تک ختم ہونے کی امید نہیں تھی۔ اس لیے وہ آج جلدی ہی سو گیا تھا۔

اگلے دن وہ سویرے ہی بیدار ہو گیا۔ شیو وغیرہ بنا کر وہ نہ ہت کے ہمراہ ناشتے کی میز پر آکر بیٹھا ہی تھا کہ باہر ایک شور برپا ہو گیا۔ پھر بیماری پولوں کی دھمک اور کچھ لوگوں کے رونے چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔

”کی مصیبت ہے؟“ مسعود جمال جلدی سے کرسی سے اٹھا۔ اور برآمدے میں آگیا۔ نہ ہت بھی اس کے پیچھے چلی آئی۔ پرلے لان کے قریب کئی کسان جمع تھے۔ جو اپنی میل گڑیوں کے پلوؤں سے بار بار اپنی آنکھیں خشک کر رہے تھے۔ ان لوگوں کے قریب پولیس کے چھ سات سپاہیوں کا جھگڑا تھا۔ یہ سپاہی تعداد میں پانچ سے زیادہ نہیں تھے۔ ان سپاہیوں کے عقب میں ہارون آباد کے سول ہسپتال کا نوجوان میڈیکل آفیسر کھڑا تھا۔ اس نے سفید قمیض اور خاک پتلون پہنی ہوئی تھی۔ وہ کہہ کر اپنے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ سوائے اس میڈیکل آفیسر کے سب لوگ شور مچا رہے تھے۔ بلکہ کسانوں میں سے کچھ آدمی تو عورتوں کی طرح بھی کر رہے تھے۔

”اے اے، توں تے ساٹا مائی باپ ہی۔ توں سانوں چھڈ کے کدھر چلا گیا۔“

”کیا بات ہے۔ اونٹے کی گل اسے؟“ مسعود جمال نے چلا کر پوچھا۔

دو تین کسانوں نے بیک وقت چلا کر اس کے سوال کا جواب دیا۔ جسے مسعود جمال نہ سمجھ سکا۔

”مجھے نہیں سمجھ آئی، ایک آدمی جواب دے۔“ مسعود جمال ایک بار پھر حلق کا پورا زور صرف کر کے چلا یا۔ اس پر میڈیکل افسر نے چرتک کر اس کی اُور دیکھا اور ہجوم کو چیرتا ہوا مختلف لوگوں کو ایک طرف دھکیلتا ہوا اس کی جانب بڑھا۔ پولیس کے سپاہی بھی اب چوکنے ہو چکے تھے۔ اور انہوں نے کسانوں کے ہجوم کو ایک طرف ہٹانا شروع کر دیا تھا۔ جب یہ لوگ ادھر ادھر ہو گئے تو مسعود جمال کی نظر سامنے والے لان پر پڑی۔ وہ بے اختیار اندلان کی طرف بھاگا۔ اندھاں پہنچ کر ایک لمحہ کے لیے اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اُنھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ اور ہونٹ جو خشک ہو چکے تھے، کپکپانے لگے۔ اس کے سامنے بان کی ایک کھڑی چارپائی پر خون آلود چادر میں لپٹا ہوا صاحبزادہ احمد شاہ کا بے جان جسم پڑا تھا۔ اس کے سر اور چہرے کا بایاں حقہ خون سے لہقر ہوا تھا۔ قیصر بھی سرخ سرخ لہو سے بھیگ گئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے اس کے جسم کو خون کے دریا میں غوطے دیئے گئے ہوں۔ لیکن مسعود جمال کی حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی، جب اس نے میڈیکل افسر کو کہتے سنا۔

”سائیس ابھی چل رہی ہیں۔“

اور اس کی انگلیاں جلدی سے احمد شاہ کی نبضوں کو ٹٹولنے لگیں، جو بڑے بے معلوم انداز میں چل رہی تھیں۔ اور لمحہ بہ لمحہ ڈوبتی جا رہی تھیں۔ کسانوں کا ہجوم ان کے چاروں طرف جمع ہو گیا۔ لاش میں ایک غیر محسوس سی حرکت پیدا ہوئی۔

اور موت آسا یہ ہونے کے عالم میں یہ الفاظ اس کے لبوں میں لت پت ہونٹوں سے لڑھکے گئے۔

”میرے۔۔۔۔۔ بیوی۔۔۔۔۔ بچے۔۔۔۔۔ بچاؤ۔۔۔۔۔ اور سنا ہے۔۔۔“
باریک سا پر وہ بھی ہمیشہ کے لیے پھٹ گیا۔ جواب تک احمد شاہ کی زندگی اور موت کے مابین حائل تھا۔ کسانوں کے ہجوم سے یکبارگی کلر شدت کا ٹوٹا ہوئی صدا اٹھی اور پھر ان کے یہی شدت اختیار کر گئے۔

”اے بچے کچھ چلیا اس، سانوں چپٹ کے“ اے پیراوتیاں دلیا۔
”مسعود جمال نے آنسوؤں کو دواں میں جذب کر لیا۔ نہ بہت جو رہا اسے
میں کھڑی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی، سس رہی تھی۔ یہ ہونا ک منظر نہ رہا داشت
کر سکی اور بڑی طرح روتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔

تھوڑی دیر بعد ریٹ ہاؤس کے ڈائٹنگ روم میں میڈیکل آفیسر مسعود
جمال کو بتا رہا تھا۔

”جب یہ لوگ احمد شاہ کو ہسپتال میں لائے تو خدیہ چوٹوں کے باوجود
وہ ہوش میں تھا۔ میں نے اسے کورائیں اور گلوکوس کے تین چار انجکشن دیئے۔
اس سے اس کی حالت اور سنبھل گئی۔ لیکن میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ اس کا
ایک گھنٹے سے زیادہ زندہ رہنا محال ہے۔ اور یہ بات غالباً وہ خود بھی جان
رہا تھا۔ چنانچہ اسی کے بار بار کہنے پر اسی حالت میں اسے یہاں آپ کے پاس
لانا پڑا۔ وہ آخری بار آپ سے ملنا چاہتا تھا۔“

یہ سس کر نہ بہت کی آنکھوں سے آنسوؤں کا طوفان پھوٹ رہا۔ اس کی

لگا ہوں گے سامنے صاحبزادہ احمد شاہ کی بیوی کی تصویر گھوم رہی تھی۔ وہ بھولی بھالی سی دیہاتی لڑکی جو دو پیار سے پیارے بچوں کی ماں تھی۔ جس نے زیر لب کوئی دیہاتی گیت لگاتے ہوئے اس کے لیے مکئی کی روٹیاں پکائی تھیں۔ شہر شہر مار اپنے شوہر احمد شاہ کی باتیں کی تھیں۔ اس نے بتایا تھا کہ حالانکہ شادی کو چار سال گزر چکے ہیں، لیکن احمد شاہ اس سے بے حد لاڈ کرتا ہے۔ ہر چھوٹے چھوٹے تنوار پر اسے رنگ برنگی چوڑیاں لاکر دیتا ہے۔ اود عید، بقر عید پر تو خاص طور پر اس کی گوری گوری کلاٹھیلوں کا ”میچا“ لے کر بہاد لنگر جاتا ہے۔ اور اس کے لیے سونے کے لنگس بنوا کر لاتا ہے۔ ہائے! ان دندلوں نے۔ اس بیچارہ کی کیا کپا حشر ہو گا۔ کیا اس کے ان پیارے پیارے معصوم بچوں کو لالٹھیوں سے مارتے ہوئے ان کا دل نہ کانپا ہو گا۔ اُن! جب ان بے گناہ جانفل پر لالٹیاں برسی ہوں گی۔ تو انہوں نے کس حسرت سے اپنے باپ کو پکارا ہو گا۔ اُس بھولی بھالی دیہاتی لڑکی نے کس درد سے اپنے سہاگ کو آواز دی ہو گی۔ باپ سہاگ، جوان کے پکارنے اور آواز دینے سے پہلے ہی لہو کے دریا میں ڈوب چکا ہے۔ نہ بہت دوتے دوتے بڑی طرح کانپ گئی اس نے ٹوٹی ہوئی آواز میں مسعود جمال سے کہا۔

”جلدی کرو۔“ نبھانے احمد شاہ کی بیوی اور بچوں پر کیا گند رہی ہو گی جلدی کچھ کرو۔ خود جاؤ۔ اگر دیر ہو گئی تو اس بے گناہ لڑکی اور بچوں کا خون بہا دے سر جو لگایا۔

مسعود جمال تو بولایا ہوا تھا۔ اس کی عقل جواب دے رہی تھی۔ جو کچھ

بھی مہا تھا۔ اس کے قسم سے بھلا تھا۔ اس کی توقع کے خلاف تھا۔ لیکن نہ ہت کی ٹوٹی ہوئی آواز نے اس کو گویا نئی زندگی دے دی۔ خون جو رگوں میں جم چکا تھا، تپش پا کر پھر خوگر دھڑک اٹھا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور باہر برآمدے میں آگیا۔ میڈیکل آفیسر اور نہ ہت بھی اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل آئے۔ لابی میں چار پائی کے ارد گرد بیٹھے ہوئے غمزہ کسان بار بار خون آلودہ چادر ہٹا کر احمد شاہ کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ اردیا گلوں کی طرح روتے ہوئے بدستور بین کرنے میں مصروف تھے۔

”اوشے کتے چلیا اس سانڈ چھڈ کے۔ اوشے پیرا متیاں والیا!“
مسعود جمال کو دیکھ کر باہم چہ میگوئیاں کرتے ہوئے پولیس کے سپاہیوں نے اینٹیشن ہو کر سیڑج کیا۔ کچھ دیر کے توقف کے بعد مسعود جمال میڈیکل آفیسر سے کہہ رہا تھا۔

”آپ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ہسپتال لے جائیے۔“
پھر اس نے سپاہیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔
”آپ لوگ لاش کے ساتھ جائیے۔ اور تھا نیدار صاحب سے کہیے کہ وہ خدا ایک جیب اہتمام سٹیج سپاہیوں کہلے کہ جلدی سے یہاں پہنچ جائیں۔ چلیے، جلیے، جلیے۔ ورنہ نہیں ہوتی چاہیے۔“

پھر اور نہ ہت ورنہ یک برآمدے میں کھڑے سپاہیوں، مڑتے ہوئے کسانوں، میڈیکل آفیسر اور احمد شاہ کی لاش کو جلتے ہوئے دیکھتے رہے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تیز رہے تھے۔ اودہ خاموش تھے۔ ہولے ہولے چلتی ہوئی

صحرائی جوانے درختوں کی ٹہنیوں اور شاخوں میں الجھ کر ایک المیہ راگ چھیڑ دیا تھا۔

”گھر، گھر، گھر، گھوں، گھوں، گھوں، گھر۔“
 ”جیب آرہی ہے غالباً“ نزہت نے بے تاب ہر کر کہا۔
 ”ہوں۔“

اور چند منٹ بعد جیب جو پولیس کے مسلح سپاہیوں سے لدی ہوئی تھی۔ ریٹ ہاؤس کا بڑا گیٹ عبور کر کے کیاؤنڈ میں داخل ہوئی۔ تھانیدار اُچھل کر جیب سے اترا اور سیلٹ کرنے کے بعد مسعود جمال کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

”ایمنیشن پورا ہے۔“ مسعود جمال نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“

”سپاہی کہتے ہیں؟“

”جی جیس سپاہی ہیں۔ میں بموجب حکم تھانے کے تمام سپاہیوں کو

لے آیا ہوں۔“

”ہم ”پتے“ کتنے عرصہ تک پہنچ جائیں گے؟“

”زیادہ سے زیادہ“ اودھ گھنٹ لگے گا جناب۔“

اور مسعود جمال جیب میں سوار ہونے ہی کو تھا کہ بڑے گیٹ سے دو

سائیکل سوار ریٹ ہاؤس کے احاطے میں داخل ہوتے دکھائی دیئے۔

جلدی جلد ہی بیڈل گھار رہے تھے۔ جیب کے قریب پہنچ کر وہ سائیکلوں سے

اتر گئے۔ اور پسینہ خشک کرنے لگے۔ ان میں سے ایک نہایت خرقہ کی قسم کا آدمی تھا۔ اس نے قمری رنگ کی ایک دھوٹی باندھی ہوئی تھی۔ جس کے لیے لہجہ لڑ زمین پر جھاڑوسی دے رہے تھے۔ اس کی گپڑی کا اونچا طرہ ہمارے جھنڈے کی طرح اُترا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں چمک مدام اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ بھاری چہرے کے نقوش اتر رہی ہوئی لیکن گھنی داڑھی میں پچھپے ہوئے تھے۔ اس کے ہونٹ بڑے بد وضع اور بڑے مسٹے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہرنٹن کی جگہ گوشت کے بھاری ٹوٹھڑے لٹکائے گئے ہیں۔ اور وہ سراخنہ نہ بہت کو یہ دیکھ کر آگ ہی تو لگ گئی کہ دوسرا شخص وہی تھی مگر مونیوں والا شاعر تھا۔ جن کی اول جدول شکل کو معرفت اور شعرت سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔

”اگر یہ کجخت اس وقت نہ آتا تو کونسی قیامت ٹوٹ پڑتی؟ نہ بہت بل کہ زیر لب بڑبڑائی۔“

”حضور ایک تازہ قطعہ عرض ہے۔“ کھٹی مگر مونیوں والے شاعر نے مسعود جمال سے مخاطب ہو کر آداب بجالاتے ہوئے کہا۔

”عزیزی صاحب اس وقت میں مصروف ہوں۔“ مسعود جمال نے بڑھی ملائیت سے جواب دیا۔

”حضور یہ تازہ قطعہ اسی مصروفیت کے بارے میں ہے۔“ اس نے مانت نکو سن دیئے۔

مسعود جمال نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”تو پھر سنا ڈالیے۔“

”جی نہیں حضور وہ قطعہ اکیلے میں سنانے کے قابل ہے۔ چونکہ وہ صرف آپ کے لیے ہے۔“ کتنی مارکہ مونچھوں والے شاعر نے ایک بار پھر اپنے لیے دانت عریاں کرتے ہوئے کہا۔

اس پر مسعود جمال نے رک کر ایک لمبے کے لیے کچھ سوچا۔ اور پھر نہ ہمت کی حیرانی اور غصے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ جیسے باند کے تار سے بندھا، کتنی مارکہ مونچھوں والے شاعر کی طرف کھینچتا چلا گیا۔ وہ اسے ذرا پرے لے گیا۔ ”قریباً بیس منٹ تک آپس میں گھس گھس کرتے رہے۔ اس عرصے میں وہ حرفتاک قسم کا شخص جو کتنی مارکہ مونچھوں والے شاعر کے ہمراہ آیا تھا۔ تھانیدار کو ایک طرف لے جا کر اس سے سرگوشیوں کے انداز میں گفتگو کرتا رہا۔ نہ ہمت نے سمجھا کہ ایک بار پھر مسعود جمال کی جانب دیکھا۔ وہ مسلسل نکاح میں سرگرم تھا۔ کتنی مارکہ مونچھوں والا شاوڑے پر باندھا میں اسے کچھ بھابھاتا۔ آخر مسعود جمال نے جیسے قائل ہو کر ہفت میں سرگرمیاں کتنی مارکہ مونچھوں والے شاعر نے خوش ہو کر اپنے بے چمک مانے قریاں کر دیئے۔

پھر وہ دن اپنے اپنے سائیکلوں پر سوار ہو کر بدھ سے آئے تھے اور صبر ہی چلے گئے۔ مسعود جمال نہ ہمت کے قریب آگیا۔

”اشو سی ہے کہ آج ہم“ پکتے ”پر چھاپہ نہیں بارہ سکتے۔ مسعود جمال نے نہ ہمت کی نظروں سے کتراتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟“

مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ ”لوگ پوری طرح مستح ہیں۔ اور انہوں نے

کہا ہے ۔

”اگر پولیس ہمارے گانڈ کے قریب بھی پھٹکی تو ہم بھون کر رکھ دیں گے۔“
 ”اور تم اس دھمکی سے ڈر گئے۔ تم جو اس ضلع میں حکومت کی نمائندگی کر رہے ہو؟“

”ڈرنے کی تو خیر کوئی بات نہیں، دراصل اس وقت ہماری پولیس فوجیں تعداد میں بہت کم ہے۔ ہمارے آباد کے تھانے میں کل بیس سپاہی ہیں۔“
 ”پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس وقت جتنے سپاہی ہیں، ان سے کام چلایا جاسکتا ہے۔“

”پاگل نہ بنو نہ مت! بھلا پولیس کے بیس سپاہی ایک پورے مسلح گانڈ سے کس طرح مقابلہ کر سکتے ہیں؟“
 ”اگر یہ سپاہی ہنگامی حالات سے نمٹنے کے قابل نہیں تو کیا ان کو فائٹس کے لیے تھانے میں رکھا ہے؟“

”لیکن میں جذبات میں اگر اپنی جان اور بیس سپاہیوں کی زندگی کو داؤ پر لگانے کے لیے تیار نہیں۔“

”لیکن احمد شاہ کے بچے اور بیوی؟“
 ”انہیں وہ لوگ کچھ نہیں کہہ سکتے۔“

”یہی بات تم نے کل احمد شاہ کے متعلق کہی تھی۔ خدا کے لیے مجھے تسلی سے کام مت لو، یہ معصوم زندگیوں کا سوال ہے جنہوں نے کوئی گناہ نہیں کیا، اگر تم اس وقت ان کی امداد کے لیے نہ پہنچے تو احمد شاہ کی مدد تمہیں کبھی معاف نہیں

کرے گی۔ احمد شاہ قہار سب سے مخلص، سب سے پیارا دوست تھا اس نے کبھی نہیں کسی کام کے لیے نہیں کہا تھا۔ لیکن مرتے مرتے اس نے کہیں....۔ اور نہ بہت اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔ شدت جذبات سے اس کا گلہ بند ہو گیا تھا۔

”سفر، نہ بہت! میں نے تم سے آج تک کبھی سخت لہجے میں بات نہیں کی۔ لیکن اس وقت مجھے کہنا پڑ رہا ہے کہ اس ضلع کا ڈپٹی کمشنر میں ہوں، تم نہیں یہاں کے حالات کو میں تم سے بہتر سمجھتا ہوں۔ اس وقت میں جو کچھ کر رہا ہوں، سوچ کچھ کر کر رہا ہوں۔ وہ لوگ اس وقت خوں کے نشے میں بہکے ہوئے ہیں، انہیں تار سے زیادہ گاؤں کی حمایت حاصل ہے۔ ان کی مدد کرنے والوں میں صرف ان کے بنگڑے ہوئے مرید ہی نہیں بلکہ... ٹاکو بھی شامل ہیں، جن کو وہ پناہ دیتے ہیں، وہ تم کے تمام مسلح ہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ احمد شاہ میرا دوست تھا اس وقت ان کے سامنے نہ قانون ہے اور نہ عدالتیں، ان کے سروں میں خون سمایا ہوا ہے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے ہمو کے دبیز پردے ہیں۔ وہ اس سے نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ سوچ سکتے ہیں۔ ان حالات میں اگر میں خود کو اور ہمدون آباد کے پورے قحطی کے ان کے مقابلے میں محض ایک دوں تو جانی نقصان کے علاوہ اور کچھ حاصل نہ ہو گا۔“

”تو پھر اب کیا کرو گے۔ تمہارے لیے کچھ نہ کچھ کرو۔“ مجھے بے بسی سے بگڑا ہوا آنکھوں کی بے قصوریاں تھیں وہاں سے گی۔ احمد شاہ کی روح تو اب رہی ہوگی۔ مجھ نے اس کے بیوی بچے، زندہ ہیں یا....۔ نہیں۔ بھٹی جلدی کرو۔“

”دیکھو نہ بہت! تم پھر جذباتی ہو رہی ہو۔ اس وقت میں وقت اور حالات

کے سامنے بے بس ہوں۔ میں اب تھکتے جاؤں گا۔ وہاں سے بہاول نگر تاروؤں کا
کہ مزید پولیس فورس بھیجی جائے۔ اس کے بعد ہم کل رات انشاء اللہ بچے پر چھاپ
ملیں گے۔“

یہ کہہ کر مسعود جمال پولیس کی جیب کی طرف بڑھا۔

”ایک منٹ کے لیے، میری ایک بات اور سن جاؤ۔“

مسعود جمال رُک گیا۔

”بھئی، میں تو یہی کہتی ہوں، کتنی ہی وقت بچے پر چھاپ مارنا چاہیے۔ اگر
تم پولیس کے ساتھ ہو گے، تو وہ لوگ قطعی مقابلہ کر سکیں گے۔ وہ ٹوٹی کیشنز کی
آمد کا سن کر ہی ڈب جائیں گے، دیک جائیں گے اسیسا نہ بھی ہو تو ایک مخلص
دوست کے چھوٹے چھوٹے بچوں اور بیوی کو بچانے کے لیے ایک فدا سا خطر
مول لینے میں آخر ہرچ ہی کیل ہے؟“

”تمہیں بار بار میو تو فنی کی بات دہرانے میں لطف کیا آتا ہے؟“ مسعود

جمال نے غصے سے کہا۔ اس نے کبھی زہرت سے غصے میں نہ بات کی تھی۔
وہ جھنجھلا کر پھر جیب کی طرف جانے لگا۔ لیکن زہرت نے اسے روکنے کے
لیے اس کا بازو تھام لیا۔

”کچھ تو خیال کرو بھئی۔“ وہ ان تین معصوم جانوں کو جو اس سے تھارے

ایک مخلص ترین دوست کی امانت ہیں، مار ڈالیں گے۔ وہ مرتے مرتے اپنے
بے جان جسم کو اٹھ کر تھارے پاس آیا تھا۔ چونکہ وہ سمجھتا تھا کہ تھارے علاوہ
اور کوئی نہیں، جسے وہ اپنی امانت سونپ سکے۔ فدا کے لیے اس امانت کی

حفاظت کرو۔ لوگ تو اپنے دوستوں کے لیے بہت کچھ کر جاتے ہیں۔ تم اتنا بھی نہیں کر سکتے؟“

”احمد شاہ کے بیوی بچوں کے بارے میں اس وقت کچھ معلوم نہیں، کہ زندہ ہیں یا قتل کر دیئے گئے۔ کیا پتہ انہیں احمد شاہ سے پہلے ہی مار دیا گیا ہو۔“
 ”اُت! ایسا نہ کہو۔ بہر حال اگر انہیں بچایا جاسکتا ہے تو تمہارا فرض ہے کہ انہیں بچاؤ۔“

”میرا فرض یہ ہے کہ میں ہر کام سوچ سمجھ کر کروں۔ ہر قدم جذبات میں ہلک کر نہیں بلکہ ناپ تول کر اٹھائوں۔ میں اپنی اور اپنے سپاہیوں کی زندگی ایک ایسی عورت اور اس کے ان بچوں کے لیے خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار نہیں جن کو ان کے اپنے قریبی رشتہ دار جن کا ان سے خون اور گوشت کا تعلق ہے، زندہ چھوڑنے کے سوا دار نہ ہوں۔“
 ”وہ تمہیں بزدلی کا طعنہ دیں گے۔“

”کون؟“

”ضلع کے تمام لوگ۔“

وہ بڑے طنز سے مسکایا۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں اس ضلع کے لوگوں کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہوں۔ اب میرا مزید وقت ضائع نہ کرو میں نے جو فیصلہ کیا ہے بالکل درست کیا ہے۔“

نوسہ دہنے سے اسے ایک بھر پور نظریہ دیکھا۔ مسعود جمال اور اس کی شادی کر

چھ برس گزر چکے تھے۔ اور وہ اس کے چہرے کے ہر تاثر سے واقف تھی۔ اس کے ہر خیال سے اسے آشنا تھی۔ اس نے مسعود جمال کی سیاہ آنکھوں میں جھانکا اور اس سے اسے وہ آنکھیں ان کھڑکیوں ایسی دکھائی پڑیں جو تاریک غلاؤں کی مانند منہ پھاڑے رہتی ہیں۔ نوزہت کے شاداب چہرے کا رنگ معاذرہ ہو گیا۔ جیسے کسی ہرے بھرے پتے پر چائیک بھلی گری ہو، اور وہ پیلا پڑ گیا ہو۔ اس نے مسعود جمال کا بازو چھوڑ دیا اور ایک لفظ کے بغیر واپس پانے میں لگ گئی۔ مسعود جمال حجب تھانے سے واپس آیا تو نوزہت نے دیکھا کہ وہ کبھی ملکہ سوئچوں والا شاعر اس کے ہمراہ تھا۔ وہ دونوں گئی رات تک لان میں بیٹھے باہم پراسرار سرگوشیاں کرتے رہے۔ اور نوزہت ریسٹ ہاؤس کے اندر مٹی صحن میں میٹھی جلتی رہی۔

جب مسعود جمال، کبھی ملکہ سوئچوں والے شاعر سے فارغ ہو کر اندر آیا تو نوزہت نے بڑی بے دلی سے پوچھا۔
 ”کیا ہوا؟“

”ہونا کیا تھا۔ احمد شاہ کےیری اور بچے بھی قتل کر دیئے گئے ہیں۔ میں نے بہاول نگر حکم بھیج دیا ہے کہ مزید پولیس فورس بھیج دی جائے۔“
 ”اب پولیس فورس منگوانے کا فائدہ؟“

”ہاں یہی فی سوج رہا ہوں۔ چونکہ قاتلوں کو گرفتار کرنا اب پولیس کا کام ہے۔ ہمیں کل صبح بہاول نگر چلنا چاہیئے۔ مجھے اطلاع ملے ہے کہ کل شام کشن آ رہے۔“
 ”بیوی بچوں کو کب قتل کیا گیا؟“

” احمد شاہ کے قتل کے تین گھنٹے کے بعد “

” اندھیر ہے، نزہت چلا آگئی۔ اگر تم اس وقت میرے کہنے کے مطابق

چلے جاتے تو شاید وہ لوگ بچ جاتے۔ “

” اس وقت اگر میں چلا جاتا تو میری جانی بھی خطرے میں تھی “

نزہت نے کوئی جواب نہ دیا، اور ساری رات آنسوؤں سے تکیے کو

بھگوتی رہی۔

اگلے دن وہ علی الصبح بہاول نگر کے لیے روانہ ہو گئے۔ ان کی روانگی سے

پچھلے مساندھیر سے ہی کتنی بار کہہ سکتے تھے والا شاعر پھر ریٹ ہاؤس آدھ کا تھا۔

مسعود جمال اسے کار سے دور لے جا کر بڑے پروردگار خدا میں کچھ تحقیق کرتا رہا۔

اور وہ اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ چلتے وقت اس نے مسعود جمال کو اپنے لیے

بے ہنگم دانت نکال کر الوداع کہا۔

جب کار ریٹ ہاؤس کے صدر دروازے سے نکل کر نزہت پر ایک

عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ اسے رو رہا کہ احمد شاہ کی مظلوم بیوی ہر گینہ

بچوں کا خیال آ رہا تھا۔ جنہیں خاندانی مناقشات اور بے بنیاد ٹھنیوں کے سنگدل

دیوتا کے پتھر یے چرنوں میں اپنے لہو کی قربانی دینا پڑی۔ نزہت کے ذہن میں ایک

اجنبی سے سوال نے سر اٹھایا یہ کیا اس کے بعد ہارون آباد آنا نصیب ہو گا کسی

نحیٰ ہی آواز نے پکار کر کہا۔

” نہیں۔ “

اُٹ یہ تو احمد شاہ کے مقتول بچے کی آواز تھی۔

اور جب یہ لوگ بہا مل نگر پہنچے، تو معلوم ہوا کہ کشش آج شام یہاں پہنچے والا ہے۔ مسعود جمال تو کچھری چلا گیا اور نزہت ڈرائیگ روم میں دھنسی دوئی رہی۔ آنسوؤں کا خزانہ ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔

شام کے وقت مسعود جمال دفتر سے آکر میٹھا ہی تھا کہ کشش کی کارپوں پوک کرتی جنگلے میں داخل ہوئی۔

مسعود جمال جلدی سے باہر نکلا اور نزہت منہ دھو کر غسل خانہ میں بیٹھ گئی۔ جب وہ اپنی حالت ٹھیک کر کے واپس ڈرائیگ روم میں آئی تو دیکھا کہ وہاں کشش اور مسعود جمال موجود تھے۔ کشش نے بڑے اخلاق سے اٹھ کر نزہت کا استقبال کیا۔ ”ہیلو مسز مسعود! ہاؤ۔ آر۔ یو؟“

اتنے میں چائے بھی آگئی۔

کھٹاک۔

دو ماہہ گھلا۔ نزہت نے چونک کر دیکھا، اردلی چائے لا رہا تھا۔

”اوہ“ نزہت نے گڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھا۔ تو وہ فطکری میں ڈبی سی

ہاؤس کے ایک تاریک کمرے میں بیٹھی تھی۔

”ہیگم سب!“ بلب تو ملایا ہوتا۔ اندھیرے میں کیوں بیٹھی ہیں؟ اردلی

نے حیرانی سے کہا۔

”بھئی تمہری جلاو، میری طبیعت خراب ہے۔“

”ہٹھ“ اور پورا کمرہ بلب کی روشنی میں نہا گیا۔

اردلی چائے رکھ کر چلا گیا۔ نزہت نے بڑی آہستگی سے پیالی میں چائے انڈلی۔ ارد چینی گھونٹے گھونٹتے پھر سامانِ نگر والے بیگلے کے ڈرائیگ روم میں چلی گئی۔ وہ کشر کی پیالی میں چینی گھول رہی تھی۔ اور وہ دھیمے انداز میں مسعود جمال سے کہہ رہا تھا۔

”مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ کل جب ”پکا“ میں تین قتل ہوئے تو آپ ہمدردی آباد میں ہی موجود تھے؟“

”جی ہاں۔“

”اور مقتولین، آپ کے ملنے والوں میں سے تھے؟“

”جی ہاں۔“

”پھر تو لازماً آپ نے قاتلوں کو موقع پر ہی گرفتار کر لیا ہوگا؟“

”جی نہیں۔“

”کیوں؟“ کشر نے حیرانی سے پوچھا۔ لیکن نزہت جان رہی تھی کہ

کشر کی حیرانی مصنوعی ہے۔ اس سے تمام واقعات کا علم ہو چکا ہے۔

”یہ ایک لمبی کہانی ہے۔“ مسعود جمال نے سگریٹ سڈگلتے ہوئے کہا۔

”تو پھر میری کر کے یہ پوری کہانی سننا ہی ڈالیئے۔“

اور مسعود جمال نے بڑے مختاط لفظوں میں تمام واقعات کشر کے سامنے

بیان کر دیئے۔ اس نے دنیا کے بہترین ناول اور افسانے پڑھے ہوئے تھے۔

اور آج وہ یہ واقعات سناتے ہوئے تمام ناولوں اور افسانوں کی تکنیک کے

نچوڑ کو کام میں لا رہا تھا۔

”آپ کی قوتِ بیان کی داد دینی ہی پڑتی ہے۔“ کشر نے مسکراتے ہوئے کہا۔
 ”لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ کے پاس پولیس کے میں سپاہی موجود
 تھے۔ جو ہر طرح سے مسلح تھے۔ پھر آپ چھاپہ مارنے کے لیے بہاول نگر کی پولیس
 فورس کا انتظار کیوں کرتے رہے؟“

”میں نے عرض کیا تھا قاتلِ مقتول کے گزند میں، اور گندہ نشینی پیر ہیں۔ اور نہ
 صرف پتے کے گاؤں پر بلکہ اس پاس کے کئی دیہاتوں پر ان کا بے انتہا اثر ہے۔
 ان کے پاس خطرناک قسم کے ڈاکو بھی رہتے ہیں۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں
 خون اتا رہا تھا۔ اگر میں سپاہیوں کے ہمراہ پکے پر چھاپہ مارتا تو میں ممکن
 تھا کہ وہ لوگ بھی مقابلے پر اتر آتے۔ اس صورت میں نہ صرف میں سپاہیوں
 بلکہ مجھے اپنی جان کا خطرہ تھا جو کہ میں کسی صورت میں مول نہیں لے سکتا تھا۔
 اور اگر میں ایسا کر بھی بیٹھا تو یہ ایک قطعی غیر دانشمندانہ اقدام ہوتا۔“

”اگر آپ کو اپنی جان کا خطرہ تھا تو چھاپہ مارنے کے لیے آپ کا پولیس کے
 ساتھ ہونا ضروری نہ تھا۔ آپ پولیس کو تو چھاپہ مارنے کا حکم دے سکتے تھے
 جبکہ میری اطلاع کے مطابق آپ نے پولیس کو بھی یہ قدم اٹھانے سے روک رکھا۔
 اس صورت میں میں سپاہیوں کی جان خطرے میں پڑ جاتی۔“

”اگر پولیس کے بارے میں بھی اس طرح سے سوچا جائے کہ فلاں معاملے
 میں پولیس کو جان کا خطرہ ہے۔ اس لیے اسے چپ چاپ تھانے میں بیٹھے رہنا
 چاہیئے، تو پھر پولیس کے ٹھکے کو ختم کر دینا چاہیئے۔ اس کی ضرورت ہی کیا
 رہ جاتی ہے؟“

اس پر مسعود جمال کندھے جھٹکا کر غامض ہو گیا اور اس کے چہرے پر ناگواری کی لکیریں ابھرائیں۔

”دیکھیے مسعود صاحب! “ کشنز نے پھر کہنا شروع کیا۔ اس دفعہ اس کا لہجہ قدرے درشتگی آمیز تھا۔ ”آپ کو یاد ہے، آپ نے مجھ سے ایک بار کہا تھا۔ کہ ”میں نے آپ سے کہیں زیادہ کتا ہیں پڑھی ہیں۔ میں آرٹ کو بھی آپ سے بہتر سمجھتا ہوں۔ اگر ضلع کے اٹھ پڑھ اور تنگ خیال عوام مجھ جیسا نہیں سمجھتے تو آپ کو بھی کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ میری قابلیت پر خبہ کریں۔“ یاد ہے آپ کو یہی کہا تھا تا آپ نے؟ آج آپ کی قوت بیان دیکھ کر میں یہ مٹنے پر مجبور ہوں کہ واقعی آپ نے مجھ سے زیادہ کتا ہیں پڑھی ہیں؟ کشنز نے ایک لمحہ کے لیے رک کر ڈرائیونگ روم میں چاند طرف نظریں دوڑائیں، اور پھر کہنے لگا۔ ”اے اے ڈرائیونگ روم میں ٹنگی ہوئی تصویروں کو دیکھ کر میں یہ بھی مانتا ہوں کہ آپ آرٹ کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مجھے انیسویں ہے مسعود صاحب! کہ میں آپ کی اہلیت پر شک کر رہا ہوں۔“

”شکریہ۔ لیکن مجھ اب بھی اصرار ہے کہ میں نے جو کچھ کیا حالات کے مطابق بالکل ٹھیک کیا۔“ مسعود جمال نے کہا۔

”خیر یہ کہہ کر آپ نہ مجھے مطمئن کر سکتے ہیں اور نہ اپنے ضمیر کو بہر حال چاہیے تو یہ تھا کہ میں آپ کو استغفیٰ دینے کا مشورہ دیتا لیکن میں اتنا کر سکتا ہوں کہ آپ اپنی ٹرانسفر کے لیے درخواست دے دیں۔ تو میں اس پر سفارش کر کے آگے بھجوا دوں۔“ یہ کہہ کر کشنز بہادر لنگر کے کینال ریسٹ ہاؤس میں چلا گیا۔ جہاں

اسے ٹھہرنا تھا۔

ادباز نرہت نگہمیری کے ڈی۔ سی۔ ہاؤس میں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اب اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آگیا ہے۔ جو کئی دنوں سے اس کے ذہن کی پہنائیوں میں پرورش پا رہا تھا۔ اب وہ تمام تلخ باتیں مسعود جمال کے سامنے اُگل دینا چاہتی تھی۔ جو بہت دنوں سے اس کے دل و دماغ میں بس گھول رہی تھیں۔ اب وہ اس زہر کی تلخی زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اب وہ اس کو ٹاپا ہٹ کر ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہتی تھی۔ اس کو ٹاپا ہٹ میں اپنے وجود کو گھلا تے رہنے سے بہتر تھا کہ اس سے چھٹکارا پایا جائے۔ چھٹکارا جو عارضی نہیں بلکہ دائمی ہو۔

ٹھیک۔ ٹھیک۔ ٹھیک۔ وہ چونکی تو قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر دروازہ ایک چرچراہٹ کے ساتھ کھلا۔ اور مسعود جمال مسکراتا ہوا داخل ہوا۔

”اے، تم سنائی بھی نہیں۔ کپڑے بھی نہیں بدلے؟“

”نہیں۔“

”کیوں آخر؟“

”میں نہیں نہاؤں گی۔ میں کپڑے بھی نہیں بدلوں گی۔ میں تمہارے ساتھ

رہنا نہیں چاہتی۔ میں تمہیں چھوڑ دینا چاہتی ہوں۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟“

”ہاں میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ تم خود مجھے طلاق دے دو، ورنہ میں عدالت

میں جا کر طلاق لے لیں گی۔ اب میں برداشت نہیں کر سکتی۔ اب سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکتا تھا وہ میں نے کر دیا۔ اب مجھ میں ہمت نہیں رہی کہ میں تمہارے ساتھ چل سکوں۔“ مسعود جمال کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔

”تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔“

”خدا شاہد ہے کہ میں تم سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی۔ چھ برس تک میں نے وہاں وہاں بجدے کیے ہیں جہاں جہاں تمہارے قدموں کے دھندلے سے بھی فضا ہی دیکھے ہیں۔۔۔ میں تم پر اسی طرح ایمان رکھتی تھی جیسے خدا پر ایمان رکھا جاتا ہے۔ میرے نزدیک تمہارے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ وحی کا درجہ رکھتا تھا۔ میں نے تمہیں دل کے سنگھاس پر دیوتا بنا کر بٹھایا۔ اور وہ رات تمہاری عبادت کی، لیکن اب یلہسم ٹوٹ چکا ہے۔ مجھے اب جانے دو۔ میں اب چلی جاؤں گی۔“

مسعود جمال نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ یکایک اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر پڑیں اور پھر وہ بُری طرح رونے لگا۔ اس کی سرسکیاں مکرے کی فضا میں پھیل گئیں۔

”دن نہ ہوتا اتنی سنگدل نہ بنو۔ مجھ پر اتنا ظلم نہ کرو۔ میں تمہارے بغیر کیسے جی سکوں گا۔ مجھے مت چھوڑو نہ نہت نہت نہت نہت نہت نہت۔۔۔“

”نہیں۔ نہیں۔ اپنی سرسکیوں سے میرا ستہ نہ روکو۔ میں اب تمہارے ساتھ کسی صورت نہیں چل سکتی۔ مجھے اپنی راہ پر جانے دو۔ مجھے ضرور جانا

چاہیے۔ ضرور۔ میں اب کس طرح تمہارے ساتھ رہ سکتی ہوں۔ ایک عرصت کا
 سب سے بڑا غرور اس کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اگر یہ غرور ٹوٹ جائے، تو پھر۔۔۔
 تو پھر۔۔۔۔۔ اب مجھے جانے دو۔“

مسعود جمال نے نزہت کے پاؤں پکڑنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ جلدی
 سے کمرے سے یہ کہتی ہوئی نکل گئی۔

”میں نہیں شیعے سمجھتی تھی۔ لیکن تم تو ڈیڑھ کشتی نکلتے۔“

(ماہنامہ ادبِ لطیف، لاہور)

ادھوری تصویر

تصویر مکمل ہو گئی تھی۔

اتل نے سگریٹ سلگایا اور اینزل سے مذاقاً چلے پر بھوری ملائم قمیوں پریٹ کر آسمان کو دیکھنے لگا۔ اسے اس طرح لیٹنا اچھا لگتا تھا۔ اس طرح وہ اپنے اندر اور باہر بڑا سکون اور شانتی محسوس کرتا۔ اس نے اپنے اعصاب کو جیسے چھوڑ دیئے اور انھیں روند لیں۔ پھر وہ سو گیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی، سامنے نیلی ایک پتھر پر بیٹھی تھی۔

”ہیلو اتل، سو گئے تھے؟“

وہ مسکراتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور ایک درخت کے تنے سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔

تم سوتے میں بیٹھ کر کسی کہانی کے کردار کی طرح لگ رہے تھے۔ وہ بھی کھلے میں اس طرح بنے ہوئے ہیں۔ وہ مسکرائی۔

”LIKE IT THIS WAY“

اتل سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔ اسے لاجواب یاد آگئی۔ وہ جب بھی نیلی کے ساتھ ہوتا اسے لاجواب یاد آ جاتی۔ وہ سیدھی سادی دیہاتی لڑکی جس نے ٹیس تنگ نہیں دیکھی

تھی۔ لاجپک خیال اس کے دل و دماغ میں کچھ اس طرح آتا جیسے ٹکی ہلکی دھندلے سے چھو کر اڑ رہی ہو۔ ایک نرمی اور خوشگوار ٹھنڈک اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ سنگریٹ ختم کیا۔ اس دوران نیلی ایزل پر لگی تصویر دیکھتی رہی۔ اس کی پیٹھ اقل کی طرف تھی۔ پچھلی پچھلی جینیز اور شرٹ میں ایسی لگ رہی تھی جیسے ایک ایک الگ الگ پتھروں سے کٹ گیا ہو۔

”یہ تمہارے لیے ہے۔“

”مجھے اینڈ میکپ پسند نہیں۔“ وہ پلٹ کر بولی۔ ”یہ درخت، سیٹ اور زمین کی چھتیں، چینیوں سے نکلتا دھواں، دو چوٹیوں پر چمکتی برف، جبر نے، آبشاریں تو میں بیس سال سے دیکھتی آ رہی ہوں۔ مجھے یہ سب بے معنی اور ٹھہرا ٹھہرا سا لگتا ہے۔ کوئی ایسی چیز تاکہ دوچھو دیکھ کر سو رگوں میں دوڑتا ہوا محسوس ہونے لگے۔“

اتنی نے اسے غور سے دیکھا اور سوچا۔ اس لڑکی کو اس کے تمام تر خیالات، جذبات اور احساسات کے ساتھ کیٹنس پر ابھارنے کے لیے کون سے رنگ دکھار ہوں گے۔ اور لاجپک کے لیے۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ وسیع۔ شفاف۔ نیلا۔

”تمہیں شکار کا شوق ہے۔“

”مجھے گھوڑوں سے واسطہ نہیں رہا۔“ اتنی اپنی چیزیں سیٹنے لگا۔ وہ ہچکلا کر اس پتھر تک گیا جہاں سے سڑک دکھائی دیتی تھی اور نیچے اُس کو ٹھکی کی ٹہنی کی ہری چھت بھی، جس میں وہ ابی دنوں رہ رہا تھا۔ کوٹھی

کے دُکُش سے دُصاں نکل رہا تھا۔

”رام سنگھ نے کام شروع کر دیا ہے۔“

”ہاں نیلی اس کے قریب آگئی۔ اس قدر قریب کہ وہ اس کے جسم کی آئینچ محسوس کر سکتا تھا۔ چُست لباس میں ٹھانٹیں مارتے جسم کو مس سکتا تھا۔ میں اسے پانی گرم کرنے کے لیے کہہ آئی ہوں۔“

آئل نے چپڑے کی جیکٹ پہنی اور ایزل اٹھالیا۔ تھیلائنی نے شانے سے لٹکا لیا تھا۔ وہ باتیں کرتے ہوئے سڑک پر آگئے۔ نیلی نے اس کا بازو تھام لیا تھا اور اپنا بوجھ تقریباً اس پر ڈال کر آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ آئل اس کی گرم سانس کو اپنی گردن اور گالوں کے قریب محسوس کر رہا تھا۔ وہ اسے اپنی ایک سیٹل کے بارے میں بتا رہی تھی جو اس کے بھائی کو چاہتی تھی، لیکن وہ کینیڈا چلا گیا جہاں اس نے ایک جرمن لڑکی سے شادی کر لی، اور جب وہ اداس رہنے لگی تو نیلی نے اسے سمجھایا کہ جہاں تک شادی کا تعلق ہے، سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں، عدوت کو صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ کتنا کماتا ہے۔ آج کل اس کی وہ سیٹل ایک آئی ایس اسے افسر کے چکر میں ہے۔ پھر وہ ایک لڑکے کے بارے میں بتانے لگی جو تھا تو تعلیم یافتہ لیکن جسے بندروں کی طرح درختوں پر چڑھنے، اُچھل کود کرنے اور جنگلوں اور پہاڑیوں پر بھٹکنے میں مزا آتا تھا۔ وہ سخت وحشی تھا۔

آئل سگریٹ سے سگریٹ سلگاتا، خاموش چل رہا تھا۔ لا آج نے اسے اپنے بھائی کے بارے میں بتایا تھا جو صبح سے شام تک کھیت پر کام کرتا تھا، اس نے

ایک دیر تا کا ذکر کیا تھا جو سامنے والے کالے پہاڑ کی چوٹی پر رہتا تھا۔ اور ان کے گاؤں کو ہر مصیبت سے بچاتا تھا اور ان کی فصلوں اور ڈھیر ڈھیروں کی رکھوالی کرتا تھا۔ اسے یاد آیا کہ لاچر ڈھیلا ڈھالا لباس پہنتی تھی اور ہنستی رہتی تھی۔

”اے۔“ نیکی نے اس کی کلائی میں ناخن چھبویا۔ ”اگر میں تم سے شادی کروں تو بار بار تمہیں یاد کرانا پڑے کہ میں تمہاری بیوی ہوں۔“ وہ ہنسی مسٹر آرٹسٹ جب کسی لڑکی کے ساتھ ہوتے ہیں تو اس طرح خود میں نہیں تڑپتے۔ باہر نکل کر دھا کر دے۔“

”سوری“

”آج تمہارا کیا پروگرام ہے۔ میرا مطلب ہے اگر آج تمہارا کوئی پروگرام ہے۔“ APPOINTMENT ہو تو کیس کر دو۔ آج ہم کہیں دور چلیں گے۔ ذرا اڈوینچر ہے گا۔“

”تم تھکی نہیں۔؟“

”تم میرے اندر کہیں جیسے پنکھے چل رہے ہیں۔“ وہ مسکرائی۔ ”میں ابھی نہیں جس لڑکے کے بارے میں بتا رہی تھی، سب سے پہلے اُنہی نے تجھ سے میری ملاقات کرائی تھی۔ عجیب آدمی تھا۔ ایک دفعہ چوڑی لگی تو زخم پر کوئی دوا تک نہیں لگائی۔ سب نے اسے سمجھایا لیکن وہ بصرہ داکر اسے ایسے ہی اچھا لگتا تھا۔ جب وہ یہاں تھا تو میں اسے زیادہ پسند نہیں کرتی تھی۔ اب جب کہ وہ چلا گیا ہے تو اکثر یاد آتا ہے۔“ HE WAS ALIVE TO THE BONE پھر وہ کچھ

سوچ کر بولی۔ اہل۔ تم بھی تو کوئی بات کرو۔
”تم کرو“ میں سُن رہا ہوں۔“

”تم بڑے چالاک ہو۔ اس طرح تم میرے اندر جھانک لو گے اور تنہا
شخصیت مجھ سے چھپی رہے گی۔ یہ ٹھیک نہیں۔ کسی لڑکی کے ساتھ نہیں
آتا CUNNING نہیں ہونا چاہیے۔“

”میں CUNNING نہیں ہوں۔“

”تم ہو۔ نہیں تو بولتے کیوں نہیں۔ ہر وقت مجھے ہی بولنا پڑتا ہے۔
مجھے اپنے بارے میں، اپنے سفروں کے بارے میں بتاؤ۔ مجھے لوگوں سے
ان کے تجربات اور ایڈوینچرز کی کہانیاں سننا اچھا لگتا ہے۔“
”میرے تجربات میری تصویروں میں ڈھل جاتے ہیں۔“
”تم نے سارا ہندوستان گھوما ہے۔ مختلف ملکوں پر مختلف لوگوں سے
ملے ہو۔ ان کے بارے میں کیوں نہیں بتاتے تم۔“
وہ خاموش رہا۔

”ڈیڈی کے ایک ریٹائرڈ گزٹڈ دوست ہیں۔ وہ اکثر اوقات کوہاڑے ہاں
آ جاتے ہیں۔ انہوں نے شادی نہیں کرائی۔ آتش دان کے سامنے بیٹھ کر وہ
جب دوسری جنگ عظیم کی کہانیاں سناتے ہیں تو مزہ آ جاتا ہے۔ وہ اپنے
بارے میں کچھ نہیں چھپاتے۔ کوئی سے ملک میں انہیں کس کس قسم کی عہدوں ملیں۔
کس سودے پر کیا ہوا۔ ان کے پاس اتنے میڈل نہیں جتنی مختلف دیسوں کی
عہدوں کی تصویریں ہیں۔ ڈیڈی شکار کے قہقہے سناتے ہیں۔ ڈیڈی نے شیر

پہتے، بھالو، جنگلی سودر ہر جانور کا شکار کیا ہے۔ کئی بار زخمی ہوئے ہیں۔ آج کل
 اور کر نل انکل پھر شکار پر گئے ہوئے ہیں۔ ڈیڈی بڑے HATE R OF FACT
 قسم کے آدمی ہیں۔ انہیں صرف دو چیزوں سے محبت ہے۔ اپنی بندوق اور شکار
 کیے جانوروں کی کھانوں سے تمی رتی میں ڈوبی رہتی ہیں۔ کسی نہ کسی کو ڈھونڈ لاتی ہیں۔
 میں گھر میں ہوں تو مجھے کڑ میشتی ہیں۔ مجھے یہ ان ڈور لائف پسند نہیں۔ میرا جی
 چاہتا ہے افریقہ کے جنگلوں میں گھومتی پھروں۔ وسیع سمندوں میں ڈور دراز
 جزیرے تلاش کروں اور ان کے بارے میں لکھوں۔ کبھی کبھی تو میں سوچتی ہوں
 کہ مجھے یہاں پیدا ہی نہیں ہونا چاہیے تھا! YOU KNOW I HATE TO COMMIT
 اچھا تم اپنے سفروں کے بارے میں لکھ کیوں نہیں ڈالتے۔ میرے دل میں اکثر مال اشت
 ہے۔ تب میں چاہتی ہوں کہ لکھتی چلی جاؤں۔ دو چار مرتبہ کوشش بھی کی لیکن خیریت
 پنجرے میں بند چڑیوں کی طرح اڑنے اور چننے لگتے ہیں۔ تب مجھے سخت کوفت اور
 وحشت ہونے لگتی ہے۔ میں باہر کو دھڑکتی ہوں۔ تم لکھو، میں تمہاری سب کتا میں
 خریدوں گی۔“

”میں تمہیں کتا ہیں PRESENT کروں گا۔“

”SO NICE OF YOU“ وہ خوش ہو کر بولی۔ ”تم چار سال ہوئے ایک تھامی
 شاعر نے مجھے اپنی کتاب دی۔ خلوص اور نیک خواہشات کے ساتھ۔“ وہ ہنسی۔
 ”پڑھنے بیٹھی تو بور ہو گئی۔ کچھ بھی نیا نہیں تھا۔ وہی عشق میں مرے جلنے اور قبر کے
 بولنے والے عاشق کے یہودہ اور بے معنی جذبات۔ سب اگلی ہوئی باتیں ہیں۔
 کتاب آتش دہلی میں بھینک دی اور راکھ لفظ فی میں ڈال کر ان حضرت کو بندوبست کر دیا

واپس بھیج دی۔ میرا خیال ہے انہوں نے شاعری ترک کر دی ہوگی۔
”تم خاصی خطرناک ہو۔“

”آرٹسٹ کو ہمیشہ نئی بات کہنی چاہیئے۔“

اب وہ مگر پہنچ گئے تھے۔ اقل نہانے چلا گیا اور وہ دھوپ میں بیٹھ کر ایک
سیکڑی میں تصویریں دیکھنے لگی۔ لہجہ اونچے درخت اور صرا و صریچے بھری کوئٹیاں۔
چمنیوں سے اٹھتا دھواں۔ کسی کسی دریا کے میں کوئی چہرہ، دھوپ میں سوکتے کپڑے
اور سب سے پرے کالی پہاڑیوں کا سلسلہ۔ وہ بول رہی تھی۔ اس نے سوچا۔ اقل اتنی
اتنی دیر کیلئے بیٹھا یہ سب کیسے دیکھتا رہتا ہے۔ ان راہیات چیزوں کو دیکھ کر جانے
میں کیا محسوس ہے۔ کتنا ہے دور پہاڑیوں کو دیکھنے میں بڑا مزہ آتا ہے کیونکہ غور
ہے۔ کوئی پروگرام نہ ہو تو آدمی غم ہی دیکھ آئے۔ وہ اٹھ کر غسل خانے کی طرف چلی
گئی۔

”اے اقل جلدی کرو، میں بول رہی ہوں۔“

”کچھ پڑھو، اندریک میں کتابیں رکھی ہیں۔“

”میں دی کے وقت نہیں پڑھ سکتی، اور پھر مجھے تمہارا چیخوٹ اور پریم خندہ پسند

نہیں۔ تمہارے پاس ہیمنگ وے یا نہ دلا ہے؟“

”دلی ناراں تجھے مہا کیا ہے۔“ وہ گانے لگا۔

”اقل جب تمہاری آواز اچھی نہیں تو کہیں گاتے ہو۔“

”آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟“

”ٹھنڈا پانی۔“ وہ تقریباً یانچنی۔ ”نکلے ہو باہر کہ تمہاری چیزیں سڑک پر

پھینکوں۔“

اقل جلدی سے باہر آگیا۔ وہ جانتا تھا کہ نیل کاظمی صاحبہ اتنے ایک ساتھ کام کرنے لگتے ہیں۔ جتنی دیر وہ تیار ہو تا سہا سہا نیل اس کے ساتھ رہی اور ہینگوے کے گئی گاتی رہی۔

”ہمارے ہاں اس کی ٹگر کا ایک بھی ادیب نہیں۔ دراصل کسی کو زندگی کا انتخابی اور گراں شاہدہ اور تجربہ ہی نہیں۔ یہاں تو ڈائنگ روم میں بیٹھ کر ترقی پسند کہانیاں لکھی جاتی ہیں اور اگر کوئی ان پر اعتراض کرے تو اسے گالیاں اور مارنے کی دھمکی دی جاتی ہے۔ بے چارے عوام کے غم میں گھلے ہاں سہا ہیں۔“

مام سنگھ ناشہ لے آیا اور وہ ادھر متوجہ ہو گئی۔ وہ بڑے گھر پر انداز میں بیٹھ کر اقل کے لیے قوس پرکتھن اور جم لگانے لگی۔ پھر اس نے اقل کے لیے انڈے پھیلے اور کرنی بنائی اقل محویت کے عالم میں اسے دیکھتا رہا۔ گھر کی سے آتی دھوپ نیل کے بالوں اور گردن سے لپٹ کر بے حد پیاری اور خوبصورت ہو گئی تھی۔ پتہ نہیں دھوپ میں نیل کے بدن کی حرارت تھی یا نیل دھوپ کی ٹکلی گرنی سے تپ رہی تھی، اقل کو کمرے میں ایک نشہ آدرا پنچ کا سا احساس ہو رہا تھا۔ وہ میز پر جھکی پیالی میں چمچہ ہلا رہی تھی اور بڑی ہی اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے سوچا وہ خواہ مخواہ اس سے ڈرتا ہے۔ دوسرے ہی لمحہ وہ اس کا لباس دیکھ کر مسکرایا۔ جیسے مڑکی بھری بھری سی پھیل۔ اُسے لاجو یا دا آگئی۔ ”خاندانہ کے گھر جا کر اسی طرح کام کرتی رہے گی۔ روٹیاں پکا کر کھیت پر لے جائے گی اور کپڑے دھوئے گی۔ کپڑے فرش پر گر کر برکی پائی کرے گی۔ ڈھور ڈھنگوں کی دیکھ بھال کرے گی اور پھر

اپنا آپ اپنے خاوند کے حوالے کر کے یوں نشہ چنت ہو جائے گی جیسے منزل پر پہنچ گئی ہو۔ وہ شاید کبھی بس نہیں دیکھے گی۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہے۔

ڈیزل کا دھواں اور انجنوں کی گڑگڑاہٹ اس کی آتما کی شانتی اور شکوک کو مہر و صحر نہیں کر سکے گی۔ وہ سورج کے ساتھ جاگے گی اور اسی کے ساتھ سو جائے گی۔ اسے وہ شام یاد آگئی جب وہ لاجو کے باپ کے ساتھ ان کے گاؤں پہنچا تھا۔ سورج پہاڑیوں کے پیچھے جلد ہاتھ، سائے پھیل رہے تھے اور سامنے والا جنگل پرندوں کے شور سے گونج رہا تھا۔ لاجو اپنے گھر کے باہر بیٹھی رات کے کھانے کے لیے چٹنی میں دہری تھی۔ سورج کی ٹکابی کر نہیں لاجو اور سیب کے شکر فروں پر پڑ رہی تھیں اور جب وہ اٹھی تو اس نے سوچا تھا کہ وہ اس لڑکی کی تصویر بندے گا۔

”کرنی پیو۔“ نیلی بولی۔

وہ خوابوں کے جزیرے سے نکل آیا اور کوئی سبب کرنے لگا۔ نیلی اس وقت خاموش تھی۔ اٹل کو یہ خاموشی بڑی عجیب اور پراسرار معلوم ہو رہی تھی۔ اسے سامنے بیٹھی نیلی کا جسم کسی خوبصورت، مضبوط عمارت کے کماں مینار کی طرح لگ رہا تھا جو درختوں کے اوپر سے جھانک رہا ہو۔ اٹل کے دل میں بار بار اٹل تھا کہ وہ اٹھ کر نیلی کو اپنی باتوں میں بھر لے اس نے سوچا یہ جسم مرد کی قربت سے نا آشنا بھی نہیں ہو سکتا۔

”کی سوچ رہے ہو۔؟“

اُسے لگا جیسے وہ چوری کرنا پکڑا گیا ہو۔ اس نے آنکھیں نیلی کے چہرے سے ہٹالیں اور کھرکی سے باہر دیکھتا ہوا بولا۔

”کچھ نہیں۔ چلو کہیں چلیں۔“ دراصل وہ جینز اور شرٹ میں بھری بارود سے
ٹھنک گیا تھا۔

وہ باہر آگئے اور لان میں ٹھنسنے لگے۔ جب وہ تین پکڑ لگ چکے تو نیلی نے
رک کر کہا۔

”اٹل کوئی بات کرو۔ ورنہ میں اس پر جواؤں گی۔“
اٹل نے اس کی طرف دیکھا۔ اسے خود سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا بات کرے۔
”میں نے تمہیں بتایا تھا تاکہ میں ایک لڑکی کی تصویر بنانا چاہتا ہوں جو شملہ
کی پہاڑیوں میں جیل سے کچھ دُور ایک گاؤں میں رہتی ہے۔“

”NUDE!“

”نہیں بھئی۔“ وہ قد سے جھنجھلا گیا۔

مینیل بسٹرک پر سے گزرتی ایک لڑکی نے نیلی کو آواز دے لی۔ وہ اٹل سے
معافی مانگتی ہوئی ادھر چلی گئی۔ اٹل انہیں گیٹ پر کھڑے باتیں کرتے دیکھتا رہا۔
چند منٹ بعد وہ خوش خوش آگئی۔

”اٹل جانتے ہو یہ کون تھی۔ شملہ کی اے ون SKATER ہے آج

دنک میں رونق ہوگی۔ چلو وہیں چلتے ہیں۔“

دنک پہنچ کر نیلی SKATES یا شملہ کر فلوڈ پر چلی گئی۔ اٹل ایک کونے
میں بیٹھ کر انہیں دیکھنے لگا۔ نیلی ایک نوجوان کا بازو تھامے رقص کر رہی تھی۔ وہ
نمائت پھرتی اور خوبصورتی سے پہیوں پر گھوم گھوم جاتی۔ بار بار وہ نوجوان اس کی
کمر میں ہاتھ ڈال کر خطرناک حد تک اس پر قبضہ کرتا۔ وہ ایک ٹانگہ ہوا میں پھیل

کر ایک پاؤں پر دو دو تک اس فوجیوں کے ساتھ پھیلتی چلی جاتی۔ اتل نے سگریٹ
 سُنگایا اور سوچا۔ اس کے لاجو شاید باؤل پر کپڑے دھو رہی ہوگی اور تنہائی کے
 احساس سے بچنے کے لیے کوئی گیت گنگن رہی ہوگی۔ اسے وہ سہانی صبح یاد
 آگئی جب وہ سو کر اٹھا تھا۔ گھر کے تینوں افراد جاگ کر جا چکے تھے۔ اسے اپنے
 دیر سے جاگنے پر شرم کا احساس ہوا۔ وہ پچھلے برآمدے میں چلا گیا اور وہاں کے
 نرم اجالے کو گائوں پر پھیلتے دیکھنے لگا۔ جس کمرہ میں وہ سوئے تھے اس کے
 نیچے گایوں اور بکریوں کا بارہ تھا اور وہاں سے لاجو کی آواز آ رہی تھی۔ وہ شاید
 جانوروں کو چارہ ڈالتے ہوئے انہیں ڈانٹ ڈپٹ رہی تھی۔ وہ اس کی باتوں
 اور انداز گفتگو سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اس کے دل میں ایک عجیب معصوم سی خواہش
 پیدا ہوئی کہ وہ چھپ کر لاجو کو ڈھونڈ لگے۔ وہ دیکھنے لگا کہ ایسے
 میں وہ کیسی لگتی ہے۔ وہ ایک بچہ سے کمرے سے کھینچتی ہوئی باہر آگئی اصال کی
 دیکھتے ہی دونوں ہاتھ جوڑ کر نستے کی۔ پھر اندر بھاگ گیا۔
 اتل بے ساختہ ہنس دیا۔

وہ بھی ہنس دی اور جا کر پچھڑے کر کھینچ لائی۔

جد باجی چار بنا دیں۔ ۴۰

”نہیں لاجو، یہ پھر بھاگ جائے گا۔“ اس نے پہلی مرتبہ اس کا نام لیا تھا۔ یہ
 دیکھنے کے لیے کہ وہ اس کا کیا اثر لیتی ہے۔ لیکن وہ بچہ شرم سے کھینچتا تھا کہ وہی تھی۔
 اس نے رتی ایک درخت سے بازو دی اور ہاتھ جھاڑ کر کھڑی ہو گئی۔
 ”بیری بڑی بہن اس طرح کھینچ کھا پنچ کر مجھے سکول بھیجا کرتی تھی۔“

”بابو جی تم نے چودہ جماعتیں پاس کی ہیں۔؟“
”سوال۔؟“

”ہمارے گاؤں میں کوئی سکول نہیں؟ پھر وہ جیسے کچھ سمجھ کر بولی۔“ منانے
کے لیے پانی گرم کر دوں۔“
”نہیں میں نیچے کھڑ پر نہاؤں گا۔“

”بابو اور دیر بھی وہیں نہاتے ہیں۔“ وہ بولی۔ ”لیکن دُور ہے۔ وہاں۔“
اس نے نیچے اشارہ کیا اور دُور وہاں، ”اگر قدرے لمبا کر دیا۔“ درختوں کے پیچھے۔
”میں بھی وہیں جلد ہی ہوں، کپڑے دھونے۔“
”بڑا کام کرتی ہو تم۔“
”تم نہیں کرتے۔؟“

”میں بھی چلتا ہوں، سلائی لے آؤں۔“
وہ نہانے کا سامان تھیلے میں ڈال کر باہر آ گیا۔ لا جوتے گا میں اور بکریاں باہر
نکال دی تھیں اور اب وہ نیچے جانے کے لیے تیار تھیں۔ اسے دیکھ کر لا جوتہ اندر
گئی اور میسے کپڑوں کی گھڑی سر پر اٹھائے آ گئی۔
”چلو۔“ اس نے جانور نیچے جانے والی گھڑی پر ہانک دیئے۔
”میں خود اترنے لگی۔“

”سلا نہیں لگاؤ گی۔؟“

”یہاں چوری نہیں ہوتی۔ دیوتا سب کی اقامیں رہتا ہے۔“
”اگل کو نہ جاتے کیوں مجرم کا سا احساس ہوا۔ رات وہ بستر پر لیٹا دیر تک

اس کوٹنے کی طرف دیکھتا رہا۔ جہاں لاجو فرش پر سو رہی تھی۔ لائیں کی ہلکی سی روشنی میں لاجو کا چہرہ غینہ میں اور بھی خوبصورت ہو گیا تھا۔ اقل کو اپنے اندر کسی بھوکے بھڑیٹے کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ دیوار کی طرف منہ کر کے سونے کی کوشش میں دیر تک جاگتا رہا تھا۔ لائیں بچھانے کے بعد دیر تک اس بھڑیٹے سے اندھے میں روتا رہا تھا۔

”اے اقل کہاں ہو؟“

وہ چہنکا۔ نیلی پنگ پر ٹھکی مسکرا رہی تھی۔

”بھئی کہاں آدمی ہو۔ جھٹ کھو جاتے ہو۔ میں شہد کے ٹاپ SHAKER

کے ساتھ غلہ پر تھی۔ تم نے دیکھا؟ وہ بے حد ENCOURAGING ہے۔“

”ہاں۔“

”ANIL! DONT YOU FEEL JEALOUS?“

”بالکل نہیں۔“

”BUT YOU SHOULD“ وہ کھل کر سنسی، پھر بولی۔ ایک دھڑک کے بعد ہم

چلیں گے۔ ”YOU WONT MIND!“

اقل نے مگر ٹ مسکایا اور سوچا۔ نیلی مردے سب کچھ چاہتی ہے۔ اس کی تمام تر توجہ امید بے میں وہ اسے کچھ بھی نہیں دے سکتی۔ وہ ایک لمحہ بھی نہیں جس میں وہ یہ محسوس کر سکے کہ اُسے نیلی یہ لڑکی مکمل طور پر مل گئی ہے۔ نیلی محدود جنگ خود غرض ہے۔ اور لاجو ہی لڑکیوں میں سے ہے جو قربانی کو عین عبادت سمجھتی ہیں جو اپنا سب کچھ اپنی کوئی دینے میں فخر محسوس کرتی ہیں۔ اس میں اپنی جیت سمجھتی ہیں

ادھر بے میں کچھ نہیں چاہتیں، کچھ نہیں مانگتیں۔ ادھر دونوں ہی لڑکیاں ہیں اس دھرتی کی عورتیں۔

نئی اس نوجوانی کی بانہوں میں بھول رہی تھی اور وہ لاجو کو سامنے لیے بیٹھا تھا۔ لاجو جو بڑی سادگی اور معصومیت سے سنس رہی تھی اور اپنی کالی بکری کے بارے میں بتا رہی تھی۔ وہ ان دونوں کی بات کر رہی تھی جب بادل کئی دن مسلسل برستے رہے تھے۔ دیکھنا ان سے ناراض ہو گیا تھا۔ ان سے نہیں گاؤں کی ایک کنواری سے جو ایک ڈرائیو کے ساتھ گاؤں سے چلی گئی تھی اور اس کا منگیتر سامنے والے پہاڑ پر دیتا کے پاس شکایت لے کر گیا تھا وہ تو واپس نہیں آیا بلکہ گاؤں میں مل بھٹل ہو گیا تھا۔

لاجو گایوں، بکریوں کو راستے پر رہنے کی تلقین کرتی چل رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ اعلیٰ سے باتیں کیے جا رہی تھی۔ وہ اعلیٰ کو بتا رہی تھی کہ براس کے پھولوں کی چٹنی بہت لذیذ ہوتی ہے اور کمات کے کھانے پر وہ اس کے لیے یہ چٹنی تیار کرے گی۔ پھر اس نے اسے بتایا کہ کس طرح پچھلے سال بکری کا بچہ مرنے پر وہ کئی دن تک اداس رہی تھی۔

اس طرح ادھر ادھر کی باتیں کرتے وہ کھڑ پر پہنچ گئے۔ تازہ شفاف پانی پتھروں میں بہہ رہا تھا اور صبح کی جگہ ملکی دھوپ میں پتھر بیروں کی طرح ٹپک رہے تھے۔ آجہ نے کپڑوں کی گھٹڑی ایک طرف رکھ دی اور ایک چوڑے سے پتھر پر چڑھ کر کھڑی ہو گئی۔ اعلیٰ نے جو تے اتار دیے اور نکلے پاؤں پتھروں پر چپا ایسی جگہ تلاش کرنے لگا جہاں وہ اطمینان سے نہا سکے۔

”باپو جی آگے نہ جانا، دھار اتیر رہے۔“

وہ اتلی نے پلٹ کر لاجو کی طرف دیکھا۔ وہ اس بڑے اونچے پتھر پر کھڑی کوئی آسمانی چیز معلوم ہو رہی تھی۔ بکریاں اور گائیں اذھرا و صرٹھ صرٹھ صرٹھ پر چڑھ گئی تھیں۔ دونوں طرف پہاڑیاں تھیں اور اوپر نیلا وسیع آسمان اور خاموشی۔

”لاجو۔ تم رعد یہاں اکیلی آتی ہو۔؟“

”یہ سب جو میرے ساتھ ہوتی ہیں۔“ اس نے گائیں بکریوں کی طرف

اشارہ کیا۔

”ڈر نہیں لگتا۔“

وہ ہنس دی۔

”تم ڈرتے ہو۔؟“

وہ بھی مسکرا دیا اور زما غامضے پر ایک بڑے سے پتھر کی آڑ میں چلا گیا۔

اب وہ نہانے کے لیے تیار تھا۔ اپنے کپڑے ایک طرف رکھ کر وہ پانی میں

اتر گیا۔ لاجو اب کپڑے دھونے لگی تھی۔ وہ پانی میں چلتا ہوا لاجو کے قریب

پہنچ گیا۔ اور پانی میں میٹھ کر اسے شرموں کے بارے میں بتانے لگا۔ لاجو

کو معلوم نہیں تھا کہ شر کیسے ہوتے ہیں، وہاں کیا ہوتا ہے۔ وہاں کے آدمی

کیسے ہوتے ہیں۔ نہ اسے دیت نام کے بارے میں کچھ پتہ تھا اور نہ وہ یہ

جانتی تھی کہ کلکتہ اور چند ہی گڑھ میں کیا ہوا ہے۔ وہ بہت سکھتی تھی۔

پھر نیلی آگئی اور نگرشی کے فرش پر لوہے کے پتھروں کی آواز اور ہال کا

شور اور غلغلہ ریکارڈ۔ وہ مدافوں باہر آگئے۔ رشک پر اخبار بیچنے والے پکار

پکار کر مدد اس سرکار کے نئے حکم کا اعلان کر رہے تھے۔ وہاں ہندی بالکل ختم کر دی گئی تھی۔ گاڈیوں کو آگ لگا دی گئی تھی اور بجلی میں شو سینا جرابی کھردلائی پر اتر آئی تھی اور نیلی اسے SKATING کے مقابلوں کے بارے میں بتا رہی تھی اور ان انعامات کا ذکر کر رہی تھی جو اس نے حاصل کیے تھے اور ان غلی ایکسٹرنل کے بارے میں بتا رہی تھی جن کے ساتھ اس نے شملہ میں نوٹر کھنچوائے تھے۔ پھر وہ اچانک خاموش ہو گئی۔

”اُنی تم لاجو کے بارے میں بتا رہے تھے“

”وہ بے مد معصوم تھی۔“

”پھر اس کا لہجہ تسخیرانہ تھا۔“

اتنی خاموش رہا۔ وہ ایک دیران راستے پر نیچے اتر رہے تھے اور ان کے دونوں طرف گھٹا جھلکنا جرات کی طرح گہرا اور خاموش تھا۔ وہ اسے بتانے لگا کہ کیسے جنرل الیکشن کے دوران اپنی پارٹی کی طرف سے کام کرنے کنڈا گھاٹ گیا تھا اور وہاں اس کی ملاقات لاجو کے باپ سے ہوئی تھی۔ وہ اتنی کو اپنے گاؤں لے گیا پھر اس نے نیلی کو لاجو کے باپ بھائیوں، ماں اور گائین، بکریوں کے بارے میں بتایا اور اس دیرتا کے بارے میں بھی جو گاؤں کی کنواریں اور کھیتوں کی رکشا کرتا تھا۔

”مجھے لاجو، ایک جھڑا، سیب کا ایک بیڑ لگی تھی۔“ اتنی نے دذخوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس سے باتیں کر کے اس کے پاس بیٹھ کر مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں کسی مندر میں آ بیٹھا ہوں۔“

”تم آرٹسٹوں سے خدا بچائے۔“ وہ ہنس کر بولی۔ ”عورت تمہیں محبت
ہی نہیں، اور سب کچھ معلوم ہوتی ہے۔“
”وہ ایسی لڑکی نہیں تھی۔“ اس نے خلوص سے کہا۔

”میں ایسی ویسی کی بات نہیں کر رہی لڑکی تھی کہ نہیں۔“ وہ مسکرائی۔ اس کی
آنکھیں چمکیں۔ ”خیر تم اس کے ساتھ سیر کرنے گئے۔“

اس نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ سامنے دیکھ رہی تھی۔

”لاجو تنہا ہی ہر بات پر کھلکھلا کر ہنستی تھی، ہنسنا۔“ وہ نیکی نے کہا۔ ”تم
نے اس کی تصویریں لیں اسے پہاڑیوں پر چڑھنے اترنے میں مدد دیتے ہوئے
اس کا ہاتھ تقام لیا۔ اس کے جوڑے میں پھول لگائے۔ اسے سینا، نمائش اور
ہوٹلوں کے بارے میں بتایا۔“ وہ ہنسی۔ ”دیکھو میں نے تمہیں دیکھا نہیں پھر بھی
میں سب جانتی ہوں۔ میں کنیوں سے یہ کہانیاں سن چکی ہوں۔“

”میں نے کہا نا وہ بہت بھولی بھالی اور مہذب سی لڑکی تھی۔“

”وہ دیکھو گرگٹ۔“ وہ ایک پتھر کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ”گرگٹ

کوئی رنگ بدلتا ہے۔“

اب وہ اس جگہ پہنچ گئے تھے جہاں پانی کوئی شاخوں میں بٹ کر بہ رہا تھا اور
آس پاس اونچے، گھنے درخت تھے جہاں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ خلی جیسے اس
مقام کے چتے چتے سے واقف تھی۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک درختوں کے
جھنڈ میں لے گئی، وہاں خالی اور ٹوٹی ہوئی بوتلیں پڑی تھیں۔ اخبار کے کاغذ
اور لفافے بکھرے تھے اور قریب پانی لگنا تا بہر رہا تھا۔

وہ بیٹھ گئے۔ اعلیٰ نے جیکٹ اتار دی اور سگریٹ سلا کر لیٹ گیا۔ نیکی
وہاں سے آسمان نظر نہیں آ رہا تھا اسے ایسا محسوس ہوا جیسے قید کر دیا گیا ہو۔
= یہاں تو گھٹن کا سا احساس ہوتا ہے =

نیل نے اس کی طرف دیکھا اور اس کے پہلو میں لیٹ گئی۔ اعلیٰ نے کنکلیوں
سے اس کی طرف دیکھ کر اسے لگانیل کا لباس چڑھا کر پھٹ جائے گا۔ وہ
اٹھنے لگا تو نیل نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔
= لا جو خوبصورت تھی۔ =

وہ چپ رہا۔

”تم سناتے رہے اور وہ کپڑے دھو رہی ہے۔“
”ہوں۔“

”پھر تم اس کے قریب جا بیٹھے۔“

”ہاں؟“ وہ آنکھیں موندے تھا اور نیل اس کی چھائی کو ہولے ہولے
سلا رہی تھی اور اس نے اپنا سر اعلیٰ کے شانے پر رکھ دیا تھا۔
”اور تم باتیں کرتے رہے۔“

”ہاں۔“

”بس۔!“

وہ چونکا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور نیل کی طرف دیکھا۔ نیل کی
آنکھیں سکرا رہی تھیں۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔
”تمہیں یقینی نہیں آ رہا۔“

”تم آخری بات چھپا رہے ہو۔“ وہ لیٹے لیٹے بولی۔ ”میں نے بہت سی
 تاویلیں پڑھی ہیں، غلیں دکھائی ہیں۔ تم جو چھپا رہے ہو۔ میں پہلے سے جانتی ہوں۔“
 وہ ہنس دی۔ ”لیکن تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ میں انی لڑکیوں میں سے نہیں
 ہوں جو اس بات سے منہ پھلا لیتی ہیں، میں جانتی ہوں مرد۔“
 وہ کھڑا ہو گیا۔

پھر وہ جلدی سے ٹھنڈ میں سے باہر نکل آیا۔ اس نے اوپر دیکھا۔ آسمان اب بھی
 دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اوپر جانے والے راستے پر ہولیا۔
 (”أدماق“ لاہور)

سیفو ۱۹۶۸

میرا شہناز سے تعارف ہوا تو میں اسے دیکھتے ہی دل بند دسے بیٹھا اس کی سیدھی سی وجہ یہ تھی کہ اس میں دل لے لینے والی کوئی آنکھیں انداز تھی۔ لیکن رنگ کا تو میں بھی قدر دہی ہوں مگر کالے رنگ کا نہیں۔ بحیثیت ایک دہی خواہ اس کی سب سے بڑی خصوصیت بڑی بڑی اور موٹی موٹی آنکھیں یا پرکشش لب نہ تھے بلکہ ذہانت تھی یقیناً وہ بلا کی ذہین تھی۔ ذہین کیا میں تو اسے غیر مشروط طور پر انشیکپورل بھی ماننے کو تیار ہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ لڑکی کی... ذہانت کے بارے میں میری کوئی ایسی اچھی رائے نہیں ہے۔ میں تو انہیں جذبات کی پٹ سمجھتا ہوں اور اسی لیے ان سے صرف جذباتی تسکین ہی کا کام لیا جاسکتا ہے۔ لیکن مجھے تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ شہناز ذہانت میں بٹسے سے بٹسے مرد کا مقابلہ کر سکتی تھی لیکن تھی عموماً فات اس لیے نری عموماً ہی ثابت ہوئی اور جذبت کے معاملہ میں اندھی ہو گئی انشیکپورل ہونے کے باوجود وہ میرے آپد نہ دیکھ سکی اور نفسیات کی طالبہ ہونے کے باوجود وہ میرے ”کردار کی محرکات“ کا تجزیہ نہ کر سکی۔

پہلی ملاقات میں اس نے مجھے گھٹکے کے تین انداز، نفسیاتی طرز استدلال، پوچھل اصطلاحات اور غیر مانوس ناموں سے خوب ہی مرعوب کیا۔ خیر وہ مجھے کیا مرعوب کرتی میں تو خود ہی مرعوب ہونے پر تکا بیٹھا تھا۔ وہ اس لیے کہ میں اس کی سیلی گشتی سے

تعارف کے لیے اسے وسیلہ بنانا چاہتا تھا۔ آج وہ اتفاق سے اس کے ساتھ نہ تھی
ورنہ وہ دونوں تو ہمیشہ ساتھ ساتھ پائی جاتی تھیں بلکہ اس حد تک ساتھ ساتھ پائی جاتی
تھیں کہ ان کی جڑی خصوصی شرت حاصل کر چکی تھی۔

دوسری ملاقات لائبریری میں ہوئی۔ وہ کتابیں واپس کرنے آئی تھی لیکن چند
دنوں کی تاخیر کی وجہ سے جرمانہ ادا نہ کرنے کے لیے وہ کاؤنٹر کلرک سے مدد
بحث کر رہی تھی۔ مگر کیرا واقف تھا چنانچہ میں نے جرمانہ معاف کر دیا اس نے
چار اور سوٹی سوٹی کتابیں لیں اور میرے ساتھ ہی باہر آگئی۔ ہم خاموشی سے چلتے
رہے وہ پتہ نہیں کیا سوچ۔ ہی ہوگی اور عینک کی موجودگی میں آنکھوں کی عبادت
کا پڑھنا بہت مشکل ہوتا ہے باقی میری دلچسپیاں اور گفتگو کے محو غیر نصیبی ہو گئیں
مجھے مثلاً میں ہالی وڈ کے تازہ ترین اسکیٹڈ لڑیا مشہور ایکٹریسوں کے حیاتی اعداد
پر خوب دماغی سے برل سکتا ہوں۔ لیکن بغل میں چار سوٹی سوٹی کتابیں دبائے مانی
لڑکی سے ان سوٹی سوٹی کتابوں ایسی سوٹی سوٹی باتیں کرتا آسان کام نہیں۔

میں گیٹ پر ہم رک گئے۔ ”اب کہہ صرا“

”میں تو ہم ہوں“ وہ لاپرواہی سے یولی۔

”تو چلے پی جائے؟“

”NO HARM!“

میں نے اخلاقیات کا ”لائیے اکتا ہیں میں اٹھانے“

”نہیں نہیں!“ IT IS ALL RIGHT

میں اسے ایک اچھے دستور دانی میں لے آیا۔ اس نے بڑی لاپرواہی سے بیٹھ کر

لوگوں پر طائرانہ نگاہ ڈالی اور بغل میں چادر کوں کتے ہیں دباٹے اور دوسرے بازو میں
پرس دکھائے پہن گئی۔

”چائے یا کافی؟“ ویٹر کے آنے پر میں نے پوچھا۔

”COFFEE“

اب تک میں موضوع تلاش کر چکا تھا چنانچہ میں نے نفسیات کے بارے میں
ایک سوال کر دیا۔ اور وہ شروع ہو گئی۔

اس نے کافی کے تین کپ پئے اور وہ بھی مددگار یا کریم کے بغیر
ہم باہر نکلے تو مجھے احساس ہوا کہ میری بجائے وہ مجھ سے مرعوب ہو چکی ہے
کمال ہے! میں نے نہ تو اس کے حسن کی تعریف کی (حسن تعریف نہیں) نہ فطرت
کی کوشش (بہت ہی نہ پڑی) اور نہ اسے پسپا ہی کیا (ذہنی طور کی خوشامد طیراصی
کیر ہے) شاید وہ اس لیے ”میری“ ذہانت سے مرعوب ہو گئی ہو کہ میں نے اسے
جی بھر کر بولنے کا موقع دیا اور خود کبھی تالافت شاگرد کی طرح، حیرت سے منہ کھولنے
استانی جی کے ہلتے لبوں کو، جن پر باتوں کی لکیر ضرورت سے زیادہ ہی گہری تھی مسلسل
سمت رہا تھا یقیناً اسے میری یہی ادا بھا گئی۔

”پھر کپ ملیں گی۔“ میں نے بس اسٹاپ پر پوچھا۔

اس نے جے جے کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں واقعی ذہانت کا حسن تھا جس
نے اہل پکھتی نظروں کے سامنے پناہ سکھاتے محسوس کیا۔ میں نے فراموش کیا۔

”آج کی گفتگو بہت دلچسپ۔ اے۔۔ اور INSTRUCTIVE رہی۔ اس نے
کچھ کہنے کو منہ کھولا مگر میں نے اسے جھٹک دیا۔“ میں نے بھی اس مسئلہ پر اور

مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔ اسی لیے۔ اسی۔“

اس نے ہنس کر بات کاٹی۔ ”آپ کو پتہ ہے اگر گلشن آج ساتھ جوتی
قزاقی بات بھی نہ ہو سکتی“ (آہ! ذکر اس پر دل و دل کا!)
”کیوں؟“ میں خوش ہوا کہ خود ہی گلشن کا ذکر آگیا۔

”بہت بور ہے۔ اُن سوئل!“

”Why“ اس لفظ کے ساتھ میرا تمام چہرہ سوالیہ خضوع کا نشان بن گیا۔

”اب دیکھیے نا۔“ اس نے بولنے کو منہ کھولا مگر اس کی نگاہیں مجھ سے

ہٹ کر سرک پر جا پہنچی تھیں۔ ”My Bus!“

”بس؟“ میں نے مزہ کر دیکھا۔ ”کہاں؟“

”وہ دیکھیں تو ۱۲ نمبر آ رہی ہے۔“

”کہاں؟“ بس نظر تو آ رہی تھی مگر میں ہی اندھا بن رہا تھا۔

”یہ دیکھیں تو۔“

”یہ۔ یہ تو ۱۳ نمبر ہے۔“ میں نے جھوٹ بولا۔

”تیرہ؟“

”ہاں! ہاں!! - Boy God“

”اس نے پہلی مرتبہ مجھے اور طرح کی نگاہوں سے دیکھا۔ میں نے الجھ کر

نظریں جھکا لیں۔ اس نے بس اسٹاپ کی طرف سے پیٹھ موڑ لی۔“ اچھا تو پھر

۱۳ نمبر ہی ہوگی۔“

میں مطمئن تھا! مسرور تھا!! شاداب تھا!!

”WHAT ARE YOU DOING“ جب میں نے اسے بازوؤں میں لیا تو وہ گھبرا کر بولی

” - YOU DOING“

= ”کچھ نہیں!“ میں نے چہرے پر ہنسی کی تمام معصومیت لاکر کہا۔

= ”ہائے!“ وہ جھرجھری لے کر بولی۔ ”کوئی آجائے گا۔“ you

” - SILLY BOY“

= ”تم نے خود ہی تو بتایا تھا کہ سب گھروا لے جا رہی ہیں“

اس کی پھولی سانسوں میں سے الفاظ جیسے لڑکے۔

”BUT THAT DOESN'T MEAN THAT YOU SHOULD START

THAT“

لیکن میں سمجھتا تھا کہ یہ وہ اخلاقیات کہہ رہی ہے۔

وہ کہہ رہی تھیں۔ باہر وہ کھڑا تھا۔

= ”وہ تمہیں خراب کر رہا ہے“ گلشن کہہ رہی تھی۔

” SO WHAT “

کمرے میں خاموشی ہو گئی (وہ دونوں بچیوں کی طرح ایک دوسری کو آنکھیں

نکلانے لگی ہوئی ہیں)۔ شہناز کی آنکھیں غصے کی وجہ سے بینک کے اندر

اند بھی سکوڑی سکوڑی ہوں گی اور غالباً گلشن کی ننھی سی تنک سی ہنسی ہو گی)

کمرے میں سسکی!

کہن رویا؟

”اب رونے کا کیا فائدہ؟“ شہناز کہہ رہی تھی۔

گلشن نے جواب نہ دیا۔ شہناز بھی خاموش ہے (دو دو گلشن کو دیکھ کر شہناز کی بے زاری محسوس کی جاسکتی تھی)

”شہناز!“ بالآخر گلشن بولی۔ ”تمہیں یاد ہے ہماری دوستی کتنی پرانی

ہے“

”ہاں“ (شہناز نے یقیناً گال پھلا کر کہا ہو گا)

”کتنی؟“

”کئی سال“ وہ اٹک کر بولی ”بھئی اب میں کلینڈر لے کر تو بیٹھی نہیں“

”میں تمہیں بتاتی ہوں“ گلشن کے لہجے میں ماضی کے تذکرے سے کھٹک

پیدا ہو رہی تھی۔

”ہم فرسٹ ایر سے اکٹھی رہی ہیں“

”ہاں۔ ہم فرسٹ ایر سے اکٹھی رہی ہیں“ (وہ گویا سبق دہرا رہی تھی)

”اور لڑکیاں ہماری دوستی سے جلتی تھیں“

”ہاں! لڑکیاں ہماری دوستی سے جلتی تھیں“ (الفاظ گریا ٹیپ ریکارڈز

پر دہرائے جا رہے تھے)

”پروفیسر ہماری دوستی کی مثال دیتی تھیں“

”ہاں! پروفیسر ہماری دوستی کی مثال دیتی تھیں“ (باز گشت! باز گشت!)

”اور۔ اور ہم۔ ہم کتنا پیار کرتے تھے۔ ایک دوسرے سے“ (انبساط!)

(انبساط!)

.....

”بولو شنناز! جان بولو“ (کیا وہ اس کی ٹھوڑی پکڑ رہی ہے؟) ”بولو۔“

..... ”(کیا شنناز سر جھکائے بیٹھی ہے؟)

”کتنی لڑکیوں نے ہماری دوستی خراب کرنے کی کوشش کی تھی؟ (خیر انخر!!)

..... ”(کیا شنناز اسے دیکھ رہی ہے؟ مگر کن نظروں سے؟)

..... ”(وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہی ہیں کیا؟)

..... ”(مگر میں کیا ہو رہا ہے)

کیا ہو رہا ہے۔ مگر میں؟؟

ہو رہا ہے کیا۔ مگر میں؟؟؟

— اور باہر وہ اندھ لگے پردہ کی طرح ساکت تھا!

”مجھے چھوڑ دو؟“ شنناز کی گھٹی گھٹی آواز ابھری۔

”اوہ!“ (دھچکے سے گرنے کی گواہ؟ یا دل سے نکل آہ؟)

(سانسیں! سانسیں!!)

سانسیں —؟؟؟

گلکش غصے سے بولی ”اُس نے تمہارے دل میں نفرت بھردی۔“

”نہیں! نہیں!!“

”پھر۔؟ پھر۔؟ یہ سب کیا ہے؟“

”دیکھو گلکش!“ وہ ایسے بولی گویا کسی بچے کو چپکار رہی ہو ”تم نے کبھی سوچا

کہ تم کس راستے پر جا رہی ہو؟“

”نہیں! اور نہ میں سوچنا چاہتی ہوں۔ میں تو تبیں چاہتی ہوں؟“

“OH! DON'T BE ABSURD”

(خاموشی! خاموشی!!)

”تم عورت ہو۔“

”پھر؟“

”اب۔ اب میں کیسے تمہیں سمجھاؤں۔ ان گلشن “WHY DON'T YOU

TRY TO UNDERSTAND

”میں کچھ نہیں سمجھنا چاہتی۔“ وہ بچ کر بولی۔ ”میں تو یہ جانتی ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرتی تھیں۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔“

”ہاں!“ شہناز کے لہجے میں گویا سیدہ ملا تھا۔ ”ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔“

”اور۔ اور اب ہماری چھ سال کی محبت کو ایک مرد نے۔ ایک ذلیل گتے نے ختم کر دیا۔“ (اس نے خود کو قصائی کی دوکان پر لٹکی رانوں کی طرف گریز نہ کیا بلکہ سے دیکھتے محسوس کیا)

“DONT ABUSE” وہ پھر کر بولی۔

وہ بھی جواب میں پھری ”DONT ABUSE“ میں تو اسے جان سے مار دوں گا۔ (اس نے مردہ خانے میں زہر سے اپنی نیلی لاش اور خنجر میں دوکامی خنجر دیکھی)

”دیکھو گلش!“ شہناز نے پھر کسی ٹھنڈے مزاج والی استانی کے بچے میں کہا۔ ”میں اب بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔ میرے جذبات تبدیل نہیں ہوئے۔“

”تو پھر۔؟ تو پھر۔؟“

”بات نہ کاٹو۔“ وہ چڑکربولی۔ ”تم بہت جذباتی ہو۔ مگر میں نے اس معاملے پر بہت غور کیا ہے۔ تمہاری امد میری محبت کا کیا انجام ہو سکتا ہے آخر یہ راستہ ہمیں کہاں لے جائے گا۔“

”.....“ (گلش سوچا مری ہے یا رو مری ہے؟)

”تم نے یہ سب کچھ سوچا بھی۔؟“

”تم جانتی ہو مجھے مردوں سے نفرت ہے، میں جب اس لحاظ سے اپنا اور مرد کا تصور کرتی ہوں تو مجھے گھس آتی ہے۔ مثلی ہوتی ہے۔“

شہناز بولی۔ ”ہمارا یہ یونیورسٹی میں آخری سال ہے۔ اس کے بعد تم کیا کرو گی۔ کسی نہ کسی کے چنے تو بند ہو گی۔“

”میں شادی نہ کروں گی۔“ وہ چیخ کر بولی۔ ”ہرگز نہیں“ وہ ٹٹھکیاں

بھینچے جوش میں کھڑی ہو گئی

”پگل! شادی نہ کرو گی تو کیا کرو گی۔“

”تم سے محبت!“

”DON'T BE SILLY“

”میں تو صرف یہ جانتی ہوں کہ اس نے تمہارا دل میری طرف سے پھیر دیا ہے۔“

WRONG " وہ تو تمہاری بہت تعریف کرتا ہے۔ "

" ہاں! " وہ حقارت سے بولی " میری تعریف — تم تو گدھی جیڑو تو
مجھ میں دلچسپی لیتا ہے " (اس کا سانس رکا ہے) کان کھڑے ہیں۔
" WHAT " (ذرائع اب تک رکا ہے)۔

" میں آج اسے لفٹ میں تو وہ تئیں چھوڑ دے۔ "

" تم حسب معمول جل رہی ہو " (جی رکھ! شیر دی بچی!!)

" نہیں میں جل نہیں رہی — لیکن میں نگاہیں تو پہچان سکتی ہوں۔ "

" تم نے اس کی آنکھوں میں کیا دیکھا؟ "

" بھوک — " (زادہ اکتا!!)

" WRONG "

" میں اسے سمجھتی ہوں۔ "

" سمجھتی ہو۔ "

" اندھی ہو۔ "

" میں نے تو سوچا تھا کہ ہم تمام عمر اسی طرح رہیں گے تم مجھے پیار کرتی رہو گی
تم مجھے۔۔۔ "

" BUT HOW ? " ہم سوسائٹی میں رہتے ہیں، ہمارے گھروں نے زندہ ہیں۔ "

" میں کچھ نہیں سمجھتی چاہتی۔ میں تو صرف یہ جانتی ہوں کہ اس نے تمہیں انہماک

دیا ہے۔ "

" ہنسہ! " (وہ شہناز کے لبوں کے کونوں کو تھامت سے اپراٹھتے دیکھ سکتا تھا)

”میں خود کسی میں دلچسپی نہ لوں لیکن دوسرے مجھ میں دلچسپی لیتے رہے ہیں۔“

”کیا بے تنگی ہانگ رہی ہو۔“

”تمہیں یاد ہے نارہ پر دھیسرا“

”THAT SILLY BRUTE“

”ہاں۔ کیسے کہتے ہیں یے میرے پچھے پچھے پھرتا تھا۔“

”مگر تم کہنا کیا چاہتی ہو۔“

”میں تم سے زیادہ خوبصورت ہوں۔“

”SO?“

”تم سے زیادہ سیکسی بھی ہوں۔“

”SO WHAT“

”میں تمہیں پکاوں گی۔ ہر قیمت پر۔“

دو دن بعد گلشن مجھے ملے تو بولی ”آپ کہاں رہے اتنے دن۔؟“ میں خاموش

اسے دیکھتا رہا۔۔۔

”چلیے پائے پہنے چلیں!“ وہ مجھ سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔

(”سیپ“ کراچی)

رحم مادر سے نکلنا تھا عبت

اب یہ اس کی بدداشت سے باہر تھا کہ وہ مزید نصف لمحہ بھی اندر وہاں ٹھہرتا اور نہ
 کی کیلیں جڑے نوکیلے مانتوں والی اس عصمت کی لٹائی بھٹیاریوں کے سے الفاظ، سر جھٹکے
 جیسے دم کوٹا لگوں میں دبائے۔ ایک کونے میں کھڑا، ہنستا ہی چلا جاتا۔ وہ اس
 کا دفاع دیکھتا نہیں تھا۔ تب پھر ایک جھٹکے کے ساتھ اس نے سر اٹھایا اور اپنی فائیلیں
 گریڈ پر سے فرج کراٹھائیں، فلاسک کو بغل میں دبا دیا اور بے حد جھپٹے پھوں کے سے انداز
 میں اپنے پاؤں نمودرند سے زمین پر سے دسے ملتا ایک زناٹے میں مکر سے سے باہر
 نکل گیا۔ لوہے کے بڑے پھانگ سے تیزی کے ساتھ نکلتے ہوئے اسے ٹھوکر لگی اور فلاسک
 بغل میں سے نکل کر پکائی اینٹوں کی سڑک پر جا گئی۔ ایک دھماکے کے ساتھ اس کے ٹھوکر دود
 گر سے اندر کچیلوں کی سکنجبین کا سڑک پر چھڑکا دیا ہو گیا۔ ایک لمبے کو دھجھک کر کھڑا ہوا۔
 پھر اپنے فرجیوں کے سے مضبوط جوتوں کی نوک سے فلاسک کو ٹھوکر د کر نالی میں پھینک
 کر، سر کو دونوں کندھوں پر بے حدا دھچکا اٹھائے، ناک کی سیدھ میں دیکھتا نیز تیز چلتا وہ
 ٹھل میں سے نکل گیا تب ہی وہ تیز زادی بھی جو پاؤں نیچے اس کے پیچھے جا گئی تو ہے کے
 گیٹ سے باہر نکل آئی تھی، تنہا سڑک کو دیکھ کر ٹک گئی۔ ٹھل کے آخری سرے پر کانٹوں بھری
 دھوپ میں لہڑتا اس کا سایہ علی بھر کوا سے نظر گر غائب ہو گیا۔ لال بھجیو کا رنگ لیجے

لڑتے ہرنٹوں کو داغوں سے کاٹتے، اس نے گیلی سڑک پر پھیل کر چریں امدادی میں پڑی فلاسک کو
 نظر سے کر دیکھا، پھر آہستہ سے سڑک والی ساندھی گئی پھاٹک سے اندر داخل ہوتے ہوئے جاتے
 کے لیے اس کا دھڑ پھاٹک سے ابھرے ہوئے کیل میں پھنس گیا۔ جھٹکے کو محسوس کر کے وہ یکدم
 دو قدم پیچھے ہٹ آئی رنگ روڑ پر اس سے وہاں تک دو ہاتھ پھٹ چکا تھا۔ ایک جھٹکا دے
 کر اس نے دوپٹے کھینچا اور اس کے چل پھٹا اور اوپر زمین پر گھسٹا اس کے پیچھے پیچھے تھا۔
 ”اچھی سادش تھی۔“ اپنی چیزیں میٹھے ہوئے سیدھے ذیاد آفتاب بڑی بچان سے سکوائے۔
 وہیں لاپرواہی سے کہ جسے اس نے یہ بات کرے میں میٹھی سلمہ، بالبعد آمد خیر سے نہ کہی
 ہو خود کو کوئی بہت ہی پُر لطف واقعہ یاد دلایا ہو۔ آج ہر حال آخری دن ہی تھا مگر تم
 سبوں نے بل کر اسے نامی آخری ہی بنا ڈالا۔ برقعے کے ٹپ لگتے لگتے وہ ان جنور کی
 طرف دیکھ کر پھر سکوائے ”چھوٹے چھوٹے پیارے اور چھوٹے چھوٹے معصوم خوشیاں، مگر ہر سر شخص
 مداندان کی سختی میں خوشیوں پر یکدم بنا میٹھا ہے۔ اس نے جب کہ برقعے کا سب سے بچھا
 ٹپ بند کیا، پلنگ پر وہ تینوں کی تینوں گھسٹند کے گرد ہاتھ پیٹے، ایک ہی انداز میں گھسٹند پر
 ٹھوڑیاں جبکہ تصویر بینی میٹھی تھیں۔ ”تعلق می، صوفہ تفریق تھی جو اپنے ہنسی سے پھر دکتے
 ہرنٹوں کو داغوں میں دبائے، بڑے مسخرانہ انداز سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اگر میری گرد
 پر پید کرتے ہوئے اسے آج تہدی ماں نے دیکھ لیا ہے تو اس میں اس قدر کا چڑھائیوں والا رویہ
 دکھانے کا کیا جواز تھا مگر مجھے کیا پتا ہے؟ یہ تو اپنے اپنے اعتماد کی بات ہے۔ اگر کسی
 کس کو کتنا پیار ہوتا ہے۔ اسے کس نگ میں پہننا ہے۔“ وہ دم بھر کوڑکی لہر سلوٹھا کرائی تینوں کی
 طرف دیکھا۔ ”مگر میں جیڑاں ہوں کہ بندہ تہدی کی خبروں سے اس دن تہدی مل گئیں جاسکی
 نہیں کہہ ہی تھی۔ جس دن تم نے اس کی ٹائلیوں میں خط لکھا تھا یا جس دن تم نے بیز کے نیچے

اس کے پاؤں پر اپنا پاؤں مکھڑ دیا تھا یا جس دن تم نے اس کو اس کے شانے پر کاٹا تھا۔ یا۔“
 ”پناہ بخدا۔“ سکر نے بے حد خوفزدہ ہو کر زیر لب کہا اور گھٹنوں کو اوپر سے اپنے سینے سے
 پیسجھ لیا پھر اس نے نقاب برابر کیے۔ ”اچھا دوستو خدا حافظ۔“ اس نے بڑی خوش دلی سے
 سب کو مخاطب کیا اور بڑے اہتمام کے ساتھ قدم اٹھاتا کرے سے نکل گئی اس کے نکلنے ہی
 تصویر نے اس قہقہے کو جس کو وہ بڑی دیر سے اپنے گلے میں پال رہی تھی اُٹھل دیا۔ بلند اور تیز
 اور طویل! وہ بے کے بڑے پھیلاکت تک اس قہقہے نے اس کا تعاقب کیا، مگر وہ ویسے خوباب لوڈ
 دھیسے دھیسے قدموں سے چلتی دم دم مسکراہٹ لبوں پر لیے، لہو لہر کو بھیڑ کے رنگ
 کر پیچھے دیکھے بغیر چپ چاپ، اٹھل میں نکل آئی۔

تب ہی وہ بھی خوفزدہ اور غصیلے بچوں کی طرح زمین پر پیرا رہا، اس کمرے میں سے نکلا تھا
 اور آگیا انٹوں کی بو ہی گل پاد کرنے وقت اور غاصلے کا خیل کیے بغیر سراونجا اٹھائے، نیک کی سرچ
 میں دیکھا، آخر کو گھر جا پہنچا آخر اگست کی دم گھونٹنے والی دوپہر اور صلا گھر بند دروازوں کے
 پیچھے سیما ہوا جی ایک دم اٹک سے رہ گیا ایسا سا ناا! ایسی خاموشی!! اباد میں تنہا؟؟؟؟ اور
 تنہا؟؟؟؟ خوفزدہ تنہائی ادا کیلے ہی اور اس کیلے ہی میں اپنی ذات اپنے وجود کی طرف سے
 ایک خوفزدہ کرنے والی مدد سرائے کا احساس!!۔ پستاپ کے ساتھ تنہا ہونے کا خوف اس کا
 جی چاہا، وہ دھوپ بھرے صحن میں نکل کر خود ہی اونچے اونچے بولن شروع کر دے، چپاٹیاں
 گھسیٹے ہیندہ اندن کے کواڑ کھٹکھٹائے، صحن میں گنگے نل سے باٹیاں بھر بھر کر صحن میں چھڑکاو
 کرے، کاتر قشام کے صر کے میں بند کرائند کے پیچھے سوئی بڑی دنگل اند چل پل اند سر
 صحن میں نکل آئے۔ مگر وہ صرف اپنے کمرے کے وسط میں بغل میں خائلیں دیا کے چپ چاپ
 کھڑا رہا۔ اپنی دھوکہ کی آواز کے احساس سے خوفزدہ!! اس نے خائلیں کو بند سے پیر پیر کیا۔

مگر بچے سے شور کے بعد کا سنا اس کو اور بھی خوفزدہ کر لگید ڈرتے ڈرتے وہ بستر کی طرف گیا پٹنگ کی ٹپ پر میٹل مٹیہ کو پھر پھسل کر لیٹ گیا، اودھا نکھیں بند کر لیں۔ تنہائی اور خوف اور مسئلے میں اپنے دھڑکنے و جھکا کا احساس اس کے غصے کو چندوں طرف سے لپیٹ چکا تھا۔ مگر اس لمحہ جب اس نے ٹدے ڈرتے آنکھیں بند کیں اس لمحہ وہ تنہا تا ہوا غصہ، تنہائی اور خوف کے حمل کو چیر کر نکل آیا۔ اودھا سے شام کا لانا دشمن ہو گیا۔ چھل کر وہ بستر سے اٹھا اور پک کر کہنے لگا میں نے ٹپ کی تپنی کو اٹھا لیا۔ پھر اس کی دھڑا دھڑلانے کی خاطر اس نے اپنے ہاتھوں پاؤں کے میں ناخن کاٹے اور پھر شیشے کے میز ویرٹ، جس پر وہ سلت دفن کی شیشے کے بعد آنکھیں دھون اپنا بیڈ تیز کر رکھا تھا، پر اس نے تپنی کی جھلکوں کو تیز کر لیا۔ اپنے حرکت کرتے بازوؤں کی پھسلنی ٹھہریوں کو آئیٹھنے میں دیکھتا ہوا وہ احساس سے مسکرایا، پھر پیچھے سے جسم کو چمکتی ہوئی بنیاں کو اتارتے ہوئے اس نے سوچا کہ اس نے تپنوں کا بوجھ بھی کیوں اٹھایا ہوا ہے۔ اور کھڑکی اور دروازے کے پرستے برابر کرنے کے بعد اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ بنیاں کا گولہ بنا کر پٹنگ کے نیچے پٹنگ کا تپنوں کو کھنڈی کے ساتھ ٹانگا اور خود پٹنگ کے نیچے کسنا دھیرے اور بچکی انیشوں کے فناک فرش سے لپٹ کر سرگید کر پٹنگ کے نیچے حق میں وہ براہ کھیں مئی پر جھنجھی بھیٹ تھی، اس نے مئی سے سونے میں زمینید شام ہوئی تو اس نے اٹھ کر کڑاٹھکھو سے اور غسل خانے کی سمت چلا گیا۔ دیر تک نہ کھوے وہ چپ چاپ، ایک کونے میں، خوفزدہ کھڑا رہا۔ مگر تھپاتی کی دھار پڑنے پر جلنے، دیر تک کھڑا رہا۔ پھر کڑے پسینے، مزہ پر پانی کے دھتیں چھینٹے ملے سے اور باہر نکل گیا۔ بند رہا لگھڑا گھر کے سائے میں کھڑے ہو کر اس نے کچھ دیر گزشتہ زندگی کو مابھی اور ریل پیل کا نظارہ کیا۔ سائیں ہاتھ کھڑے طالب علموں کی ٹوٹیوں کو شر کی لٹکیوں کے بارے میں گارم قسم کی اٹھکھڑکتے سنا اور پھر دائرہ کاٹا ہوا وہ اناٹکی کو پھلا ہلکے جاسن اور گلابی اور نیلے اور سرخ اور سفید رنگوں

میں اس نے کہتے ہی ریشمی ریشمی ربی خیریتے۔ اور دھیمی دھیمی، نرم اور شرمیل مسکراہٹ لبوں پر سجائے، غچی ٹکا ہوں سے اس نے دو بریزیر کا سودا بھی کیا اور خریداری کا لفظ بغل میں دبا کر وہ خاموشی سے دہان کا تھڑا اتر گیا۔ وہی نرم، دھیمی، شرمیل مسکراہٹ اور گلی گلی آنکھیں، اپنی خریداری کا لفظ بغل میں دبائے وہ مات گری جو نے ملک شہر میں گھومتا رہا، مرگ و پے میں جب آتے نہ ہر غم پیر دیکھتے کیا ہو، کی گرا کر تا رہ جب گھر میں داخل ہوا تو سوائے بی بی کے سب لوگ چھت پر سوئے جا چکے تھے۔ سب لوگ، جو صرف اس کا باپ تھا۔

اگیا نامراد، خدائی خلد، نہ دن کو صبح نہ ذات کو آرام رہ اسے دیکھتے ہی بی بی آواز میں پیچھی، کہ دوستی تھی اور چھت پر بڑھا پے کی غیند سے دست و گریباں، خامد سس نہ پائے، غضب خدا کا تم کو کر کیا ہوئے لڑکے تم تو بالکل ہی آپ ہو سے ہو گئے، مجال کیا جو ماں باپ کا شرم لھاؤ آگھ میں ہا ہو۔ ہمارے بیٹے ہی تو یہ خدا ہیں نہ ہو سکے گا سید سے سید سے سر شام گھر آیا کہ وہ نہ کہتی ہوں تم سے بپ سے۔ شناتم نے ایہ

”جی“ وہ نیچی نظروں سے مسکراتا رہا۔ سب کھا بھی، میں کیسا دی بات تیرے لیے بیٹھی ہوں گی؟ اس کی آواز میں باب مات کی نرمی اور گرمی تھی۔ وہ چپ چاپ کھانے پر جھک گیا اور دھیمے دھیمے، بے بے دے لیے میں اس نے بی بی کے سامنے سوال کا جواب دیا۔ کہ دن بھر اس نے کیا کیا۔ کہن کہن گیا، کہن لوگوں سے ملا، کیا کھایا، کس نے کھلایا کہن کو کھلایا اور کیوں پیسے ضائع کیے۔ اور یہ سب جھوٹ تھا۔ اور ایک بار فرار بنا تے بنا تے اس نے نظر اٹھا کر سفید مد پٹے میں لپٹے ہوئے اس سانپ کے چہرہ کو دیکھا، جس کے چہرے پر بے جھریوں کے جال میں اس کی عمر بھر کی دستاں تھم تھی، سادہ تب ہی اس کے گلے میں کچھ موٹا موٹا سا پسند اس نے ٹھکنے کی کوشش کی اور ناما کام رہا۔ اور۔ بی بی بی بی جانے کیوں جی اتنا بھاری بھاری

رہنے لگے جیسے میں کسی نے پتھر کی بل بکھری ہو جیسے۔ اس نے پورا پنے لگے میں پھنسی اس انجان
 نے کوڑ لگنے کی کوشش کی۔ اس بل بلی تم نے مجھے پیدا ہی کیوں کیا تھا میں نے کب کسی بات کہی ہے خدا
 کی قسم۔ مجھے قریا د نہیں۔ یہ کیسی جلا وطنی میں تم نے مجھے ڈالا ہے۔ کیوں کوئی شک نہیں۔ کیوں
 کوئی اپنا نہیں۔ مٹا ختم نے جھاڑیوں میں دو اڑے دیئے تھے۔ کتنے دنوں سے سنے رہی تھی،
 آج انہیں کتا پی گیا۔ دیکھا تم نے بل بلی۔ کیوں بھی تو کوئی شک نہیں۔ مدد سے بیلگے میں ساڈ
 بل بلی تم تو میری بنو، تو تم تو میری ہو۔ چلو آؤ اب تم اور میں یہاں سے کیوں امدہ ہیں۔ جہاں
 شکم ہی شکم ہوں۔ اور مٹا ختم کو کوئی گڑا انگ دکھائے اور وہ جھاڑیوں کیچے، آرام سے
 بیٹھا اپنے دونوں اڑے بہتی رہے۔ چلو بل بلی تم اور میں لبنانی چلیں۔ آہ میری قدو میرا خواب،
 میری سوچیں، میں وہاں بس رہتی، قرۃ قرۃ گھوم گھوم کر خوش کے گیت گاؤں گا۔ اماں کی
 خوبصورتی کی مدد کیوں گا۔ سیاہ آنکھوں کو چوم کر سیاہ بالوں کی گٹھا کے سائے میں آنکھیں
 بند کر لوں گا۔ امد جب شام ڈھلے میں، میلوں کی مسافتوں امد حسن امد خوبصورتی اور میں کے
 فتنہ میں چھو گھرا کر ملوں گا تو تم مدد دانہ سے پر سکاتیں، اس اور شام کی کائنات مجھے جلا کر دیں۔
 میں کیوں گا بل بلی اس دنیا میں تم میرا پھر نہیں۔ امد سب جھوٹ ہے۔ سراسر ہے۔ ایک
 حقیقت تم ہر ایک حقیقت میں۔ اور تلک میری فٹس فٹس میں ہے۔ امد مجھے تھک کر ڈالو۔
 تو تم بل بلی مجھے گود میں لے کر میری آنکھوں میں زندہ کا جادو پھونک دیا کرنا اور میں چپ چاپ
 امد سکوں اور طمانیت سے تنہا رہی گود میں سوتا رہوں اور تم ویسے ہی احتیاط سے امد اپنا نیت
 سے مجھے لیے بیٹھ رہنا جیسے تم نے فرماہ مجھے پیٹ میں رکھا۔ اور دنیا میں کیوں کہ نہیں سنا
 ان نوجوانوں کے۔ آؤ بل بلی۔ آؤ تان تم اور میں لبنانی چلیں۔ یا ناریقہ کے گرم ساحلوں کو
 چلیں یا۔ یا۔ اور بل بلی گھٹنوں پر ٹھوٹی رکھے، اس کی طرف دیکھتی رہی، مگر آج کا خواب

اُدھو راہ را کر اچانک ہی آج کے گزرے دن میں اپنا چلتا پھرتا وجود اس نے پھر سے دیکھ لیا تھا۔ نوار بنا کر منہ کی طرف لے جاتے ہوئے اس نے اپنی ٹھکانے آنکھوں کو اٹھا کر بی بی کی طرف دیکھا تو چہرے میں جلتی لکڑیوں کی پکتی ٹوئیں اس نے بی بی کی چمکی آنکھوں میں اپنی صدمت دیکھی۔ اپنا آپ۔ ٹائیلیں بغل میں دبائے، لوہے کے بڑے پھانک سے نکلتے، ٹوٹی فلاسک کو پاؤں کی ٹھوک سے نالی میں گراتے اور پھر کئی اینٹوں کی گلی پر بعد سے پاؤں مار تے، ناک کی سیدھ میں دیکھتے، وقت اور فاصلے کا احساس کیے بغیر چلتے ہوئے، اور سونے کی کیلیں بڑے نوکیلے وائٹن والی اس صدمت کی تیز آواز ادا کیٹیلے لمبے می اورنجی اورنجی باتیں اور چاروں طرف گم شم چپ چاپ مکھڑی چار روکیں، اور گردن جھکائے، دم کو ٹانگوں میں دبائے، مسکین اور نادار کتروں کی صورت اس کا پانچ فٹ اور گیدہ پانچ کے قدم میں مکھڑا وجود کہ آج اس نے سیدہ رفیعہ آفتاب کی گسدن پر چمکتے ہوئے بلی کو، سلسلے کے شب خوالے کے کمرے میں تنہائی کے بڑے میں آکر چوم لیا تھا۔ تب، جب وہ قینوں کی قینوں لڑکیاں اچانک ہی کسی کلم سے باہر نکل گئی تھیں۔ ادواب وہی ایک لمحہ کہ جب اس تیز نوکیلے سونے کی کیلیں جیسے وائٹن والی اس چڑیل نے اسے ان چاروں لڑکیوں کے سامنے برہنہ کر دیا تھا۔ برہنہ ہو کر اس کے سامنے تاج رہا تھا۔ اس نے ہاتھ کا نوالہ سناٹھے پڑی سانس کی پیٹ میں گرایا اور خاموشی سے اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتا اپنے کمرے میں چلا آیا۔ بی بی نے جب چپ چاپ، اپنی ٹیکوں پر آٹے آفسو سیٹھے اور پھر برتن۔ دھیرا بچھے۔ اس نے گہرا سانس بھرا، کہ جیسے وہ سب کچھ جانتی ہو۔ سمجھتی ہو۔ اور وہ کہ باورچی خانے میں بی بی سے اپنی خواہشوں کے ذکر کے بعد ان، اس کی آنکھوں میں اپنی صدمت دیکھ کر اٹھ آیا تھا۔ اُدھو کے پاس پہنچ کر دم بھر کو ملک گیا۔ پیٹ کے نچلے حصے کی جلیں کا راجہ بھر جاگ اٹھا تھا۔ روح رکھی ہو کہ

اس کے ہر نرس کو ایک نالی پر بجا ہوا تھا۔ تھناتے ہوئے تاروں میں ایسے اعصاب سے بنے ہوئے جسم کا بوجھ اپنی لذتِ ٹانگوں پر اٹھائے وہ چھروں کی طرح دبے پاؤں چلتا آخرنگی سے اپنے کمرے میں داخل ہو گیا اور دروازہ بند کر کے اس سے پشت لگا کر چند لمہٹ کھڑا اپنی مانتوں کو محسوس کرنے کی کوشش میں لگا دیا۔ پھر ایک بھی آہٹ پیدا کیے بغیر، پنجوں پر چلتے ہوئے، انگلی نکل کر اس نے پردے برابر کیے۔ کھڑکی کھول کر سٹے ہوئے پردوں کے بند کھول کر انہیں پھیلا دیا، پھر دبے پاؤں چلتا بستر کے قریب آیا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر خود کرتا ہوا خاکی رنگ کے کاغذ کا لفافہ نکالا، کھولا اور پھر ہاتھ کو اونچے لے جا کر لفافہ پٹنگ پر خالی کر دیا۔ رنگ رنگ برخیوں کے بن گھٹے، پتھر کھاتے، لہریں لیتے، آپس میں گڈ بڈ ہوتے، پٹنگ کے صحن بچوں، بیج ڈھیر ہو گئے۔ اور بند ریڑز بھی اس نے لپک کر گر بڑی احتیاط کے ساتھ انہیں اٹھایا اور کھول کر رخیوں کی ریشمی قوس قزح کے پاس رکھ دیا۔ آنکھوں میں اک پراسرار چمک ایسے، بسوں پر گیلی گیلی سی مسکراہٹ کو سمجھنے اس نے اپنی چوری اور انچائی سے اپنی پوشیدہ فرخیوں کے اس خزانے کو دیکھا۔ پھر کرسی پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔ اطمینان کے ساتھ کپڑے بدلتے بدلتے اس نے بڑی میز پر بڑے سائے ٹینے کے پاس پڑھی تیغی کو اٹھایا اور پٹنگ پر اچھال دیا۔ اور ایسا کرتے کرتے پٹنگ کی طرف دیکھا۔ لمبو بھردھکتا رہا۔ اور جب == دوبارہ کپڑے بدلتے کی طرف متوجہ ہوا تو وہ اس کی نرم اور میٹھی اور معصوم مسکراہٹ اور بھی گہری تھی۔ آنکھوں کا رنگ گہرا گلابی گلابی اور گلابی گلابی۔ پھر اس نے جی بھجائی اور پنجوں پر چلتا ہوا بستر کی طرف چل گیا۔

پھر میز پر بیٹھے ہی لیٹے۔ مگر ایک کند سے پراگرتھک کر پٹنگ کے نیچے سے رات

کی خریداری کا خاکی اور خالی، شور کرتا ہوا الفاظ اٹھاتے ہوئے اس نے جانا کہ ایک اور دن طلوع ہو چکا ہے۔ گرم، پھیلتا ہوا، پیسینے کی چھپا ہٹ، صبح ہی صبح اسے اپنی گردن پر محسوس ہو رہی تھی۔ پھر ریشمی کترنوں کے عبدالہ بریز ریز کے بے ربط ٹکڑوں کو اکٹھا کر کے لفافے میں ڈالتے ہوئے اس نے طلوع ہونے والے دن کی طرف دیکھا۔

”کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں!“ ہر دن رات کی آند میں جلتا اور ہر شب صبح کی آہٹوں کی طرف کان لگاتا!“ پھر اس نے وہ لفافہ بند کیا۔ بستر سے اتر، پنک کے نیچے سے اپنا کس کھینچا، اسے کھولا، اس لفافے کو کس کی سب سے نچلی تہ میں رکھا۔ کس بند کیا، تالا لگایا۔ پھر کس کو پنک کے نیچے دھکیلا۔ قلعی کو میز پر بکھا اور کمرے سے نکل گیا۔

(”ادب لطیف“ لاہور)

ٹھنڈی لڑکی

کار سے اتر کر وہ جھبکی ۔

اسپتال میں داخل ہونے کے لیے ابھی آسے پانچ سات میٹر حیاں چڑھتی تھیں۔
اس کی ہمت جواب دینے لگی۔ لیکن پھر اس نے اپنے دل کو سمجھایا۔

”آخر میں یہاں ایک نیک مقصد کے لیے آئی ہوں۔“

وہ ایک ایک میٹر بھی پردہ رک کر چڑھی۔ دو دوازہ کراہتے سے دھکیلا اور اندر
داخل ہو گئی۔ سانس بڑے ڈیسک کے پیچھے ایک نرس بیٹھی ہوئی تھی۔

”فوائے“ نرس نے نظروں ہی نظروں میں اس کے جسم کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔
ابھی وہ کچھ کہنے کے لیے سانس درست نہ کر پائی تھی کہ نرس پھر بولی۔

”میٹر نئی وارڈ میں داخل لیتا ہے آپ کو؟“

”نہیں، نہیں۔“ وہ گھبراہٹ سے لگتی۔ ”مجھے ایک رنجن سے ملنا ہے سٹریٹ پر نام ہے۔“
”کوئی نمبر؟“

”۱۰۵۔“

نرس نے سامنے رکھے ہوئے چارٹ کو دیکھا۔ ”وہ تو قسریٰ منزل پر ہے اور آج ہماری
بفٹ خواب ہے، آپ اس حالت میں اتنی میٹر حیاں نہ چڑھ سکیں گی۔“ نرس کے لہجے میں ایسی

ہمدردی کی جھلک تھی جو ایک عرصہ ہی دوسری عصمت کے لیے محسوس کر سکتی ہے۔

”پھر ایسا کیجئے کہ ڈاکٹر خان کو بلا دیجئے۔ مجھے انہی نے بلایا تھا۔“

”میں انہیں فون پر بلائے دیتی ہوں۔ آپ بیٹھیے۔“

کسی پر بیٹھ کر اس نے ارد گرد نظر دوڑائی اوسا خرمیں اس کی نظر میٹر حصیوں پر جم

گئی۔ ”نہ جانے اس وقت فریڈ کی حالت کیسی ہوگی۔“ اس نے سوچا۔

”مگر۔ ڈاکٹر صاحب۔ اس وقت اس حالت میں نہیں ہیں کہ اور پراسکیب۔“

نئی فون پر ڈاکٹر کو سمجھا رہی تھی۔

شبیہ نے فرس کے ہاتھ سے پیسور لے لیا۔ ”ڈاکٹر صاحب میں سبز جمال بول رہی ہوں۔“

”اے ہو۔ آپ ہیں سبز جمال۔ مجھے بڑا افسوس ہے کہ آپ کا آنا بکال دیا۔ فریڈ

صاحب تھوڑی دیر پہلے چل بسے۔ صبح جب میں نصیب کو فون کی قلمرو اس کے تھوڑی

دیر بعد بے ہوش ہو گئے تھے۔ اور پھر ہوش میں نہ آئے۔ اگر آپ انہیں دیکھنا چاہیں تو میں

انتظام کر سکتا ہوں۔“

”نہیں۔ نہیں۔ میں نہیں دیکھنا چاہتی۔ شکریہ! اس نے جلدی سے کہا اور پیسور رکھ دیا۔

کسی سے اتنے کہ لکڑی طرف جاتے ہوئے اس نے اپنے دل پر ہلکا سا بوجھ محسوس کیا۔ ”ہیو ہا

فریڈ اس کی آخری خواہش بھی پوری نہ ہوئی۔ مگر اس میں میری کیا خطا ہے۔ مجھے اس نے بتلایا ہی

کیوں؟ میں اس کی کون ہوں؟ میں جو اس سے اتنی نفرت کرتی تھی۔“

ساتے بھر وہ ان ہی خیالوں میں ڈوب رہی۔ گھر واپس پہنچ کر وہ لان میں ریٹک کھڑی

رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے اپنے ملازمہ سے کہا کہ ”بلگم صاحبہ

کھانا لکھا لیجئے۔“ دو بج گئے ہیں۔“

”کھانا اٹھا کر دکھ دو مجھے بھوک نہیں ہے۔“ وہ بولی۔

علازم نے آرام کر سہی کر دھوپ میں ڈال دی۔ اور وہ اس پر جا کر بیٹھ گئی۔ اس کا
میں پھر نکلنے لگا۔ ”میں اس کا منہ ہی دیکھ لیتی۔ نہ جانے اب وہ کیسا لگتا ہو گا۔ بیلہ کی
جہ سے بہت کمزور ہو گا۔ پچھلے چار سال میں کتنی تبدیلیاں ہو گئیں۔“

فروغ اسے اس کا ہم جماعت تھا۔ لباڑ لگا، لچیم خیم۔ یونیورسٹی کے طبقات
میں عام طور سے اسے بد تنزیب، بد فتنہ سمجھا جاتا تھا۔ سنجیدہ انداز لڑکے اس سے بات
کرنے سے گریز کرتے۔ صوفیہ چند لڑکوں کا گروہ تھا جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا۔ جب وہ
ان کے مصائب کھڑے ہو کر غصے لگاتا یا آواز سے کہتا تو اس پاس بیٹھی جوں لڑکیاں اپنی
کتابیں سمیٹ کر دور جا بیٹھتیں۔ پڑھنے لکھنے سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کئی سال
پلی اسے میں فیل ہونے کے بعد وہ جانے کیسے پاس ہو گیا تھا اس بات پر اسے خود بھی حیرت تھی۔
ایم۔ اے میں داخلہ اس نے بے فکر خود تفریح اور وقت گزاری کے لیے لیا تھا۔ وہ اپنے
نئے نئے سوشل بھگتیاں ٹائیٹوں اور دستوں میں لگن دیتا۔ اس کا باپ جاگیردار تھا جس نے
فریڈ کو ایک لمبی شیدو لٹ دے رکھی تھی اور جو اسے ہر مہینے اتنا روپیہ بھیج دیتا تھا کہ
اس کی احساس کے دوستوں کی ہر قسم کی تفریح کے لیے کافی ہوتا۔

ثریا سے اس کو خاص دلچسپی تھی۔ جب وہ جماعت کے بعد اوپر وٹریبری میں پڑھنے
جاتی تو فریڈ احساس کے دوست سیٹر جیوں میں کھڑے ہو جاتے اور ثریا ان لوگوں سے کہتی
بچا تو بڑی مشکل سے اوپر جاتی۔ اس نے بہت کوشش کی، ثریا اس کی طرف متوجہ ہو کر اس نے
فریڈ کو کئی لفظ نہ دی۔ آخر تنگ آکر اس نے ثریا کا نام ”ٹھنڈی لڑکی“ لکھ دیا اور
چند ہی دنوں میں یہ خطاب ہر لڑکے کی زبان پر تھا۔

ثریا کو اپنا خطاب یاد آیا تو وہ بے ساختہ مسکرا دی۔ کیسے عجیب دن تھے وہ بھی۔ وہ خطاب شاید ٹھیک ہی تھا۔ پچھلے دن ایک ”ٹھنڈی لڑکی“ لکھی ہمیشہ سے خاموش اور پُر سکون زندگی کی عادی مددگار اور صاف ستھری خوبصورت تھی۔ اس لیے بہت سی نظروں نے اس کی نظر دل میں جگہ ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر وہ ان باتوں سے بے نیاز تھی۔ اپنی نکلاں کے رنگوں سے بہت کم بات کرتی۔ لڑکیوں میں سے بھی صرف چند سے ہی اس کی دوستی تھی، مدد اس کا زیادہ وقت اپنی کتابوں میں ہی صرف ہوتا۔ ٹھنڈی اور بے جاں کتابیں ہی اس کی دوست تھیں۔ اماں نے کبھی اس بات کو اہمیت ہی نہیں دی تھی کہ ان کتابوں سے باہر ایک رنگ بھری ہنستی کھیلتی دنیا آباد ہے۔

پھر وہ ایک دن خالی پیرٹ میں لان میں بیٹھی تھی کہ فرید آپہنچا۔
 ”بس تریا! میں آپ کے پاس بیٹھ سکتا ہوں؟“

وہ خاموش رہی ماما اپنی نظریں کتاب پر جمادیں۔

”آپ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتیں۔ میں آپ کے جتنے قریب آنا چاہتا ہوں آپ

مجھ سے بات کر سکتی ہیں۔“ وہ تھیں لڑکیوں کا انداز میں بولے چلا جا رہا تھا۔

ثریا کھڑی ہو گئی۔ غصے کے مادے سے اس کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی کتابیں اٹھائیں اور لڑکیوں کے کمرے کی طرف چل دی۔

اس دن کے بعد سے اسے فرید سے صاف نفرت ہو گئی۔

استحقاق سے کوئی حیدر بھر پیلہ ثریا نے یونیورسٹی جانا چھوڑ دیا۔ پھر اس نے فرید کو کبھی نہیں دیکھا۔ ثریا نے ایم۔ اے کیا تو اس کے آبا جی کے مصمت کے خاموش اور شرمیلے

روا کے جہاں نے سی ایس۔ پی میں کامیابی حاصل کی اور پھر ان کی شادی ہو گئی۔ شادی کے معاملے میں بھی وہ اتنی غیر جذباتی تھی جتنی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کے بارے میں۔ مگر ان کی مانند راجی زندگی بہت کامیاب تھی۔ اس کا شوہر اس سے والہانہ محبت کرتا تھا۔ وہ بھی اسی کی طرح خاموش زندگی گزارنے کا عادی تھا۔ دن بھر فریادیں نہ کرتا تھا۔ سناٹے میں لگی رہتی۔ یا انگریزی ناول پڑھتی۔ کبھی اس پاس کی کوٹھی سے کوئی اس کی جاننے والی آ جاتی۔ یہاں تک کہ چار بج جاتے اور اس کا شوہر دفتر سے واپس آ جاتا۔ ان کی شامیں زیادہ تر گھر پر ہی گزرتیں۔ پارٹیوں اور تقریروں میں جانا انہیں پسند نہ تھا۔ وہ اپنی زندگی سے ہر طرح مطمئن تھی۔ ادب شادی کے دو سال بعد ان کا پہلا بچہ ہونے لگا تھا۔

اس کے شانے پر کسی نہ ہاتھ رکھا، تو وہ چونک پڑی۔ اس کا شوہر کمری کے پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

”ارے چار بج گئے؟“

اپنے شوہر کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر وہ اندر جانے لگی تو اسے محسوس ہوا کہ اتنی دیر سچے رہنے سے اس کی طبیعت جو جھل جھل رہی ہے۔ دیکھ کر بے ہوش انداز میں تڑپاٹا ٹڈاٹنگ دم میں مرنے پر میٹھ کر سوٹ بننے لگی۔ صبح کا وقت اسیا دا گیا۔

ٹاکسٹریٹ سے مل کر کہا تھا ”سبز جمال میرے ایک مریض مٹر فریڈ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ان کی حالت بہت خراب ہے اور آج وہ ہسپتال بھی ان کا زہرہ رہنا مشکل ہے۔ ان کی آخری خواہش یہ ہے کہ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“ اور پھر وہ دیکھ کر سوچتی رہی کہ وہاں جانے یا نہ جانے۔ کیا اس کا جانا مناسب ہو گا؟

” آج دن بھر کیا کرتی رہیں ڈاڈلنگ؟ “ جمال نے پوچھا۔

” میں اسپتال گئی تھی۔ “ اس کی آواز میں ہلکی سی کیپکپی تھی۔

” کیوں؟ “ وہ تقریباً بیچ پڑا۔ ” منو! میں نے تمہیں ایک مرتبہ فریڈ کے

متعلق بتایا تھا۔ وہ میرے ساتھ پڑھتا تھا اور مجھے بڑا پریشان کرتا تھا۔ وہ آج

اسپتال میں مر گیا۔ وہ کئی مہینے سے بیمار تھا۔ زیادہ شراب پینے سے اس کے پھیپھڑے

ٹھل گئے تھے۔ آج صبح ڈاکٹر نے مجھے فون کیا تھا کہ وہ مرنے کے قریب ہے اور مجھ سے

ملنا چاہتا ہے، میں وہاں گئی تھی مگر وہ میرے جانے سے پہلے ہی مر چکا تھا۔ “

” ڈاڈلنگ تمہیں اس حالت میں وہاں نہیں جانا چاہیئے تھا۔ “

” وہ مر چکا تھا۔ “ ثریا بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

” جانہ من! تمہیں اس بچے کا خیال کرنا چاہیئے تھا جو چند ہی روز میں تمہارے والا

ہے۔ “ جمال پیار بھر سے لہجے میں بولا۔

” آخر مرنے والوں کا بھی خیال ہونا چاہیئے۔ “

” اور تم تو اس سے نفرت کرتی تھیں۔ “

” ہاں! شاید اب بھی کرتی ہوں۔ مگر یہ تو دیکھو کہ وہ مجھ سے کتنی محبت کرتا تھا۔ “

ثریا نے کہا اور جمال کی گردن سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

(” سرورج “ دہلی)

مطبوعات میری لائبریری

* نفسیات

| | |
|------|----------------------------|
| ۱۰۰۰ | جینے کی اہمیت |
| ۵۰۵۰ | سچھے بول میں جادو ہے |
| ۵۰۵۰ | پریشان ہوا جھوڑا ہے |
| ۳۰۵۰ | گفتگو اور تقریر کا فن |
| ۳۰۵۰ | ماہی تہ ماہی |
| ۳۰۵۰ | جنس کا نفسیاتی پہلو |
| ۳۰۰۰ | جنس کا جسمانی پہلو |
| ۲۰۵۰ | زندگی کے موڑ پر |
| ۲۰۵۰ | شادی اور کامیابی |
| ۲۰۵۰ | روزمرہ نفسیات |
| ۲۰۰۰ | نفسیات اور عمل |
| ۲۰۰۰ | زندگی اور عمل |
| ۲۰۰۰ | نفسیات کی روشنی |
| ۲۰۰۰ | ترقی کی راہیں |
| ۱۰۲۰ | ہماری عادات، ہمارے جلاہات |
| ۲۰۵۰ | دولت نامہ |
| ۱۰۵۰ | بچے اور لڑکی تعلیم و تربیت |

* تاریخ و سوانح

| | |
|-------|-------------------------|
| ۷۰۵۰ | ابو بکر صدیق اکبر رض |
| ۱۲۰۰۰ | عمر ، فاروق اعظم رض |
| ۵۰۵۰ | دس بڑے مسلمان |
| ۲۰۵۰ | خالد ، سیف اللہ رض |
| ۲۰۲۰ | الہارون |
| ۲۰۵۰ | ابودر غفاری رض |
| ۱۰۵۰ | سلطان محمد صالح رض |
| ۲۰۰۰ | الحسین رض |
| ۱۰۵۰ | رابعہ بصری رض |
| ۱۰۵۰ | امیر معاویہ رض |
| ۱۰۵۰ | عمر بن عبدالعزیز رض |
| ۱۰۵۰ | امام زین العابدین رض |
| ۱۰۵۰ | شیخ عبدالقادر جیلانی رض |
| ۱۰۵۰ | ایک مفسر قرآن |
| ۱۰۲۰ | الزہرا رض |
| ۳۰۵۰ | تذکرہ |
| ۳۰۵۰ | قلو بطرہ |
| ۳۰۵۰ | روپ متی |
| ۲۰۵۰ | سلطان محمد کے |

تلفیذ ، ادب ، ناول ، السالو

| | |
|-------|----------------------------|
| ۱۰۰۰۰ | بہترین انشائی ادب |
| ۲۰۵۰ | ادب کا تنقیدی مطالعہ |
| ۱۰۵۰ | ادب اور تعصب |
| ۱۰۵۰ | ولیم فاکنر |
| ۱۰۵۰ | ارنست ہیمنگ وے |
| ۱۰۵۰ | سارک ٹوین |
| ۱۰۵۰ | والٹ وٹھمن |
| ۳۰۰۰ | تنقیدی مضامین |
| ۳۰۵۰ | نبار خاطر |
| ۱۰۰۰۰ | دیوان غالب (فارسی) |
| ۰۰۵۰ | انتخاب غالب |
| ۳۰۰۰ | پنجابی ادب کی تاریخ |
| ۲۰۲۵ | دیوان ولی |
| ۳۰۰۰ | دیوان مصطفیٰ |
| ۱۰۵۰ | دیوان آتش |
| ۳۰۰۰ | دیوان جرات |
| ۱۰۵۰ | ولی ، تنقیدی مطالعہ |
| ۳۰۰۰ | منازع ادب |
| ۳۰۵۰ | ناول نگاری |
| ۳۰۰۰ | میرزا ادیب بہترین افسانے |
| ۳۰۰۰ | احمد ندیم بہترین افسانے |
| ۲۰۲۰ | زاد راہ معہ تنقیدی مقدمہ |
| ۲۰۰۰ | فاصلے |
| ۵۰۵۰ | میر کے بھی صنم خانے |
| ۳۰۵۰ | پتھر کا دیس |
| ۱۰۵۰ | سہرے کے پھول |
| ۳۰۵۰ | آہیں |
| ۳۰۰۰ | منزل منزل دل بھٹکے کا |
| ۳۰۰۰ | ادب کہا ہوا امرود |
| ۳۰۰۰ | حریف آدم |
| ۱۰۵۰ | دلہا باز (ڈرامہ) |
| ۱۰۵۰ | لفنگی کی ڈائری |
| ۲۰۵۰ | 63 کے منتخب افسانے |
| ۳۰۰۰ | 64 کے منتخب افسانے |
| ۳۰۵۰ | 65 کے منتخب افسانے |
| ۵۰۵۰ | سیدان عمل معہ تنقیدی مقدمہ |
| ۵۰۵۰ | تنکی دھری |
| ۳۰۵۰ | لحون کے بہنور |
| ۵۰۵۰ | کرن کرن الدھیرا |
| ۳۰۵۰ | القی سے اقی تک |
| ۳۰۰۰ | ڈوب ڈوب کر ابھری ناز |
| ۲۰۵۰ | جیاب |
| ۲۰۵۰ | انسان |



☆ ناصر زیدی (مرتب)

۸ اپریل ۱۹۵۳ء کو مظفر نگر (ہو۔ پی) کے ایک سید خاندان میں پیدا ہوئے۔ لاہور میں پلے، پڑھے، پڑھے اور جوان ہوئے۔ اسے شہر ”زندہ دلاں“ میں شاعری اور ادب و صحافت کا چسکا پڑا متعدد رسالوں کے مدیر رہ چکے ہیں۔

گزشتہ تین برس سے ماہنامہ ”ادب لطیف“ لاہور کے اردو کے انسانی ادب کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہوئے ”۱۹۹۷ء کے منتخب افسانے“ مرتب کر چکے۔ غزل کے شاعر ہیں اور بقول ذکا الرحمان: —
”طبیعت میں بھی غزل کا گداز اور نزاکت ہے“
غزلوں کا ایک مجموعہ زیر ترتیب ہے۔

غالب کی صد سالہ برسی پر میری لاٹبریری کے تحفے

* دیوان غالب، اراد، مروج متن مع انتخاب حسرت موہانی

عرشی رام پوری کے اعراب و تلفظ کے مطابق

انسٹ طباعت میری لاٹبریری: 2.25 جلد 5.00

* انتخاب غالب، عکسی طباعت مع حودہ نوشت حالات و سوانح 0.50

* مفہوم غالب، غالب کے کلام کی شرح، الفاظ و اشارات

غالب کے مطابق۔ از صاحبزادہ احسن علی خاں

میری لاٹبریری میں: 9.00 سلیڈ کاغذ جلد: 15.00

* کلیات غالب (فارسی غزل) سید وزیر الحسن عابدی کی

تاریخی تدوین، تعلیقات و تحقیقات۔ میری لاٹبریری 10.00

جلد 20.00

مکتبہ میری لاٹبریری، لاہور-۲